ایک معصوم جن کی روداد جو کہ ایک دوشیزہ پر دل و جان سے
عاشق ہو گیا تھا مسکان بکھیرتی ایک اچھوتی اور پر تجسس کہانی

بوقاف

بوقاف......ایک نوعمر جن کی کہانی جو ایک آدم زادی کی زُلف کا اسیر ہوگیا تھا......راشد نذیر طاہر کی ایک ہنستی مسکراتی تحریر

بوقاف

مصنف : راشد نذیر طاہر

ڈر پبلی کیشنز
کتاب مارکیٹ، نیو اُردو بازار، کراچی
Ph: 021-32744391 & 32773302

نوٹ:

اس ناول کے جملہ حقوق بحق مصنف (راشد نذیر طاہر) اور پبلشرز (ڈر پبلی کیشنز) محفوظ ہیں۔ ادارہ نے اردو زبان اور ادب کی ترویج کیلیے اس کتاب کو kitaabghar.net پر شائع کرنے کی خصوصی اجازت دی ہے، جس کیلیے ہم انکے بے حد ممنون ہیں۔

کتاب گھر کی پیشکش کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com

پیش لفظ

میرا ناول ''بوقاف'' آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ گوکہ یہ ایک طبلاش نامی قبیلے کے جن کی طویل داستان ہے لیکن اسے پڑھتے ہوئے آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں بکھر جائیں، یا گلے سے بے ساختہ قہقہے بلند ہو جائیں تو کنجوسی مت کیجئے گا۔ کیونکہ ہم لوگ جس تیز رفتار میں دور میں جی رہے ہیں اس میں ہمارے لیے وقت بھی کم ہے اور ہنسنے ہنسانے کے مواقع بھی ناگزیر ہے۔ جدھر نظر اٹھا کر دیکھئے، مصروفیت ہی مصروفیت نظر آتی ہے۔ لوگوں کا ہجوم سا ہجوم ہے لیکن ہر کوئی دوسرے سے قطعی نامانوس اور بے پروا۔

ایسے میں اگر برکت صاحب آپ کو اپنے گھر آنے کی دعوت دے ڈالیں تو اسے ردمت کیجئے گا۔ کیونکہ آج کل ان کے گھر میں ایک ایسی افتاد پڑی ہے جس سے پورا قصبہ پریشان ہے۔

اس قصبے میں اور بھی کئی قوس وقزح کے رنگ ہیں۔ لیکن کچھ عرصے سے یہ رنگ پھیکے سے پڑے ہوئے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ پورا قصبہ ایک عجیب قسم کی افتاد میں گرفتار ہے اور قصبے کی درجنوں جوان، خوب صورت لڑکیاں اس مصیبت کی زد میں آچکی ہیں۔

ہر دو تین ماہ بعد یہ آفت ضرور نازل ہوتی تھی۔ وہ تو شکر تھا کہ پندرہ دن بعد یہ آفت خود بہ خود ٹل جاتی تھی۔ ورنہ یہ تو کھلم کھلا روگ جاں تھا۔ اور پھر...... ایک دن تو انتہا ہو گئی، جب خود برکت صاحب کی جوان بیٹی مہ پارہ پر یہ مصیبت سوار ہوئی۔ ہر شخص اپنی اپنی سوچ کے مطابق اس مسئلے کا حل سوچنے میں مصروف ہے لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ لیکن اس کا حل ہے کیا یہ تو آپ کو کہانی پڑھ کر ہی معلوم ہو گا۔

اور ویسے بھی یہ دعوت قبول کر کے آپ کو خوشی ہی ہو گی کیونکہ ان کے گھر میں پیر گاگے شاہ موجود ہیں، ان کے ساتھ ان کے مرید خاص چنگا اور منگا بھی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی آپ کو اس کہانی میں کئی کردار ایسے ملیں گے جن کو آپ مدتوں بھلا نہیں سکیں گے۔

تو پھر صفحوں کی صورت میں کھول ڈالئے برکت صاحب کے گھر کا دروازہ اور اندر داخل ہو جایئے۔

آپ کی دعاؤں کا طالب
راشد نذیر طاہر

کتاب گھر کی پیشکش کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com

دور کسی مرغے نے بلند آواز سے بانگ دی اور چچا تندوری نے چارپائی کے قریب رکھا ہوا ڈنڈا اٹھا لیا۔ وہ ڈنڈا سنبھال کر اٹھے ہی تھے کہ چچی کی چیختی ہوئی کھنک دار آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی۔

''تم پھر چل دیئے......؟ بیٹھو آرام سے۔''

''میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا...... ہاں...... کہے دیتا ہوں۔'' وہ جھنجھلائے ہوئے انداز میں ان کی طرف مڑے۔

''بیٹھو آرام سے، بڑے آئے مرغوں کے دشمن......''

''اماں......تم......تم دیکھتی نہیں ہو......کیسے مجھے منہ چڑاتے ہیں......بدبخت کہیں کے......''

''تمہیں صرف وہم ہے اور یہ وہم کی بیماری حکیم طولانی بھی ختم نہیں کر سکتے......سمجھے......بھلا بتاؤ تو......معصوم سا جانور ہے اور انہیں منہ چڑائے گا......ہونہہ۔'' چچی نے برا سا منہ بنایا۔

ایک بار پھر مرغے نے بانگ دی اور اب کے بار چچا تندوری رکے نہیں۔ ڈنڈا اٹھا کر باہر نکل آئے۔ چچی ''ارے ارے'' ہی کرتی رہ گئیں۔

یہ تھا قصبہ نورس، جس کے مکین سیدھے سادے اور بھولے بھالے تھے۔ شہر کی آلودگی سے دور، یہ چھوٹا سا قصبہ اپنی مثال آپ تھا۔ یہاں امن تھا، سکون تھا، محبت تھی، خلوص تھا۔ شہر کی طرح یہاں کی زندگی مشینی ہرگز نہیں تھی۔

خلوص، محبت اور بھائی چارگی کا دور دورہ تھا۔ یہ قصبہ اتنا بڑا نہ تھا، لیکن اس میں رہنے والوں کے دل بڑے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ برکت صاحب نے اس چھوٹے سے قصبے میں اپنی رہائش کو ترجیح دی تھی۔ حالانکہ شہر میں ان کے دو مکان تین منزلہ تھے، لیکن ان مکانوں کو کرائے پر اٹھا کر وہ خود اپنی بیگم اور بیٹی مہ پارہ کے ساتھ یہاں سکونت پذیر تھے۔ شہر کی آلودگی سے دور، بلکہ شہر والوں کی بھی آلودگی سے دور......

ان مکانوں کا کرایہ کافی مناسب مل جاتا تھا۔ جس کی بدولت آرام سے وہ اپنے کنبے کی کفالت کر رہے تھے۔ یہاں ان کی کافی عزت بھی تھی۔ کیونکہ یہاں زیادہ تر مزدور پیشہ لوگ آباد تھے۔ اسی لئے برکت صاحب کی علمیت اور قابلیت کا جاہ و جلال پورے علاقے پر مسلط تھا۔ ہر قسم کی اور ہر موضوع پر ان کی معلومات کو مات کرنے والا کوئی اور ثانی پورے علاقے میں نہیں تھا۔

وہ جثے میں تو تنک منک سے آدمی تھے۔ لیکن ان کے رعب کا یہ عالم تھا کہ اگر کسی ایسی گلی سے ان کا گزر ہوتا، جہاں محلے کے لڑکے آپس میں گالی گلوچ اور فحش گفتگو کر رہے ہوتے تو ان لڑکوں کو چپ سی لگ جاتی اور جب تک برکت صاحب اس گلی سے نکل کر دور نہ چلے جاتے، وہ لڑکے اخلاق کی ماں بہن ایک نہیں کرتے تھے۔ البتہ ان کے جاتے ہی دوبارہ مہابھارت کا سلسلہ وہیں سے جڑ جاتا جہاں سے ٹوٹا تھا۔

ان کی گلی کے نکڑ پر سلیم دودھ والے کی دکان تھی۔ بذات خود وہ بھی بھینس سے کم نہ تھا۔ اگر سلیم دودھ والے کی فری اسٹائل کشتی برکت صاحب سے کروادی جاتی تو برکت صاحب اس کی صرف ایک ''پھونک'' کی مار تھے۔ لیکن یہ لحیم شحیم دودھ والا بھی دودھ میں پانی ملاتے وقت گلی میں احتیاطاً نظر ڈال لیتا تھا کہ کہیں برکت صاحب تو ادھر نہیں آرہے۔

شام کے وقت ''خیراتی ہوٹل'' میں جب محلے کے بڑے بوڑھوں کا میلہ لگتا تو برکت صاحب ان میں نمایاں ہی دکھائی دیتے۔ کیونکہ ان ہی کی ''للو'' چل رہی ہوتی اور دوسرے ہونقوں کی طرح اپنے بھاڑ جتنے منہ کھول کر سن رہے ہوتے۔ یوں لگتا تھا کہ گویا برکت صاحب کی بولتی ہی بند ہو جائے گی۔ اگر انہوں نے اپنے منہ بند کر لئے۔

خیراتی ہوٹل......اس نام پر برکت صاحب نے ہی سب سے پہلے اس وقت اعتراض کیا، جب ہوٹل کا سائن بورڈ تیار ہوا تھا۔

ہوٹل کا مالک سامنے سے آ رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں مٹھائیوں کے ڈبے تھے۔ چھوٹے قد کا مالک تھا اور اس کی توند قابل اعتراض حد تک باہر نکلی ہوئی تھی۔ برکت صاحب کو دیکھ کر جب وہ اخلاقاً مسکرایا تو اس کے چہرے پر ایک عجیب قسم کا بھولپن نمایاں ہو گیا۔

''سلام صاب......!'' اس کی آواز ذرا کھنک دار تھی۔

''وعلیکم السلام!'' برکت صاحب نے اس کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے زور سے سر ہلایا۔ ''بھئی...... یہ کیا نام ہوا؟'' ان کا اشارہ سائن بورڈ کی طرف تھا۔

پہلے تو وہ چونکا اور پھر غور سے سائن بورڈ کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ''کیوں کیا ہوا......؟ ٹھیک تو ہے صاب......''

''تم نے یہ نام کیوں رکھا؟''

''اس لئے صاب......کہ میرا نام ہی شبن کھیراتی ہے۔''

اس نے سادہ سا جواب دیا۔ ''لیں مٹھائی کھائیں۔''

شاید یہ وہ واحد جواب تھا، جس نے برکت صاحب کو بغلیں جھانکنے پر مجبور کر دیا تھا، ورنہ وہ......اور خاموش ہو جائیں......سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اور پھر آہستہ آہستہ یہ نام زبان زد عام ہو گیا اور لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ کسی کا بھی چائے وغیرہ کا موڈ ہوتا تو خیراتی ہوٹل کو ہی ترجیح دیتا۔ مزدور، رکشے والے، ٹھیلے والے اور کباڑیے سبھی ادھر کا رخ کرتے تھے۔ حتیٰ کہ حکیم طولانی بھی کبھی کبھی ادھر آ نکلتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ہوٹل کے مالک شبن خیراتی کا اخلاق بہت اچھا تھا۔

حکیم طولانی، علاقے کی ایک اور معزز شخصیت تھے۔ یہاں ان کا مطب بھی تھا......انہیں حکمت کے ساتھ ساتھ شاعری بھی لاحق تھی۔ اس لئے اکثر اپنے مریضوں کو تازہ کلام بھی سناتے دکھائی دیتے۔ اگر کوئی مریض سماعت سے محروم ہوتا، تو اسے اپنی غزل دوا کی پڑیا کی جگہ باندھ کر دے دیتے۔ ان کی ایک عادت خاص اور بھی تھی اور وہ یہ کہ جب بھی حکیم صاحب کوئی غزل سوچ رہے ہوتے، یا گنگنا رہے ہوتے تو ان کے ہاتھ اپنی میز پر طبلہ بجانے میں مصروف ہوتے۔ اس وقت ان کے پاس کوئی موجود ہو یا نہ ہو، مریض ہو یا نہ ہو، وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔

یہ تھا تھوڑا سا تعارف حکیم طولانی صاحب کا......جن کا بہ طور شاعر تخلص طولانی تھا۔

اس قصبے میں اور بھی کئی قوس وقزح کے رنگ تھے۔ لیکن کچھ عرصے سے یہ رنگ پھیکے سے پڑے ہوئے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ پورا

قصبہ ایک عجیب قسم کی افتاد میں گرفتار تھا اور قصبے کی درجنوں جوان، خوب صورت لڑکیاں اس مصیبت کی زد میں آ چکی تھیں۔

وہ اوپری ہوا تھی، آسیب تھا یا کوئی جن تھا، اس بات کا قطعی اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ بس کسی بھی محلے کی، کسی بھی گھر کی کوئی لڑکی اس کی زد پر ہوتی۔ پندرہ دن تک اس پر دورے جیسی کیفیت رہتی اور پندرہ دن بعد وہ خود بخود اپنی اصل حالت میں آ جاتی۔ اسے خود معلوم نہ ہوتا کہ ان دنوں اس پر کیا بیتی۔

بال بکھرے رہتے، آواز بھاری ہو جاتی، خوراک بڑھ جاتی اور بعض لڑکیاں تو اپنے گھر والوں کو مارتی پیٹتی بھی تھیں۔

مسجد کے امام صاحب کو بلایا جاتا۔ وہ جھاڑ پھونک کرتے تو اتنا فرق پڑتا تھا کہ پھر لڑکی گم صم رہنے لگتی۔ کسی کو تنگ نہیں کرتی تھی۔ لیکن اس کی اصل کیفیت پندرہ دن بعد ہی اپنی جون میں آتی تھی۔ کوئی کتنا ہی سر مارے لیکن مجال ہے کہ وہ بھوت پندرہ دن سے پہلے اتر جائے۔

ہر دو تین ماہ بعد یہ آفت ضرور نازل ہوتی تھی۔ وہ تو شکر تھا کہ پندرہ دن بعد یہ آفت خود بہ خود ٹل جاتی تھی۔ ورنہ یہ تو کھلم کھلا روگ جاں تھا۔ اور پھر...... ایک دن تو انتہا ہو گئی، جب خود برکت صاحب کی جوان بیٹی مہ پارہ پر یہ مصیبت سوار ہوئی۔

مغرب کا وقت تھا اور مہ پارہ چھت سے اتر کر نیچے آ رہی تھی کہ آخری زینہ طے کرتے ہی وہ دھڑام سے گری اور ساکت ہو گئی۔

بیگم برکت، جن کا نام گل بانو تھا۔ اس وقت باورچی خانے میں تھیں۔ فوراً ہی وہ مہ پارہ کی طرف متوجہ ہوئیں اور بجلی کی سی سرعت سے ہانڈی چولہا چھوڑ کر مہ پارہ کی طرف لپکیں۔

”ہائے میری بچی...... میری لال......“ ان کے منہ سے نکلا۔ وہ جلدی سے مہ پارہ کی طرف بڑھیں اور جلدی کے عالم میں اس چوکی کو نہ دیکھ پائیں جو راستے میں پڑی ہوئی تھی۔

اور پھر اندھا دھند بھاگنے کے چکر میں ان کا پاؤں اس چوکی سے لگا۔ ادھر چوکی الٹی، ادھر گل بانو کا پاؤں غیر متوازن ہوا، وہ ترچھی ہوئیں اور ان کے گلے سے برآمد ہونے والی چیخ کافی گونجدار تھی۔ اب وہ بھی مہ پارہ کے قریب ہی چاروں خانے چت پڑی ہوئی تھیں۔

☆......☆......☆

ظلمت کدہ

ظلمت کدہ کہانی ہے ایک ایسے چور کی جو ایک رات واردات کرنے کے بعد پولیس سے بچنے کے لئے ایک ایسے مکان میں جا کر چھپ جاتا ہے جو کہ آسیب ذدہ ہے اور پھر اُسے وہاں جس قسم کے ہولناک حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اُس کے بارے میں پڑھ کر قارئین خوف سے تھرا اُٹھتے ہیں۔ ایم۔ اے۔ عظیم نے اس ناول کو اتنی خوبصورتی سے لکھا ہے کہ قاری آخر تک اُس ظلمت کدہ کے طلسم سے باہر نہیں نکل پاتا۔ حیرت انگیز اور خوفناک واقعات سے بھرپور اس کتاب کو آپ **کتاب گھر کے ناول سیکشن** میں پڑھ سکتے ہیں۔

برکت صاحب کے پڑوس میں رشید رکشے والے کا گھر تھا اور اس وقت اس کا منجھلا لڑکا منو اپنی چھت پر کھڑا ہوا ٹی وی کا انٹینا گھما رہا تھا۔ اس نے گل بانو کی چیخ سنی، چونک کر نیچے جھانکا اور چھت کی جالیوں سے اندر کا منظر دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ پھر وہ جلدی سے پلٹا اور انٹینا کو چھوڑ چھاڑ کر زینے کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہ جلدی جلدی گھر کے زینے طے کرتا ہوا اس کمرے میں پہنچا، جہاں اس کی ماں سلائی مشین سے مغز ماری کر رہی تھی۔

''اماں......اماں......وہ......وہ......'' منو اتنا ہی بول پایا۔ بھاگنے کی وجہ سے اس کی سانس پھول گئی تھی۔

''کیا مصیبت ٹوٹ پڑی تجھ پر......'' وہ روا روی میں بولی۔ پھر اس نے چونک کر منو کے خالی ہاتھوں کی طرف دیکھا اور بھنا کر کہا۔ ''دال اور چاول کہاں ہیں؟''

''لا دوں گا اماں۔ میں انٹینا ٹھیک کر رہا تھا کہ......'' منو نے بولنا چاہا۔

''کیا......؟ میں نے تجھ سے سودا منگایا تھا اور تو چھت پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ ٹھہر جا کم بخت......! میں آج اس موئے ٹی وی میں ہی آگ لگا دوں گی۔ تیرے ابا آئیں گے تو انہیں بھون بھان کر ٹی وی ہی کھلا دوں گی۔ تم لوگوں سے کوئی کام بولوں اور مجال ہے جو وہ کام ایک دفعہ کہے میں ہو جائے۔ میں تو سچ تنگ آ گئی ہوں تم لوگوں سے......اچھا یہ بتا پپو اور گڈو کہاں ہیں؟'' ماں روانی سے بولتی چلی گئی۔

''ٹی وی والے کمرے میں......''

''وہ وہاں کیا کر رہے ہیں؟'' وہ پھر دہاڑی۔ ''بلا ان کو...... ہر وقت ٹی وی میں گھسے رہتے ہیں سب کے سب...... کسی کام کے نہ کاج کے......تو جا......ان دونوں کو یہاں بھیج اور جلدی سے سودا لا دے۔''

عین اسی وقت پپو اور گڈو کمرے میں داخل ہوئے۔

''ہم وہاں پاگلوں کی طرح چینل گھما رہے ہیں اور تم یہاں کھڑے ہو......'' پپو نے منو کو آنکھیں دکھائیں۔

ادھر منو بے چارہ برکت صاحب کے گھر کی صورت حال بتانے کے لئے بے چین تھا، فوراً ہی وہ بولا۔ ''میں اتنی دیر سے اماں کو کچھ بتانا چاہ رہا ہوں، یہ بولنے ہی نہیں دے رہیں......اماں...... میں چھت پر......'' وہ پھر اپنی ماں کو مخاطب کرنے لگا۔

عین اسی وقت مغرب کی اذان ہو گئی۔ اماں نے فوراً دوپٹہ سر پر اوڑھا اور مشین سے ہاتھ ہٹا کر منو کو ڈانٹا۔ ''ذرا چپ رہ......مغرب کی اذان ہے۔ سمندر بھی رک جاتا ہے اس وقت...... مگر تیری گز بھر کی زبان، سمندر سے بھی زیادہ بے چین ہے...... چپ رہ......''

منو کا برا حال تھا۔ ناچار...... بے چارہ خاموش ہو گیا لیکن اس کے ہونٹ پھڑ پھڑا رہے تھے۔ اور پھر جیسے ہی اذان ختم ہوئی اس نے ماں کو بولنے کا موقع دیئے بغیر ایک ہی سانس میں برکت صاحب کے گھر کا ماجرا کہہ سنایا۔

ماں یہ سنتے ہی اچھل کر کھڑی ہو گئی اور اسے غصیلی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کم بخت...... تیرا ستیاناس جائے۔ تو اب بتا رہا ہے۔ اتنی دیر سے کیا بتاشے منہ میں ڈال رکھے تھے؟ منہ سے پھوٹا کیوں نہیں۔ ذرا ٹھہر جا...... تیری تو میں واپس آ کر خبر لیتی ہوں۔''

اس نے تیزی سے قدم بڑھائے اور دروازے پر پہنچ کر ایک بار پھر ان تینوں کی طرف گھومی۔ ''بھاگ کر جاؤ...... اور شنو چچی، صغرا خالہ اور خالہ اماں کو بھی خبر کردو۔ میں جا رہی ہوں۔ جانے کیا بات ہو......؟''

☆......☆......☆

گل بانو ہوش میں آئیں تو محلے کے جانے پہچانے چہرے انہیں دکھائی دیئے۔ چند لمحوں تک انہیں یاد ہی نہ آسکا کہ کیا ہوا تھا......؟

لیکن پھر جب اس وقت کا منظر ان کی نگاہوں کے سامنے گھوما تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ فوراً ہی ایک ہلکی سی چیخ ان کے حلق سے برآمد ہوئی اور بے اختیار ان کا ایک ہاتھ اپنے سر کی طرف گیا۔ سر کے دائیں جانب ایک اور چھوٹا سا سرا ابھر آیا تھا اور کمر تو گویا ٹوٹ کر دوہری ہوگئی تھی۔

لیکن انہیں اپنی پرواہ کب تھی۔ اپنی چوٹیں اور درد بھول بھال کر ان کی نگاہوں نے مہ پارہ کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ سامنے والے پلنگ پر انہیں مہ پارہ بے سدھ لیٹی ہوئی دکھائی دی۔ اس کے پاس کلثوم بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ شنو چچی کی بہو تھی۔

گل بانو کو ہوش میں آتا دیکھ کر شنو چچی، صغرا خالہ اور خالہ اماں ان کی طرف لپکیں۔ البتہ کلثوم مہ پارہ ہی کی طرف متوجہ رہی۔

''مہ پارہ...... مہ پارہ...... میری بچی!'' گل بانو نے پلنگ سے اٹھنے کی کوشش کی۔

''ارے...... لیٹی رہو گل بانو...... لیٹی رہو...... کلثوم اسے دیکھ رہی ہے۔ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ ابھی ہوش میں آجائے گی۔ لو...... تمہارے سر سے تو خون بہہ رہا ہے۔'' خالہ اماں نے پہلے تسلی بخشی اور پھر تشویش بھرے انداز میں کہا۔

گل بانو کو بڑی مشکل سے بٹھایا گیا۔ سر کی پٹی کی گئی اور پھر شنو چچی نے سوال کیا۔ ''آخر ہوا کیا تھا گل بانو؟''

''وہ...... وہ...... مہ پارہ سیڑھیوں سے اتری اور......''

گل بانو کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔ عین اسی وقت کلثوم کے گال پر ایک زناٹے دار تھپڑ پڑا۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ الٹ کر پلنگ سے گری۔

گل بانو وغیرہ اچھل پڑیں، کیونکہ یہ تھپڑ مہ پارہ نے اس کے گال پر مارا تھا۔

☆......☆......☆

مہ پارہ ہوش میں آچکی تھی لیکن عجب حال تھا، اس کا۔ آنکھیں لال بھبوکا، گال سرخ ٹماٹر کی طرح اور چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ اور پھر رہی سہی کسر بھی پوری ہوگئی۔ وہ کسی بھینسے کی طرح ڈکرائی اور مزید خوں خوار دکھائی دینے لگی۔ وہ کسی بھی زاویئے سے مہ پارہ نہیں لگ رہی تھی۔

گل بانو کا تو وہ حال تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ لیکن یہ مثال اس لئے موقع کی مناسبت سے نہیں تھی کہ ابھی ابھی تو ان کے سر سے خون بہا تھا۔ باقی عورتیں بھی ہکا بکا تھیں کبھی ایک دوسرے کو دیکھتیں اور کبھی مہ پارہ اور کلثوم کو۔

ادھر کلثوم اب سنبھل کر کھڑی ہو چکی تھی۔ ہاتھ گال کو سہلا رہا تھا اور وہ ڈرے ڈرے انداز میں پیچھے ہٹ چکی تھی۔

ایک بار پھر مہ پارہ کسی بھینسے کی طرح ڈکرائی اور ساتھ ہی کرخت مردانہ سی آواز میں دہاڑی۔ ''دفع ہو جاؤ کم بخت ماریو! چلی جاؤ یہاں

سے......ورنہ مار مار کر ادھ موا کر دوں گا۔‘‘

سب عورتیں سناٹے میں آ گئیں۔ پھر خالہ اماں کے منہ سے نکلا۔ ’’گگ......گل......بب......بانو......یہ......یہ تو......وہی آسیب ہے۔ ہائے اللہ......‘‘

خالہ اماں کے یہ الفاظ بجلی کی طرح کانوں کے پردوں پر گرے تھے گل بانو دھک سے رہ گئیں۔ اسی وقت دروازے دستک ہوئی۔

☆......☆......☆

نورس قصبے سے تھوڑے فاصلے پر پہاڑی سلسلہ تھا، جن کے درمیان میں ایک پیالہ نما میدان تھا۔ بہ ظاہر ویران اور سنسان دکھائی دینے والے اس میدان میں دراصل جنوں کا ایک قبیلہ آباد تھا، جو کہ عام نظروں سے اوجھل تھا۔

یہاں ان کے باقاعدہ خیمے نصب تھے اور یہ مخلوق نہایت اطمینان سے یہاں رہائش پذیر تھی۔ ان ہی خیموں میں سے ایک خیمے میں اچانک ہی جھگڑا شروع ہو گیا۔ یہ جھگڑا ایک ادھیڑ عمر جن اور اس کی بیوی جنی کے درمیان ہوا تھا۔

تھوڑی دیر پہلے تک تو ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ دونوں ہی معمول کے مطابق باتیں کر رہے تھے۔ جھگڑا اس وقت شروع ہوا جب جنی نے کھانے کا دسترخوان لگایا۔

’’بوقاف کہاں ہے؟‘‘ جن نے سوال کیا۔

’’منا تو آج پھر......‘‘ جنی بولتے بولتے رک گئی۔ پھر موضوع بدلنے کی غرض سے مسکرا کر کہنے لگی۔ ’’ہاں......یاد آیا......آج پتا نہیں کیا بات ہے، کوئلے اتنے مزے کے تلے گئے ہیں کہ بس......اور......‘‘

’’میں نے پوچھا ہے کہ بوقاف کہاں ہے؟‘‘ جن نے دوبارہ سوال دہرایا۔ اس کی نگاہوں کا زاویہ بھی بدل گیا تھا۔

’’آتا ہی ہوگا......‘‘ وہ لاپروائی سے بولی۔ ’’آپ لکڑیوں کا بھرتہ کھائیں نا......‘‘

’’بھاڑ میں گیا بھرتہ......‘‘ جن بھر گیا۔ ’’جو پوچھا ہے، اس کا جواب دو۔‘‘

اب ذرا جنی کا موڈ بھی بدلا۔ وہ منہ بنا کر بولی۔ ’’آپ تو ایک بات کے پیچھے ہی پڑ جاتے ہیں۔ کہہ تو رہی ہوں کہ آتا ہی ہوگا۔‘‘

’’ہوں......سمجھا......‘‘ جن ہنکارہ بھر کر غرایا۔ ’’اس کا مطلب ہے کہ وہ آج پھر انسانوں کی بستی میں گیا ہے۔ کیوں......؟‘‘

اب کے جنی کچھ نہیں بولی تھی۔ بلکہ خاموشی سے کھانا کھاتی رہی۔ ’’میں......تم دونوں سے تنگ ہوں۔ ایک تو تم نے اسے منا بول بول کر بالکل انسانوں جیسی خصلت والا منا بنا دیا ہے۔ میری کوئی بھی بات نہیں سنتا، اگر سنتا بھی ہے تو دونوں کانوں کا فائدہ اٹھا کر ایک سے سنتا ہے اور دوسرے سے نکال دیتا ہے۔ تمہارے لاڈ پیار نے اسے سر پر چڑھا رکھا ہے۔‘‘ جن بولتا چلا گیا۔

’’آپ بھی بس......اچھا......اس نے آپ کا کون سا حکم نہیں مانا۔ اپنے پرسمیٹ کر تو بے چارہ آپ کی ہر بات سنتا ہے۔‘‘ جنی نے اپنے بیٹے کی طرف داری کی۔

’’صرف سنتا ہے نا...... اس پر عمل تو نہیں کرتا۔ میں نے کتنی بار اسے منع کیا ہے کہ انسانوں کی بستی میں مت گھسا کر، ان کی لڑکیاں بہت خطرناک ہوتی ہیں۔ وہ اپنے گھروں کی چھتوں پر بال پھیلائے کھڑی ہوتی ہیں اور ہمارے سیدھے سادے معصوم جن بچے ان کے بالوں میں الجھ کر پھنس جاتے ہیں۔ پھر انسانوں کے عامل ہمارے بچوں کو طرح طرح کی اذیتیں دے کر مفلوج کر دیتے ہیں۔ یہی نہیں...... بلکہ کئی اور مصیبتیں بھی انسانوں کی بستیوں میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً رات کے وقت فضا میں خطرناک قسم کے وظیفے گھومتے رہتے ہیں، تاکہ کوئی معصوم اور بھولا بھالا جن جکڑ لیا جائے۔ پھر اسے قید میں ڈال دیا جاتا ہے، یا پھر غلام بنا لیا جاتا ہے۔‘‘ جن نے تفصیل سنا ڈالی۔ پھر وہ تھوڑے سے توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔

’’مگر میں تم سے کیوں سر ماری کر رہا ہوں۔ تم ان سب باتوں کو کیا جانو......؟ تم تو سارا دن یہاں رہتی ہو۔ تم کہاں سمجھ پاؤ گی ان لڑکیوں کے بالوں اور گھومتے ہوئے وظیفوں کو......‘‘

’’میں کیوں نہیں جانوں گی......؟‘‘ جنی تنک کر بولی۔ ’’مجھے بھی سب معلوم ہے۔‘‘

’’پھر بھی تم نے بوقاف کو اتنی ڈھیل دے رکھی ہے؟ آخر کیوں؟‘‘ جن نے سوال کیا۔

’’میں کیا کروں؟ اس کی عقل ہی ٹھکانے پر نہیں ہے۔ میں بھی اسے اتنا سمجھاتی ہوں مگر وہ......‘‘

’’تم نے کیا خاک سمجھایا ہوگا اسے...... منا منا تو بولتی رہتی ہو تم اسے...... ہونہہ......‘‘ جن نے منہ بنایا۔

’’آپ خود بھی تو کبھی کبھی موڈ میں آ کر اسے منا کہہ دیتے ہیں۔‘‘ جنی نے یاددہانی کروائی۔

’’کبھی کبھی سنک جاتا ہوں...... دماغ چل جاتا ہے میرا......‘‘ جن نے ہاتھ نچا کر جواب دیا۔

’’آپ جس دن کام پر نہیں جاتے، لڑائی جھگڑے کی باتیں ضرور نکلتی ہیں۔‘‘ جنی کا لہجہ شکایت آمیز تھا۔

’’چھٹی والے دن بھی چلا جایا کروں؟ ہیں؟ مجھے تو اب ایسا لگتا ہے کہ جیسے منے کے ساتھ ساتھ منے کی اماں بھی میری غیر موجودگی میں انسانوں کی بستی میں گھومتی پھرتی ہے۔‘‘

’’ہائے...... ہائے......‘‘ جنی نے سینے پر ہاتھ مارے اور آنکھیں پھیلا کر بولی۔ ’’اتنا بڑا الزام لگا دیا آپ نے مجھ پر...... توبہ...... ذرا سوچ سمجھ کر بولا کریں بس جو منہ میں آیا......‘‘

’’تم دونوں نے میری عقل خبط کر کے رکھ دی ہے۔‘‘ جن اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ’’تمہیں خود بھی معلوم ہے کہ وہ کتنی بار یہ حرکت کر چکا ہے۔ تم ہر دفعہ اسے بچا لیتی ہو۔ ورنہ تو میں اسے چھٹی کا دودھ یاد دلا دوں۔‘‘

یہ سن کر جنی بے ساختہ ہنس پڑی۔

’’کیوں...... کیا ہوا؟‘‘ جن نے حیرت سے پوچھا۔

’’کک...... کچھ نہیں......‘‘ جنی نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔ ’’چھٹی کا دودھ تو انسانوں کے یہاں ہوتا ہے۔ یہ اسی قوم کا محاورہ ہے۔‘‘

’’اوہ...... ہاں......‘‘ جن لمحہ بھر کے لئے گڑبڑایا پھر جنی کو گھورتے ہوئے بولا۔ ’’محاورہ ہی ہے نا...... لطیفہ تو نہیں ہے......؟‘‘

’’آپکے منہ سے تو لطیفہ ہی لگ رہا ہے......انسانوں کی برائی بھی کر رہے ہیں اور انکے محاورے بھی استعمال کیے جا رہے ہیں۔ واہ......‘‘

’’غلطی سے منہ سے نکل گیا۔ کم بختوں نے بنائے بھی تو موقع محل سے ہیں۔ ہاں تو......اب میں بوقاف کی ٹھکائی ہی لگا دوں گا۔ عقل ٹھکانے آ جائے گی اس کی۔‘‘

’’چھوڑیے......بچہ ہی تو ہے ابھی۔‘‘ جنی نے کہا۔

’’یہ بچہ کسی دن کسی بوڑھے انسان کے وظیفے کے نیچے آ کر دب گیا نا......تو پھر......روتی رہنا 100، 50 سال تک......کہہ دیتا ہوں۔‘‘ جن نے تنبیہ کی۔

’’کیسی بدفعالیں منہ سے نکال رہے ہیں۔ کچھ تو خیال کریں۔‘‘ جنی نے اپنا منہ پیٹا۔

’’اور کیا کہوں......؟ میں نے کئی جنوں کا حشر دیکھا ہے۔ تمہیں قاقونہ کے لونڈے کا واقعہ یاد ہے نا......؟‘‘ یہ کہہ کر جن نے پلیٹ سے ایک ہڈی اٹھا کر منہ میں ڈال لی......’’کس بری طرح وہ انسانوں کے چنگل میں پھنسا تھا؟ لینے کے دینے......مم......میرا مطلب ہے کہ بڑی مشکل سے اس کی جان بچی تھی۔ ورنہ اسے جلا دیا جاتا۔ بڑے ظالم ہوتے ہیں یہ انسان......‘‘

اتنا کہہ کر جن منہ چلانے لگا۔ وہ ہڈی چبا رہا تھا۔ پھر اس نے برا سا منہ بنایا اور جنی کی طرف دیکھ کر بولا۔ ’’تم آج پھر نمک ڈالنا بھول گئیں؟‘‘

☆......☆......☆

کتاب گھر کا پیغام

آپ تک بہترین اردو کتابیں پہنچانے کے لیے، ہمیں آپ ہی کے تعاون کی ضرورت ہے۔ ہم کتاب گھر کو اردو کی سب سے بڑی لائبریری بنانا چاہتے ہیں، لیکن اس کے لیے ہمیں بہت ساری کتابیں کمپوز کروانا پڑیں گی اور اسکے لیے مالی وسائل درکار ہوں گے۔

اگر آپ ہماری براہ راست مدد کرنا چاہیں تو ہم سے kitaab_ghar@yahoo.com پر رابطہ کریں۔ اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو کتاب گھر پر موجود ADs کے ذریعے ہمارے سپانسرز ویب سائٹس کو وزٹ کیجئے، آپکی یہی مدد کافی ہوگی۔

یاد رہے، کتاب گھر کو صرف آپ بہتر بنا سکتے ہیں۔

یہ برکت صاحب تھے۔ انہوں نے گھر میں داخل ہوتے ہی غیر عورتوں کی موجودگی کو محسوس کیا۔ جلدی سے اپنی شیروانی جھٹکی اور کالر درست کئے۔ پھر ان کے ہاتھ بے ساختہ اپنے خضاب زدہ بالوں میں خیالی کنگھا کرنے لگے۔

دروازہ کلثوم نے کھولا تھا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اس نے منہ سے کچھ نہ کہا۔ صرف ہونٹ پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔

''مہ پارہ کہاں ہے؟'' برکت صاحب نے دھیرے سے پوچھا۔ کلثوم نے ہاتھ اٹھا کر اندر کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا بایاں ہاتھ اب بھی اپنے گال کو سہلا رہا تھا۔

برکت صاحب ایک شان ادا سے چلتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور وہاں کا منظر دیکھ کر بھونچکے رہ گئے۔

ایک پلنگ پر مہ پارہ دوزانوں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور گردن مسلسل جھومنے کے انداز میں حرکت کر رہی تھی۔ گل بانو اور دوسری عورتیں اس سے ذرا فاصلے پر کھڑی ہو کر کورس کے انداز میں کانپ رہی تھیں

برکت صاحب کی تو عقل ہی خبط ہوگئی۔ عجیب تماشا تھا۔ وہ آگے بڑھے اور مہ پارہ کو مخاطب کرتے ہوئے غصیلے لہجے میں دہاڑے۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے......؟ یہ کیا حرکت ہے مہ پارہ......؟''

مہ پارہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اب برکت صاحب عورتوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان سب کے چہروں پر زلزلے کے آثار تھے۔ کوئی کچھ بھی نہ بول سکا۔

برکت صاحب دوبارہ گرجے۔ ''میں پوچھ رہا ہوں، یہ تم کیا تماشہ کر رہی ہو مہ پارہ؟''

اب کی بار مہ پارہ کی گردن اور بھی تیزی سے ہلنے لگی۔ ''کیا بہری ہوگئی ہو؟'' برکت صاحب کی آواز نے سب کے کان چٹخا دیئے۔

''دکھائی نہیں دے رہا بڈھے؟'' دفعتاً مہ پارہ نے گردن اٹھا کر بھاری بھرکم آواز میں کہا۔ اس کی آنکھیں شعلہ بار تھیں۔

اب کی بار برکت صاحب کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ لفظ ''بڈھے'' کسی ہتھوڑے کی طرح سماعت پر برسا تھا۔ عورتوں کے سامنے یہ انداز تخاطب اور وہ بھی ان کی اپنی بیٹی......!

غصے کے مارے وہ بے قابو ہونے لگے اور مٹھیاں بھینچ کر چلائے۔ ''کیا پاگل ہوگئی ہو؟ دماغ خراب ہوگیا ہے تمہارا؟''

''تو خود پاگل ہوگا بڈھے......'' مہ پارہ ان ہی کے انداز میں گرجی۔

اور کمرے میں موت کا سا سناٹا طاری ہوگیا۔ عورتوں کے چہروں پر مردنی چھا گئی۔ کیسا جواب ملا تھا، برکت صاحب کو؟ خود برکت صاحب کی طبیعت صاف ہوگئی تھی۔ چند لمحے تک تو وہ سکتے کے عالم میں کھڑے رہ گئے۔

گل بانو نے فوراً ہی انہیں ایک جانب گھسیٹا اور جلدی جلدی برکت صاحب کو صورت حال سے آگاہ کیا...... برکت صاحب چپ چاپ سن رہے تھے۔ اس دوران میں وہ کبھی گل بانو کی شکل دیکھتے اور کبھی مہ پارہ کی۔ مہ پارہ کے منہ سے نکلے ہوئے جملے کی خفت وہ اب تک محسوس کر رہے تھے۔ دوسری عورتیں بھی اب ان دونوں کے گرد آ کر کھڑی ہوگئی تھیں۔

”میں اس وقت مسجد میں تھا۔ ایک بچے نے مجھے آ کر بتایا تھا کہ مہ پارہ کی طبیعت خراب ہوگئی ہے۔“ برکت صاحب نے کہا۔ وہ تشویش بھرے انداز میں مہ پارہ کی طرف متوجہ تھے۔

”ابے بڈھے...... نماز تو پوری پڑھ لیتا۔“ ایک بار پھر مہ پارہ نے ہانک لگائی۔

اب تو برکت صاحب سے رہا نہ گیا۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر مہ پارہ کی طرف لپکے۔ عورتوں نے بڑی مشکل سے انہیں قابو کیا۔

”میں...... میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ برکت صاحب نے آپے سے باہر ہو کر کہا۔ غصے کی زیادتی سے ان کا جسم کانپ رہا تھا۔

”یہ مہ پارہ نہیں بول رہی برکت صاحب! یہ تو آسیب بول رہا ہے۔“ شنو چچی نے سمجھایا۔

”اتنا بدتمیز آسیب...... اسے بات کرنے کا بھی سلیقہ نہیں ہے۔“ برکت صاحب کے لہجے میں شکایت تھی۔

”میرا گال ابھی تک جھنجھنا رہا ہے برکت صاحب...... ابھی تک۔“ کلثوم منہ بسورتی ہوئی بولی۔

”تم نے کیا کیا تھا؟“ برکت صاحب نے اسے گھورا۔ کلثوم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ چور نظروں سے مہ پارہ کی طرف ضرور دیکھا تھا۔

دفعتاً مہ پارہ ایک بار پھر بھینسے کی طرح ڈکرائی۔ یہ آواز برکت صاحب نے سنی تھی۔ وہ مہ پارہ کی طرف متوجہ ہوگئے۔ ادھر صغرا خالہ نے کلثوم کو ایک جانب گھسیٹا اور سرگوشیانہ اندز میں بولیں۔

”تو بتا کلثوم...... مہ پارہ نے تجھے تھپڑ کیوں مارا تھا؟“

”وہ...... خالہ...... جب میں نے دیکھا کہ مہ پارہ کسی طرح ہوش میں ہی نہیں آ رہی تو...... میں نے سب کی نظر بچا کر اسے چپل سنگھائی تھی۔“ کلثوم نے انکشاف کیا۔

”اری بدبخت...... یہ تو نے کیا کیا؟“ صغرا خالہ کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔ ”آسیب تجھے مار ڈالتا......؟ کیسی پاگل ہے تو......؟“

”اب مجھے کیا معلوم تھا کہ مہ پارہ پر آسیب ہوگا۔“ کلثوم نے جواب دیا۔

”کیا ہوا صغرا خالہ؟ کیا بات ہے؟“ گل بانو نے ان دونوں کو سرگوشیاں کرتے دیکھا تو ان کے قریب آ کر پوچھنے لگیں۔

”کک...... کچھ نہیں۔ ہم دونوں ایسے ہی باتیں کر رہے تھے۔“ کلثوم نے جلدی سے بات بنائی۔

”ہاں اور کیا۔“ صغرا خالہ بھی بولیں۔ پھر جلدی سے کہا۔ ”ارے ہاں...... گل بانو......! برکت صاحب سے کہو کہ امام صاحب کو بلا کر لے آئیں۔ وہی دم درود کریں گے تو مہ پارہ کو کچھ آرام آئے گا۔“

☆......☆......☆

امام صاحب کے انداز سے لگ رہا تھا کہ جب تک وہ مہ پارہ کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ نہیں لیں گے، انہیں یقین نہیں آئے گا کہ مہ پارہ بھی آسیب کا شکار ہوگئی ہے۔

انہوں نے راستے میں بھی برکت صاحب سے پوچھا تھا۔ ”کیا واقعی وہ آسیب کا شکار ہوگئی ہے؟“

”ہاں بھئی...... آپ کو یقین کیوں نہیں آرہا؟ میں نے خود اس کی حالت دیکھی ہے۔“ برکت صاحب نے بتایا۔

”ہوں...... ہوسکتا ہے کہ اسے معلوم نہ ہو۔“ امام صاحب اپنی داڑھی کو سلجھاتے ہوئے بڑبڑائے۔

”کسے......؟ اور کون سی بات معلوم نہ ہو؟“ وہ الجھ گئے۔

”اسی آسیب کو...... ہوسکتا ہے کہ اسے معلوم نہ ہو کہ یہ برکت صاحب کی بیٹی ہے۔ ورنہ وہ ادھر کا رخ نہ کرتا۔“

”میں اب بھی نہیں سمجھا امام صاحب۔“

”میرا مطلب یہ ہے کہ ماشاء اللہ سے پورے علاقے میں آپ کا نام ہے، عزت ہے، رعب ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ آسیب آپ سے واقف بھی نہیں ہے اور نہ ادھر کا ہے۔“ امام صاحب نے خیال ظاہر کیا۔

”وہ کدھر کا بھی ہو۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ اب وہ نہ ادھر کا رہے اور نہ ادھر کا۔ کم بخت......! مجھے بڈھا کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ نانہجار کہیں کا......“ برکت صاحب کو دوبارہ غصہ آنے لگا۔

”انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا......“ امام صاحب نے تسلی دی۔

پھر وہ دونوں باتیں کرتے کرتے گھر کے نزدیک آپہنچے۔ جس کمرے میں مہ پارہ تھی، وہ عورتوں سے خالی کروایا گیا۔ امام صاحب کو دیکھتے ہی مہ پارہ نے عجیب وغریب آوازیں نکالنا شروع کردیں، جیسے غرا رہی ہو۔

وہ اسے دیکھ کر پرتشویش انداز میں سر ہلانے لگے۔ انہیں یقین آچکا تھا کہ مہ پارہ کے اوپر واقعی آسیب کا قبضہ ہوچکا ہے۔ ”ابے...... اپنے حمایتی کو لے کر آگیا بڈھا......“ مہ پارہ نے کہنا چاہا۔

”چپ کر......“ برکت صاحب نے گرج کر اس کی بات کاٹ دی۔ ”تیرا باپ ہوگا بڈھا۔ خبیث......!“

”تم ہی تو ہو میرے باپ......“ مہ پارہ نے ہنس کر کہا۔ برکت صاحب اس جواب پر کھسیا گئے۔

ادھر امام صاحب اپنے کام میں مصروف ہوچکے تھے۔ ان کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ شاید وہ کوئی وظیفہ پڑھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے مہ پارہ کی طرف رخ کیا اور زور سے پھونک ماری۔ دیکھتے ہی دیکھتے مہ پارہ لہرائی اور پلنگ پر ڈھیر ہوکر بے سدھ ہوگئی۔

”کیا آسیب بھاگ گیا امام صاحب......!“ برکت صاحب نے خوشی کا اظہار کیا۔

”ابھی کہاں برکت صاحب......“ امام صاحب نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

”ایں...... تو پھر یہ بے ہوش کیوں ہوگئی......؟“ وہ چونکے۔

”یوں سمجھ لیں کہ فی الحال میں نے اسے بے ہوشی کی دوا دے دی ہے۔“ امام صاحب نے بتایا۔

”اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خبیث اب بھی میری بیٹی پر سوار ہے۔ ہوش میں آتے ہی پھر بک بک کرے گا۔“

"جی ہاں...... یہ تو ہے۔"

"تو پھر...... یہ مردود کیسے جان چھوڑے گا؟"

"خود بہ خود۔ آپ پریشان مت ہوں۔ پندرہ دن بعد یہ آپ ہی آپ، آپ کی بیٹی کی جان چھوڑ دے گا۔ پورے قصبے میں اس نے سب کے ساتھ یہی کیا ہے۔" امام صاحب نے سمجھایا۔

"پندرہ دن......!" برکت صاحب کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "میں تو ایک دن بھی اسے اپنے گھر میں نہیں رہنے دوں گا۔ یہ خبیث اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔ میرا نام برکت ہے برکت...... ہاں......"

"آپ کریں گے کیا......؟" امام صاحب نے پوچھا۔

"آپ اس آسیب کو بھگا سکتے ہیں؟" انہوں نے الٹا سوال کیا۔

"قطعی نہیں۔ میں مسجد کا امام ہوں۔ کسی خانقاہ کا پیر نہیں ہوں۔ مجھے آسیب اور جنوں سے لڑنے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔" وہ نفی میں سر ہلا کر بولے۔

"بس...... تو پھر میں ابھی اور اسی وقت پیر گاگے شاہ کو یہاں لے کر آتا ہوں۔" برکت صاحب فیصلہ کن انداز میں بولے۔

"یہ کون صاحب ہیں؟" امام صاحب نے پوچھا۔

"بڑے پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ شہر میں رہتے ہیں۔ وہیں ان کی حلوائی کی دکان بھی ہے۔ بہ ظاہر تو وہ مٹھائی بیچتے ہیں، لیکن اصل میں ان کا کام ہی جنوں اور بھوتوں کا قلع قمع کرنا ہے۔ لوگ دور دور سے ان کے پاس مسئلے لے کر جاتے ہیں اور شفایاب ہوتے ہیں۔"

یہ سن کر امام صاحب نے اثبات میں سر ہلا دیا...... مہ پارہ اب تک پلنگ پر بے سدھ پڑی ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

تھوڑی ہی دیر میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے محلے میں پھیل گئی۔ جس نے بھی سنا، منہ اور آنکھیں پھاڑتا ہی رہ گیا...... لوگوں کے ملے جلے جملے ہوئے۔ "آسیب اور برکت صاحب کے ہاں......؟ نہیں بھئی نہیں۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔"

"ارے...... کتنا خطرناک آسیب ہے...... برکت صاحب کے گھر بھی گھس گیا۔ باپ رے باپ......"

"چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ اب برکت صاحب اسے اس قصبے سے بھگا کر ہی دم لیں گے۔"

غرض یہ کہ ہر ایک زبان پر یہی کہانی تھی۔ ادھر، برکت صاحب پیر گاگے شاہ کی طرف روانہ ہوئے اور ادھر محلے والوں کا تانتا بندھ گیا۔

لوگ کئی گلیاں دور سے بھی مہ پارہ کی خیریت معلوم کرنے کے لئے چلے آ رہے تھے۔ ان میں زیادہ تعداد عورتوں کی تھی۔

ایک جاتا تو دوسرا آ دھمکتا، محلے والوں کا الگ ہجوم تھا۔ گل بانو تو پہلے ہی پریشان تھیں۔ اسی "ہجوم بلا" نے پریشانی میں مزید چار چاند لگا دیئے۔

خیر...... پھر شنو چچی وغیرہ نے ہی اس ریلے کو سنبھالا۔ بعض آنے والوں کو تو وہ ٹکا سا جواب دے دیتیں۔ بعض کو دور سے ہی اشارتاً ڈرا کر الٹے قدموں کر دیتیں۔

یہ سب کیوں نہ ہوتا......؟ آخر برکت صاحب ایک نامی گرامی شخصیت تھے۔

ادھر مہ پارہ کی حالت میں اب تک کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی تھی۔ وہ بدستور خواب خرگوش کے...... بلکہ خواب آسیب کے مزے لے رہی تھی۔ بے سدھ تھی بے چاری۔

☆......☆......☆

کتاب گھر کی پیشکش

کرن کا مقبول ترین ناول

مُڑ آ کے مُول نہ جائیں
شگفتہ بھٹی
قیمت: 350

☆ ایک ایسی معصوم اور سادہ دل لڑکی کی داستان۔ جو ایک ایسے شخص کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی جو حُسن پرست ہی نہیں حُسن کا سوداگر بھی تھا۔
☆ دولت اور شہرت کے نشے نے اس کے قدم ڈگمگا دیئے۔ جب آنکھ کھلی تو وہ تہی داماں تھی۔
☆ خوابوں کی اس راہ گزر کی داستان جہاں قدم قدم پر آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنیاں بکھری ہوئی ہیں مگر اس کے اختتام پر ایک گہری، اندھیری اور ہولناک دلدل ہے۔ جس میں معصوم اور سادہ دل لڑکیوں کی شرم و حیاء اور عصمت نایاب کے گہر گم ہو جاتے ہیں۔
☆ ''شوبزنس'' کے چمکیلے اور روپہلے راستوں کی داستان، جہاں ہر سو ''حُسن'' کی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنیاں بکھری ہیں دولت اور شہرت جہاں قدم قدم پر نچھاور ہونے کو تیار رہتی ہیں۔
☆ ان بندگلیوں کی کہانی، جہاں آگے کوئی منزل ہوتی ہیں نا پھر پیچھے کوئی راستہ بچتا ہے۔

اپنے قریبی بکسٹال یا ہاکر سے طلب فرمائیں

براہ راست منگوانے کا پتہ
ناشر
علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔
Ph: 7247414

اسٹاکسٹ
علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میوہسپتال، لاہور۔

شام ڈھلے کے گھر سے نکلے ہوئے برکت صاحب کی واپسی تقریباً رات ساڑھے گیارہ بجے ہوئی۔ گلی اس وقت تک سناٹے اور تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی، لیکن جیسے ہی برکت صاحب کی ٹیکسی (کرائے کی) کے انجن کا شور گلی میں گونجا، گھروں میں روشنیاں جل اٹھیں۔ گلی جگمگا اٹھی، گھروں کی کھڑکیاں اور دروازے کھٹا کھٹ کھل گئے۔

یوں لگ رہا تھا گویا سب تھے تو اپنے اپنے بستروں میں، لیکن برکت صاحب کے انتظار کی خاطر نیند سے کشتیاں لڑ رہے تھے تاکہ اپنی آنکھوں سے آسیب کا احوال دیکھ سکیں۔

سب کو اچھی طرح معلوم تھا کہ برکت صاحب کسی ''توپ'' قسم کی ہستی کو لینے شہر گئے ہیں اور وہ ہستی آتے ہی آسیب کو جھاڑے گی، نچوڑے گی اور پھر کھونٹی پر ٹانگ دے گی۔

محلے والوں کی اکثریت اب گھروں سے باہر آ چکی تھی۔ ان کی نظریں اس ٹیکسی پر گڑی ہوئی تھیں جو گلی میں داخل ہو چکی تھی۔ سب ہی بے قرار تھے اس شخصیت کو دیکھنے کے لئے آخر کار وہ ٹیکسی برکت صاحب کے گھر کے سامنے آ کر رک گئی۔

منتظر نگاہوں نے دیکھا کہ برکت صاحب ٹیکسی سے اتر رہے تھے۔ گل بانو بھی اس وقت دروازے پر اس طرح کھڑی تھیں کہ پٹ کی درز بنا کر باہر جھانک رہی تھیں۔ سب سے زیادہ تو انہیں بے چینی تھی۔ مہ پارہ کی مسلسل بے ہوشی نے انہیں پریشان کر رکھا تھا۔

برکت صاحب ٹیکسی سے اتر کر دوسری طرف پہنچے اور سائیڈ کا دروازہ کھول دیا۔ کافی دیر تک وہ منتظر رہے لیکن کوئی اور ٹیکسی سے برآمد نہ ہوا۔

اب برکت صاحب جھکے اور اندر جھانکا۔ دوسرے لمحے انہیں حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ ٹیکسی کے اندر لگے ہوئے بلب کی روشنی میں انہوں نے دیکھا کہ سیٹ پر براجمان شخصیت کے چہرے پر شدید تکلیف کے آثار تھے۔

''کیا ہوا آغا شاہ صاحب؟'' برکت صاحب نے بوکھلا کر پوچھا۔

ٹیکسی والا بھی گھوم کر ان کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ اس کے چہرے پر نہ جانے کیوں بے زاری کے آثار تھے۔

''او...... جلدی کرو بھائی صاحب......'' ٹیکسی والے کا لہجہ بھی کچھا کھڑا اکھڑا سا تھا۔ ''اپنا آج ویسے ہی میٹر شاٹ ہے۔''

''ایں......'' برکت صاحب چونک کر اس کی طرف گھومے۔ ''مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ کرایہ میٹر سے لوں گا...... اور اب کہہ رہے ہو کہ میٹر شاٹ ہے۔''

''ارے بھائی...... ٹیکسی کا نہیں...... میرا میٹر شاٹ ہے۔'' ٹیکسی والا قدرے جھنجھلایا۔

''ارے...... تو تم خود بھی میٹر سے چلتے ہو؟'' برکت صاحب نے آنکھیں پھیلائیں۔ ''کہاں ہے تمہارا میٹر؟''

عین اسی وقت ٹیکسی کے اندر سے کراہنے کی آواز آئی۔ برکت صاحب ٹیکسی والے کو بھول بھال کر ادھر متوجہ ہو گئے۔

''کیا ہوا آغا شاہ صاحب...... کچھ تو بتائیے......'' برکت صاحب نے جھک کر پوچھا۔

''مم...... مم...... مم...... پھنسا...... ہوا...... ہوں۔'' ٹیکسی کے اندر سے یہ جملہ برآمد ہوا۔

"جی......!" برکت صاحب کے منہ سے نکلا اور پھر جو انہوں نے غور کیا تو ایک طویل سانس ان کے گلے سے برآمد ہوئی۔ فی الفور، یہ حقیقت آشکار ہو چکی تھی کہ ان کے گاگے شاہ واقعی ٹیکسی کے اندر بری طرح جکڑے ہوئے تھے۔ وہ اتنے موٹے تھے کہ اگلی اور پچھلی سیٹوں کے درمیان فٹ ہو کر رہ گئے تھے۔ انہیں واقعی "توپ چیز" کہا جا سکتا تھا۔

"آپ......اندر بھی تو بیٹھے تھے۔" برکت صاحب کے منہ سے نکلا۔

"ارے ہاں......" گاگے شاہ چونکے۔ "یہ تو میں بھول ہی گیا۔"

یہ کہہ کر انہوں نے ایک بار پھر باہر نکلنے کے لئے زور آزمائی کی، لیکن پھر نا کام رہے۔ جھنجلا کر وہ بری طرح مچلنے لگے۔ نتیجہ یہ کہ ٹیکسی ہچکولے کھانے لگی۔

ٹیکسی ڈرائیور بوکھلا اٹھا۔ "ارے......ارے......یہ کیا کر رہے ہو صاب......؟ میری......میری ٹیکسی......" وہ چلا اٹھا۔

اتنی دیر میں وہاں محلے کے لوگوں کا مجمع لگ چکا تھا۔ ہر کوئی ٹیکسی میں جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ارے بھئی......تم لوگ ذرا ہوا تو آنے دو۔ میری سانس ویسے ہی رکی جا رہی ہے۔" اندر سے گاگے شاہ نے احتجاج کیا۔

خود ٹیکسی والا بھی اتر کر ان کے قریب آ کھڑا ہوا تھا۔ عجیب صورت حال تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی مشین کے ذریعے گاگے شاہ کو ٹیکسی کے اندر فٹ کر دیا گیا ہو۔

پہلے تو کچھ آدمیوں نے مل کر زور لگایا کہ اگلی سیٹ کو کسی طرح دھکیل کر گاگے شاہ کے نکلنے کی گنجائش بنا لیں، لیکن ان کی توند نے مزید جگہ گھیر کر سب کی کوششوں پر پانی پھیر دیا۔

"میرا خیال ہے کہ......" ٹیکسی ڈرائیور نے دانت پیس کر برکت صاحب کے کان میں سرگوشی کی۔ "ان صاحب کو دس آدمی ایک طرف سے کھینچیں اور دس آدمی ایک طرف سے......"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" برکت صاحب نے اسے گھورا۔

"کچھ نہ کچھ تو باہر آئے گا اس بہانے، ورنہ مجھے تو لگ رہا ہے کہ آج کی رات تو گئی۔ اف......میری بیگم آج میری خوب خبر لے گی۔"

"بیگموں کا کام ہی کیا ہوتا ہے۔" برکت صاحب نے ٹھنڈی سانس بھری۔

عین اسی وقت گھر کے دروازے سے لگی کھڑی گل بانو نے تاک کر ایک چھوٹا سا پتھر مارا، جو سیدھا برکت صاحب کے ماتھے پہ آ کے لگا۔

وہ بھنا اٹھے اور تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے ان کے قریب آ گئے۔

"یہ کیا حرکت ہے بیگم......؟" وہ ابھی تک بھنائے ہوئے تھے۔

"میں پوچھ رہی ہوں کہ......یہ کیا ہڑبونگ مچی ہوئی ہے۔ آپ کے گاگے شاہ صاحب کہاں ہیں؟"

"ٹیکسی کے اندر ہیں......اور کہاں ہوں گے......" جواب ملا۔

''ارے......تو کیا وہ ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے ہی آسیب کو قابو میں کریں گے؟'' گل بانو نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں......'' برکت صاحب نے سنجیدگی سے سر ہلایا۔ ''ابھی تو وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' وہ بدستور حیران تھیں۔

''وہ اس وقت کولیسٹرول کے آسیب کی زد میں ہیں۔''

آخر کار یہ دشوار گزار ترین مرحلہ طے ہو ہی گیا۔ گاگے شاہ ٹیکسی سے ''برآمد'' ہو گئے اور یہ کام جوئے شیر لانے سے زیادہ کٹھن ثابت ہوا۔

ڈرائیور تو تاک میں ہی تھا۔ جیسے ہی گاگے شاہ ٹیکسی سے نکلے، اس نے دم دبائی (ایکسی لیٹر) اور اس طرح بھاگا جیسے اس کی جان کو خطرہ لاحق ہو گیا ہو یا پھر اسے یہ ڈر ہو کہ کہیں گاگے شاہ کی واپسی بھی اس کی ٹیکسی میں نہ ہو جائے۔ اگر برکت صاحب نے اسے پہلے ہی کرایہ نہ دے دیا ہوتا تو شاید وہ کرائے کا تقاضہ بھی نہ کرتا۔

گاگے شاہ نے ٹیکسی سے نکلتے ہی سب سے پہلے آسمان کی طرف دیکھا، گویا رب العزت کا شکر ادا کیا، پھر درجن بھر لمبی لمبی سانسیں بھریں اور مجمع پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔

''اماں ...... یار...... برکت! آج تو تم نے مروا ہی دیا تھا'' وہ پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بولے۔ ''میں بیل گاڑی میں سفر کرتا ہوں۔ ان چھوٹی چھوٹی گاڑیوں میں تو میں پھنس کر رہ جاتا ہوں۔ تم نے اتنی جلد بازی کی کہ میں یہ بات بھول ہی گیا اور ٹیکسی میں جا بیٹھا۔ آئندہ کبھی میرے لئے ٹیکسی مت لانا......اف......ابھی تک......خیر تمہاری لڑکی کہاں ہے؟''

''وہ ......جی......گھر میں ہے۔''

''چلو......گھر میں چلو......'' یہ کہہ کر وہ ایک بار پھر ہانپنے لگے۔ برکت صاحب نے پیش قدمی کی اور ان کے لئے راستہ بنایا گیا۔

محلے والے گاگے شاہ کو گھورے جا رہے تھے، جیسے وہ کوئی عجوبہ ہوں۔ شاید وہ لوگ ان میں وہ گن کھوج رہے تھے، جو قصبے کو آسیب سے نجات دلا سکیں۔

بہر حال......پھر یوں ہوا کہ گاگے شاہ نے گھر کی چوکھٹ پر قدم رکھ دیئے۔

☆......☆......☆

کمرے سے گل بانو کو ہٹا دیا گیا تھا۔ مہ پارہ بدستور بے ہوشی کے عالم میں پلنگ پر دراز تھی۔ گاگے شاہ اور برکت اس کے قریب پہنچے۔

گاگے شاہ نے باز اور شکرے کی طرح مہ پارہ کا جائزہ لیا، الو کی طرح دیدے مٹکائے اور پھر سانپ کی سی چمک ان کی آنکھوں میں عود کر آئی۔

گال مزید پھول کر سرخ ہو گئے، باچھیں کھل اٹھیں اور ایک بے ساختہ قسم کا قہقہہ ان کے حلق سے برآمد ہوا۔ ''ہاہاہا......ہی ہی ہی......ہو ہو ہو......''

اتنا خوف ناک قہقہہ تھا کہ برکت صاحب بوکھلا اٹھے۔ ''کہیں آسیب گاگے شاہ پر تو سوار نہیں ہو گیا؟'' انہوں نے دل میں سوچا، یہ خیال

آتے ہی ان کے مساموں سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ پھوٹ پڑا۔

”اگر ایسا ہوا تو ان کو کون سنبھالے گا؟ یہ تو آسیب کے بغیر ہی اتنے بھاری بھر کم ہیں۔“

”لو بھئی برکت......! اپنی تو عید ہوگئی۔“ اسی وقت گاگے شاہ نے ان کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

”کک......کیا......مم......مطلب......؟“ برکت صاحب نے ڈرے ڈرے انداز میں اپنا کندھا سہلاتے ہوئے پوچھا۔

”ارے بھئی......تمہاری لڑکی پر جن کا قبضہ ہے۔“ گاگے شاہ نے دھماکہ کیا۔

”جج......جج......جن......!!“ برکت صاحب کی آنکھیں ابل پڑیں۔

”ہاں بھئی جن......“ وہ پرسکون انداز میں بولے۔

”کیا کہہ رہے ہیں شاہ صاحب؟“

”ٹھیک کہہ رہا ہوں۔“

”اور آپ کی عید کیسے ہوگئی؟ جن کا نام لے کر تو آپ نے میری جان ہی نکال دی اور خود عید منا رہے ہیں؟“ برکت صاحب نے شکوہ کیا۔

”بھئی......بات دراصل یہ ہے کہ کسی جن سے میرا واسطہ سال میں ایک آدھ بار ہی پڑتا ہے اور اس کی درگت بنا کر مجھے جو مزا آتا ہے وہ عید کی سویّوں سے کم نہیں ہوتا، واہ......خوب مزا آئے گا۔“ انہوں نے منہ اس طرح چلایا، جیسے جن کی ہڈیاں چبا رہے ہوں۔

”اوہ......“ برکت صاحب نے اطمینان کی سانس لی اور ساتھ میں مکھن رسید کر دیا۔ ”آپ کی تو بات ہی کیا ہے شاہ صاحب......“

”لڑکی کو ہوش میں لاؤ۔“ گاگے شاہ نے حکم دیا۔

”میں......یعنی کہ میں......“

”ہاں بھئی......تم......کیوں......کیا ہوا؟“

”بہت بدتمیز ہے۔ مجھے بڈھا بولتا ہے۔“

”اچھا......ہاہاہا......ہوہوہو“ ایک بار پھر گاگے شاہ نے قہقہہ لگایا۔

پھر تھوڑی دیر بعد سنجیدہ ہو کر بولے۔ ”جاؤ......پانی لے آؤ۔ میں اسے ہوش میں لاؤں۔“

”یہ پانی سے ہوش میں نہیں آئے گی۔“ عقب سے گل بانو بول اٹھیں۔ ”ہم لوگ پہلے بھی کوشش کر چکے ہیں۔“ وہ دروازے سے لگی کھڑی تھیں اور کمرے میں ہونے والی گفتگو بھی سن رہی تھیں۔

”اوہ اچھا......“ گاگے شاہ کے منہ سے نکلا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ کم بخت بہت ڈھیٹ ہے اور اس کا واحد حل ہے چپل......“

”چپل......“ برکت صاحب اور گل بانو، دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

”ہاں بھئی......چپل یا جوتا......جو اسے سنگھایا جائے گا۔“

گاگے شاہ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ’’اور اسے سونگھتے ہی جن کے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے اور اگر بالفرض...... اسے چپل سے ہوش نہ آیا تو ایک تھرڈ ڈگری اور بھی ہے۔‘‘

’’وہ کیا......؟‘‘ برکت صاحب نے پوچھا۔

’’پرانا دھرانا، گندا اور میلا موزہ......‘‘ گاگے شاہ نے ڈرامائی انداز میں مسکرا کر کہا۔

’’موزہ......!‘‘ دونوں میاں بیوی کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

’’ہاں...... پہلے چپل پھر جوتا اور اس کے بعد موزہ...... یہ ہے بے ہوشی کا علاج۔‘‘ گاگے شاہ مسکرائے۔

’’اوہ......‘‘ گل بانو آپ ہی آپ بڑبڑائیں۔ ’’اس کا مطلب ہے کہ کم بخت کلثوم نے میری بچی کو چپل سنگھائی تھی۔‘‘

ان کی بات کوئی بھی نہ سن سکا۔ ادھر گاگے شاہ نے فوری طور پر پاؤں سے جوتا اتارا اور آگے بڑھ کر مہ پارہ کی ناک سے ٹکا دیا۔ اس کا رد عمل فوراً ہی ہوا۔ مہ پارہ نے کسمسا کر آنکھیں کھولیں اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

سب نے دیکھا، وہ عجیب عالم جنوں کا پیراہن بنی ہوئی تھی۔ زلف پریشاں نگاہ حیراں اور چہرہ ویراں لئے ہوئے وہ مجسم وحشت کدہ دکھائی دے رہی تھی۔

اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ سب سے پہلے اس نے اپنی سرخ انگارہ آنکھوں سے برکت صاحب کو گھورا، وہ فوراً ہی گاگے شاہ کی آڑ میں ہو گئے۔

’’چھپ کیوں رہا ہے بڈھے!‘‘ مہ پارہ کی مردانہ اور بھاری آواز کمرے میں گونجی۔ ’’کتنے حمائتی ہیں تیرے؟ اب کسے لے کر آ گیا تو؟‘‘

’’زبان سنبھال اوئے...... جن دے پتر......!‘‘ جواباً برکت صاحب کے بجائے گاگے شاہ دہاڑے۔ ’’میں تینوں کھوتی نال بندھ دیاں گا۔ توں ملنگاں نوں جاندا نئیں۔‘‘

’’اردو میں بات کرو۔‘‘ مہ پارہ کے ہونٹ ہلے۔ ’’ابھی میں نے صرف اردو ہی سیکھی ہے۔‘‘

’’میں ابھی تجھے ساری زبانیں سکھاتا ہوں۔‘‘ گاگے شاہ نے دانت پیسے۔ ’’ابے...... تجھے میں تیری اپنی بولی بھی بھلا دوں گا۔ تو سمجھتا کیا ہے سالے!‘‘

’’اچھا......!‘‘ مہ پارہ نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔ پھر وہ ذرا سی ترچھی ہوئی اور گاگے شاہ کے عقب میں چھپے ہوئے برکت صاحب کو مخاطب کر کے بولی۔ ’’بڈھے...... ابے او بڈھے......‘‘

’’دیکھا...... شاہ صاحب!‘‘ برکت صاحب نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔ ’’یہ مجھے پھر چڑا رہا ہے۔‘‘

’’ارے تو تم ہی کیوں چڑ رہے ہو؟‘‘ گاگے شاہ نے جھنجھلا کر کہا۔ پھر وہ مہ پارہ کی طرف گھومے۔ ’’اب تو لڑکی کو چھوڑ دے اور اپنا رستہ ناپ...... ورنہ تیری آنے والی نسلیں بھی گاگے شاہ کو نہیں بھول سکیں گی۔ چل...... جلدی کر۔‘‘

”پورے پندرہ دن......“ مہ پارہ غرائی۔ ”اس سے پہلے لڑکی کی رہائی کی کوئی صورت نہیں......“

”تیرے باپ کا راج ہے کیا؟“ گاگے شاہ نے نتھنے پھلائے۔

”باپ کو بیچ میں مت لاؤ......“ مہ پارہ کی آواز بلند ہوگئی۔ ”میرا باپ تو بہت شریف اور عزت دار آدمی ہے۔“

”تم لوگوں کے یہاں الٹا سسٹم ہے کیا؟“ برکت صاحب سے رہا نہ گیا۔ ”ہمارے یہاں تو باپ سے بیٹے کے گن دیکھے جاتے ہیں۔ یعنی جیسا باپ ویسا بیٹا۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ شکل بھی باپ ہی کے جیسی ہوتی ہے؟“ مہ پارہ نے حیرت سے پوچھا۔

”بس بس......“ گاگے شاہ ہاتھ اٹھا کر بولے۔ ”زیادہ باتیں مت بنا۔ تو کیا سمجھتا ہے......؟ میں بھول جاؤں گا کہ تجھے یہاں سے بھگانا ہے۔ خواہ مخواہ دوستانہ ماحول بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”چاہ تو میں یہی رہا ہوں کہ ماحول دوستانہ ہی رہے۔“ مہ پارہ نے کہا۔

”اور میں تجھ سے ہاتھ ملا کر یہاں سے چلتا بنوں......کیوں......؟“ گاگے شاہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”سیانے کوے......“

”وہ تو......تمہیں جانا ہی پڑے گا۔“ مہ پارہ کے انداز میں لاپروائی تھی۔

”تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ گاگے شاہ نے سر ہلایا اور پھر اسے گہری نظروں سے دیکھ کر بولے۔ ”میں ضرور جاؤں گا، لیکن تیرا مصالحہ بھوننے کے بعد۔ کیا سمجھا......؟“

”تم باورچی بھی ہو......؟“ مہ پارہ کا سوال تھا۔

”نہیں تو......میں تو حلوائی ہوں......“ گاگے شاہ جھونک میں بول گئے......پھر سنبھلے اور کڑک دار آواز میں بولے۔ ”بکواس مت کر......اور بتا......لڑکی کو چھوڑتا ہے کہ نہیں؟“

”ان کو سمجھا لے بڈھے......“ مہ پارہ نے برکت صاحب کو مخاطب کر کے کہا۔ اور وہ ہونقوں کی طرح گاگے شاہ کی طرف دیکھنے لگے۔

گاگے شاہ نے ان کی دلی کیفیت کا فوراً ہی اندازہ کر لیا اور ہاتھ اٹھا کر بولے۔

”کچھ مت کہنا......میں نے سن لیا......اس نے پھر تمہیں بڈھا کہا ہے۔ تمہارے چڑنے سے اب مجھے چڑ ہوگئی ہے۔“

برکت صاحب ہونٹوں میں کچھ بدبدا کر رہ گئے۔ اب گاگے شاہ مہ پارہ کی طرف گھومے۔ ”ہاں بے......اب بول......تو لڑکی کو چھوڑ رہا ہے؟“

”نہیں......“ جواب ملا۔

”نہیں چھوڑے گا......؟“

”بالکل نہیں......پندرہ دن سے پہلے کسی طور نہیں۔“

”دیکھ پھر سوچ لے......“

''سوچ لیا......''

گاگے شاہ بھنا اٹھے۔ ان کے فٹبال جیسے جسم میں تھرتھراہٹ سی پیدا ہوگئی۔ کمرے کا ''معصوم فرش'' احتجاج کرتا ہوا دکھائی دینے لگا۔

''اچھا...... تو پھر آجا سامنے .... تیری ٹھکائی کروں۔ قسم سے روتا ہوا نہ بھگایا تو نام گاگے شاہ نہیں...... ہاں......''

یہ کہہ کر گاگے شاہ آگے بڑھے اور جھک کر مہ پارہ کے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی زور سے پکڑی اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگے۔ ان کی گرفت مضبوط تھی۔ مہ پارہ مچلی، لیکن ہاتھ نہ چھڑا سکی۔

ادھر دروازے میں کھڑی گل بانو اور ادھر باکت صاحب سانس روکے ہوئے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ پھر گاگے شاہ نے مہ پارہ کے ہاتھ کو ایک زوردار جھٹکا دیا۔

اور پھر، جو کچھ ہوا اسے دیکھ کر برکت اور بیگم برکت کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔

مہ پارہ زور سے چیخی تھی، پھر یکا یک ایک اور وجود اس کے اندر سے نکلا اور ان کے سامنے آکھڑا ہوا۔

یہ ایک ساڑھے چھ فٹ لمبا تڑنگا جن تھا۔ رنگ کسی حد تک سیاہی مائل تھا، جسم انسانوں سے بس اتنا مختلف تھا کہ اس کے سر پر سینگ تھے۔ کافی ہینڈسم تھا۔ یقیناً اگر سینگ نہ ہوتے تو اسے بالی وڈ میں بطور ہیرو چانس مل سکتا تھا۔

مہ پارہ گویا ہوش میں آگئی۔ جن کے باہر نکلتے ہی وہ اپنی اصلی جون میں آ چکی تھی اور اب وہ بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر جن کو دیکھ رہی تھی۔

خود جن ان کے سامنے کھڑا ہوا پلکیں جھپکا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت کے دیئے جل رہے تھے۔ اس کی حالت اس وقت اس چور کی مانند تھی، جو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا جائے۔

''اب بول بیٹا......؟'' کمرے میں گاگے شاہ کی شوخ آواز گونجی۔

''کس طرح تیری خاطر تواضع کروں...... بول......؟''

برکت صاحب نے بھی زندگی میں کبھی کوئی جن نہیں دیکھا تھا، اس لئے وہ بھی اسے دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ دفعتاً انہیں ایک خیال آیا۔ فوراً ہی انہوں نے مہ پارہ کی طرف کڑی نظروں سے دیکھا، جو خود بھی جن کو گھور رہی تھی۔

جن کے جسم پر صرف انڈرویئر تھا۔ برکت صاحب نے فوراً ہی مہ پارہ کو مخاطب کیا۔ ''چلو مہ پارہ...... تم اپنی امی کے پاس جاؤ...... شاباش......''

مہ پارہ چونکی، پھر فوراً ہی دروازے کی طرف لپکی۔ جیسے ہی وہ گاگے شاہ کے قریب سے گزری، انہوں نے شفقت سے پوچھا۔ ''بیٹی......! تمہیں ڈر تو نہیں لگ رہا؟''

''ڈرے گی کیوں نہیں آپ سے شاہ صاحب......'' مہ پارہ کے بجائے برکت صاحب بول پڑے۔ ''یہ تو بچپن سے ہی آپ سے ڈرتی چلی آرہی ہے۔ آپ کو یاد ہے نا...... جب یہ چھوٹی سی تھی اور آپ آتے تھے تو یہ چھپ جایا کرتی تھی۔ بہت ڈرتی ہے آپ سے یہ بے چاری......!''

''افوہ......'' گاگے شاہ جھلا گئے۔ ''میں اپنے نہیں بلکہ جن سے ڈر لگنے کی بات کر رہا ہوں۔''

''اوہ......اچھا......''

''جج......جی نہیں۔ مجھے ڈر نہیں لگ رہا۔'' مہ پارہ نے جواب دیا...... پھر ایک نظر جن پر ڈالی اور جھپاک سے دروازے کی آڑ میں چلی گئی۔ جہاں گل بانو اس کی بلائیں لینے کے لئے بے تاب تھیں۔

''ہائے ہائے......میری بچی......'' وہ مہ پارہ کو گلے لگا کر گلوگیر آواز میں بولیں۔ ''کم بخت......مسٹنڈا......نگوڑ مارا کہیں کا......میری پھول جیسی بچی پر سوار تھا بد بخت! ارے مہ پارہ! تم اس کا وزن کیسے سنبھالے ہوئے تھیں؟ چار پانچ من سے تو کیا کم ہوگا۔''

''پپ...... پتا نہیں امی جان......'' مہ پارہ گڑبڑا کر بولی۔

''اے لو......'' انہوں نے ہاتھ نچائے۔ ''ڈھائی سیر اناج کا دشمن تمہاری گردن سے لٹکا ہوا تھا......اور تمہیں خبر ہی نہیں۔ واہ...... یہ بھی کوئی بات ہوئی۔''

اب کے مہ پارہ منہ سے کچھ نہیں بولی، صرف گردن ہلا کر رہ گئی۔ گل بانو اسے دیکھتی رہیں، پھر بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا۔ ''بہت بھولی ہے میری بچی......''

☆......☆......☆

کرشن چندر کے بہترین افسانے

کرشن چندر کے بہترین افسانے، مشہور افسانہ نگار کرشن چندر کے افسانوں پر مبنی ہے، اس کتاب میں اُن کے افسانے، برے پھنسے، زندہ نوادر، نیوٹرل زون، ٹمپریچر، پرنس فیروز، تائی ایسری، جامن کا پیڑ، بھیا جی، ساجھے کا مردہ، ملکہ کی آمد، داتن والے، جولی کیکساں، شنو، خوشی، بینگ بینگ فنگ، آؤ مرجائیں، ٹیکسی ڈرائیور، کچرا بابا، تنہائی کا پھول، سپاہی۔ کرشن چندر نے بمبئی فلم انڈسٹری کے لئے بھی کام کیا جہاں انہیں فلم نگری کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور اپنے انہیں مشاہدات کو بنیاد بنا کر انہوں نے اپنا مشہور ناول ''چاند کا گھاؤ'' لکھا جو کہ بمبئی فلم انڈسٹری کی ہی کہانی ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا کچھ حصہ کشمیر میں بھی گزارا اسلئے ان کے کچھ ناولوں کا پس منظر کشمیر کے زندگی پر مشتمل ہے۔ **کرشن چند کے بہترین افسانے** کتاب گھر کے **افسانے** سیکشن میں پڑھی جاسکتی ہے۔

’’سٹی کیوں گم ہوگئی......‘‘ برکت صاحب نے جن کو چھیڑا۔ ’’اب بولو نا مجھے بڈھا...... بولو......‘‘

’’بڈھے کو بڈھا نہیں بولیں گے، تو اور کیا بولیں گے؟ ہیں...... بڈھے......!‘‘ جن نے اب خود کو کسی حد تک سنبھال لیا تھا، وہ قدرے پر سکون لہجے میں بولا۔ وہ اب تک ایک ہی جگہ ساکت و جامد کھڑا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے قدم فرش میں گڑ گئے ہوں۔

’’کس بل نہیں گئے ابھی تک......‘‘ برکت صاحب نے اسے گھورا۔

’’میں رسی نہیں ہوں۔‘‘ جواب ملا۔

گاگے شاہ ابھی تک خاموش تھے اور بڑے غور سے جن کو دیکھ رہے تھے۔

’’تم لوگوں کے یہاں کپڑوں کا رواج نہیں ہے کیا؟‘‘ برکت صاحب نے جن سے سوال کیا۔

’’بالکل ہے۔‘‘ جن نے فوراً جواب دیا۔

’’تو پھر...... تم کیوں ایسے ننگ دھڑنگ پھر رہے ہو؟ شرم نہیں آتی تمہیں؟‘‘ برکت صاحب نے منہ بنایا۔

’’بہت مہنگا انڈر ویئر ہے یہ۔‘‘ جن نے فخریہ انداز میں انڈر ویئر کی لاسٹک کھینچی۔ ’’تم لوگوں کو دیکھ کر مجھے بھی نمود و نمائش اور دکھاوے کی بیماری لگ گئی ہے۔‘‘

’’ارے تو کیا انڈر ویئر ہی دکھانا ضروری ہے؟ مہنگے والے سوٹ پہن لو...... وہ دکھاتے پھرو۔‘‘ برکت صاحب تیز لہجے میں بولے۔

’’مذاق کر رہا تھا۔ مجھے گرمی بہت لگتی ہے۔‘‘ جن نے جواب دیا۔

’’میں ابھی نکالتا ہوں تیری گرمی...... صبر کر......‘‘ گاگے شاہ کی رعب دار آواز گونجی۔

وہ دونوں اپنی باتوں میں مگن تھے۔ ان کی آواز سن کر چونک اٹھے اور ان کی طرف دیکھا۔ گاگے شاہ اس وقت کافی جاہ و جلال میں تھے اور اکبر بادشاہ کی زندہ تصویر نظر آ رہے تھے، بشرطیکہ وہ بھی اتنا ہی موٹا ہو۔ پھر وہ جن سے مخاطب ہوئے۔

’’مجھے ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ تو نے اس قصبے کی اور بھی کئی لڑکیوں پر چڑھائی کی ہے؟‘‘

’’چڑھائی......؟‘‘ جن نے حیرت سے دہرایا۔

’’آسان اردو میں بولوں......؟ میرا مطلب تھا کہ اور بھی کئی لڑکیوں پر تو آ چکا ہے۔‘‘

’’یہ ابھی ابھی تمہیں کس نے بتایا؟‘‘ جن کے لہجے میں حیرت تھی۔

’’اس بات کو چھوڑ......‘‘ وہ لاپروائی سے بولے۔ ’’میرے گرگے تجھے کہاں دکھائی دیں گے۔ ابھی تو بچہ ہے۔ کتنی عمر ہے تیری؟‘‘

’’ایک سو اٹھائیس سال۔‘‘ جن نے بتایا۔

’’بس......‘‘ گاگے شاہ بے اعتنائی سے بولے۔ ’’ابھی تو تیرے دودھ کے دانت ہی ٹوٹے ہوں گے۔ میں تمہارے سے بھی بڑوں سے بھڑا ہوں، ان کی عمریں پندرہ سو سال سے کم نہیں تھیں۔ تو تو پھر بچہ ہے۔‘‘

''اوہ......'' جن کے منہ سے نکلا۔

''یہ بات بالکل سولہ آنے ہے شاہ صاحب......'' برکت صاحب نے حسب عادت پھر مداخلت کی۔ ''علاقے کے لوگ بہت پریشان ہیں۔ یہ آئے دن کسی نہ کسی لڑکی پر سوار ہو جاتا ہے۔ اس نے علاقے کا سکھ چین لوٹ لیا ہے۔''

''اب ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ کیوں بے......'' آخری الفاظ گاگے شاہ نے جن سے کہے تھے۔

''حالات پر منحصر ہے۔'' جن نے لاپروائی سے کہا۔

یہ سن کر گاگے شاہ آگ بگولہ ہو گئے۔ سانسیں تیز ہو گئیں اور بلڈ پریشر بڑھ گیا۔ انہوں نے ادھر ادھر دیکھا۔ قریب ہی ایک لوہے کی کرسی رکھی ہوئی تھی۔ گاگے شاہ نے ایک جھٹکے سے کرسی سیدھی کی اور دھم سے اس پر بیٹھ گئے۔

کرسی نے شدت سے احتجاج کیا اور گاگے شاہ اس میں فٹ ہو گئے۔ ''برکت............!'' وہ زور سے چلائے۔ ''ادھر آؤ۔''

''جی......'' برکت صاحب فوراً آگے بڑھے۔

''غور سے سنو برکت......!'' وہ ان سے مخاطب ہوئے۔ ''اب اس بدتمیز سے کوئی بات نہیں ہوگی۔ میں اب اس کے بڑوں کو یہاں کھینچ کر لاؤں گا۔ اب اس کا جو بھی حشر ہوگا۔ وہ اس کے سردار کے سامنے ہوگا۔ بس...... میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ جب اس کے کرتوت سردار کے سامنے کھلیں گے تو اس کی عقل ٹھکانے آ جائے گی۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوئے اور جن کو بہ غور دیکھنے لگے۔

''کیا ہوا......؟ ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟'' جن سے رہا نہ گیا۔ ''میرے سر پر سینگ تو ویسے ہی نکلے ہوئے ہیں اور کس بات پر غور کر رہے ہو؟''

''تیری شکل پر غور کر رہا ہوں۔'' گاگے شاہ نے اس کا جملہ یکسر نظر انداز کر دیا۔

''کیوں......؟ میری شکل کو کیا ہوا......؟''

''مجھے تو جانا پہچانا سا لگ رہا ہے...... یہ بتا...... تو لال پری کا بھائی تو نہیں ہے؟''

''لال پری............!'' جن چونکا۔ ''تم اسے کیسے جانتے ہو؟''

''یہ بات چھوڑ......'' گاگے شاہ لاپروائی سے بولے۔ ''ہاں تو بتا...... تیری شکل اس سے بہت ملتی ہے۔ وہ تیری بہن ہے کیا......؟''

''تمہارا دماغ خراب ہے۔'' جن بھنا گیا۔ ''بہن تو کیا...... وہ میرے قبیلے کی ہے ہی نہیں...... اس کا تعلق دوسرے قبیلے سے ہے۔''

''اچھا...... اچھا...... ہو گی......'' گاگے شاہ نے سر ہلایا۔ پھر وہ مستعد کھڑے ہوئے برکت صاحب کی طرف مڑے۔

''سب سے پہلے تو یہ کام کرو کہ درجن بھر ظہور راجا جانی قوام کے پان منگواؤ ذرا...... اور پھر...... کسی کو بھیج کر گاؤں سے چنگا اور منگا کو بلوا لو...... ابھی اور اسی وقت......''

''یہ چنگا اور منگا کون ہیں؟'' برکت صاحب نے پوچھا۔

''میرے مرید خاص ہیں...... جب اس خبیث کے بڑوں کو حاضر کیا جائے گا تو ان کا یہاں موجود ہونا ضروری ہے۔''

”جی......اچھا......“

”اور ہاں......گھر میں چھ آٹھ مرغیاں ہیں؟“

”جی......مرغیاں......“

”ہاں......وہ بھی ضروری ہیں......“

”چلے کے لئے......؟“

”نہیں......انہیں تیز مصالحے میں فرائی کروانا۔ تمہارے گھر میں میں بھی مہمان ہوں اور میرے مرید خاص آئیں گے تو ان کی بھی تواضع کرنی ہے۔ معلوم نہیں رات کتنی دیر لگ جائے، تو کیا وہ بھوکے رہیں گے۔“

”اوہ......اچھا......میں سمجھا تھا کہ آپ کالی مرغیاں منگوائیں گے۔“

”اوہ......نہیں بھئی......تم نے مجھے روایتی پیر سمجھا ہوا ہے۔ بھلا......میں کالی مرغی منگاؤں گا۔“

”بات تو ایک ہی ہے۔“ برکت صاحب بڑبڑائے۔ پھر ذرا بلند آواز سے بولے۔ ”مرغیوں کا بندوبست تو اسی وقت ہو جائے گا۔ مہ پارہ نے بہت ساری مرغیاں پال رکھی ہیں۔ ورنہ اتنی رات گئے مرغیاں کہاں ملیں گی۔“

”ہماری قسمت......“ گاگے شاہ مسکرائے۔ ”اللہ مہ پارہ کو خوش رکھے۔ بس وہی کافی ہوں گی۔ اور ہاں......مصالحہ ذرا تیز رکھوانا......“

برکت صاحب سر ہلا کر چلے گئے......گاگے شاہ نے بڑے اسٹائل سے اپنی داہنی ٹانگ سیدھی کی اور جن سے مخاطب ہوئے۔ ”ادھر آ......“

”میں نہیں آسکتا۔ تم نے نہ جانے کیا کیا ہے میرے ساتھ۔ میرا ہلنا بھی محال ہے۔“ جن نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

”اب میں کہہ رہا ہوں نا......اب تو چل سکتا ہے۔“

یہ سن کر جن نے اپنا پاؤں آگے بڑھایا۔ واقعی وہ اب حرکت کر سکتا تھا۔

”دیکھ......اگر اب بھاگنے کی کوشش کرے گا تو دوبارہ قلفی بنا دوں گا۔ سمجھا......“

جن آگے بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ اس کے تیور بگڑ گئے اور وہ صاف گوئی سے بولا۔ ”میں بھاگنے والوں میں سے نہیں ہوں اور یہ بات بھی مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تم سردار کے متعلق صرف گیدڑ بھبکی دے رہے ہو۔ تم انہیں بلا نہیں سکتے۔“

”ابے......تو ابھی خود دیکھ لے گا، جب تیرے پاپا اور ماما بھی یہاں کھڑے ہوں گے۔ کیا سمجھتا ہے مجھے......بڑ بولا......؟“ گاگے شاہ نے آنکھیں نکالیں۔

”تم خود ہی کہہ رہے ہو تو پھر مجھے کیا اعتراض......؟“ جن نے کندھے اچکائے۔

”بدتمیز......ادھر آ......“

''نہیں آؤں گا......'' جن نے وہیں رک کر نفی میں گردن ہلائی۔

''ابے آ......''

''نہیں......ہرگز نہیں۔''

''ٹھہر جا......میں ابھی تیری......'' اتنا کہہ کر گاگے شاہ نے خود ہی کرسی سے اٹھنے کی کوشش کی، مگر یہ کیا......؟

وہ اب کی بار کرسی میں پھنس گئے تھے۔

''لو بھئی......'' وہ آپ ہی آپ بڑبڑائے۔ ''میں پھر پھنس گیا۔''

☆......☆......☆

گل بانو کو کھانے کا آرڈر دے کر برکت صاحب دروازے کی طرف بڑھے۔

دروازہ کھولتے ہی انہیں ایک جم غفیر دکھائی دیا۔ مکان کے آس پاس ابھی تک محلے والے جمع تھے۔ شاید وہ سب آسیب کے ''رزلٹ'' کے لئے بے چین تھے۔

''کیا ہوا برکت صاحب......؟''

''آسیب اترا کہ نہیں......؟''

''اب وہ کہاں ہے؟''

''کیا مر گیا......؟''

ان پر ان گنت سوالوں کی بوچھاڑ ہوگئی۔ انہوں نے مختصراً حالات سے آگاہ کیا۔ جن کے متعلق سن کر سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

''ہم بھی دیکھیں گے برکت صاحب......اس جن کو ہم بھی دیکھیں گے۔'' لوگوں نے ضد کی۔

''ابھی نہیں بھئی......ذرا صبر کرو......ابھی تو وہ بہت سرکش اور خونخوار ہو رہا ہے۔''

''اس پر ٹکٹ لگا دیں برکت صاحب......خوب کمائی ہوگی۔'' رشید رکشے والے نے آگے بڑھ کر جوش سے کہا۔

برکت صاحب نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔ وہ سٹ پٹا گیا۔ لیکن پھر برکت صاحب نے اس کی بات نظر انداز کر دی اور بولے۔

''بھئی رشید ایک کام آپڑا ہے۔''

''حکم کریں جناب......پورا محلہ حاضر ہے۔''

''گاگے شاہ کے گاؤں سے چنگا اور منگا نامی دو آدمیوں کو لانا ہے۔ رات تو کافی ہوگئی ہے اور......''

''ہونے دیں جی رات......وہ تو روز ہی ہوتی ہے اور کوئی حکم......؟''

''اور ہاں......ایک درجن ظہور راجانی قوام کے پان بھی لانے ہیں۔''

”یہ بھی ہو جائے گا جی......وہ اپنا ملو استاد ہے نا......!وہ رات 2 بجے تک دکان کھولتا ہے......واپسی میں اسی سے پان پکڑ لوں گا۔ اور کچھ......؟“

☆......☆......☆

جب برکت صاحب باہر کے کاموں سے نمٹنے کے بعد گھر میں داخل ہوئے تو مہ پارہ کی رونی صورت نے ان کا استقبال کیا۔ ”ابو جی...... میری مرغیاں......!“

”کوئی بات نہیں بیٹی......“ انہوں نے فوراً تسلی دی۔ ”بعض اوقات مہمانوں کے لئے ایسی قربانی دینی ہی پڑتی ہے۔“ اس سے پہلے کہ برکت صاحب کچھ بولتے، اندرونی کمرے سے با آواز بلند کسی کے قہقہے لگانے کی آواز آئی۔

برکت صاحب کا دھیان بٹ گیا اور وہ مہ پارہ کو الجھن میں چھوڑ کر کمرے کی طرف لپکے۔

”یہاں عجیب مضحکہ خیز منظر دیکھنے کو ملا۔ گاگے شاہ کرسی میں پھنسے ہوئے تھے اور اٹھنے کے لئے بری طرح جھٹکے مار رہے تھے لیکن ہر جھٹکے میں انہیں ناکامی کا سامنا ہو رہا تھا۔

ادھر جن کے منہ سے قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ گاگے شاہ کی بے بسی کا دل کھول کر مذاق اڑا رہا تھا۔ ایک مرتبہ تو وہ ہنستے ہنستے دہرا ہو گیا۔

برکت صاحب جلدی سے آگے بڑھے تاکہ گاگے شاہ کی مدد کر سکیں۔ انہوں نے دیکھا، گاگے شاہ کے چہرے سے خفگی، شرمندگی، غصہ اور بے بسی، سب ہی کچھ عیاں تھا۔

”ٹھہر جا بدبخت......میں تجھے ابھی......“ گاگے شاہ جن کے دہرا ہونے پر مچل اٹھے۔

”کیا ہوا شاہ صاحب......؟“ برکت صاحب نے بدحواسی سے پوچھا۔

”وہی پرانی کہانی......“ انہوں نے منہ بنایا۔ ”میں اب کی بار کرسی میں پھنس گیا ہوں۔“

”اب......اب کیا......ہو گا؟“ برکت صاحب کھوئے کھوئے انداز میں بولے۔

”انہیں نکڑوں میں نکالنا چاہو تو میں مدد کروں؟“ جن نے سنجیدہ ہو کر برکت صاحب سے پوچھا۔

”ہاں......ہاں......“ گاگے شاہ نے ہاتھ نچایا۔ ”تیرا بس چلے تو تو واقعی میری بوٹیاں کر دے، تاکہ تیری جان چھوٹ سکے۔ مگر میں تیری شامت بلائے بغیر نہیں رہوں گا۔“ وہ ایک بار پھر زور آزمائی کرنے لگے۔

”ٹھہرئیے......“ برکت صاحب بولے۔ ”میں کوشش کرتا ہوں۔“ انہوں نے گاگے شاہ کو کھینچنے کی کوشش کی لیکن پہاڑ کے آگے چیونٹی کی کیا وقعت......؟ وہ خود ہی دو قدم آگے سرک گئے اور گاگے شاہ پر گرتے گرتے بچے۔

پھر ایک بار اور ہمت مجتمع کر کے زور لگایا لیکن بے سود۔ گاگے شاہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ البتہ خود برکت صاحب پسینے میں شرابور ہو گئے تھے۔

”محلے والوں کو بلالوں......؟“ بالآخر برکت صاحب نے تھکے تھکے لہجے میں گاگے شاہ سے پوچھا۔

”وہ بھی ناکافی ہوں گے۔“ جن نے ٹکڑا لگایا۔

”تم خاموش نہیں رہ سکتے۔“ برکت صاحب اس پر الٹ پڑے۔ جن نے لاپروائی سے کندھے اچکائے اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

عین اسی وقت ایک چھوٹا سا پتھر برکت صاحب کے ماتھے پر آ کر لگا۔ وہ بھنا اٹھے۔ ”ایک تو بیگم نے ....“ وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بڑبڑائے۔ یہاں گل بانو ان کی منتظر تھیں۔

”تم نے پھر پتھر دے مارا؟“ برکت صاحب نے خوں خوار نظروں سے انہیں دیکھا۔

”اور کیا کرتی......؟ آواز تو دینے سے رہی......“ گل بانو لاپروائی سے بولیں۔ پھر کہا۔ ”میں......میں نے اس لئے آپ کو بلایا ہے کہ کوئی دروازے پر آیا ہے اور شاہ صاحب کو بلا رہا ہے۔“

”اوہ......“ برکت صاحب چونکے۔ ”اس کا مطلب ہے کہ ان کے مرید خاص آ گئے......میں دیکھتا ہوں۔“

گاگے شاہ کے دونوں مرید اسم بامسمّٰی ثابت ہوئے۔ منگا، اپنے نام ہی کی طرح بھیک منگا ثابت ہوا۔ اس نے دروازہ کھلتے ہی صدا لگائی۔

”دے دے مولا کے نام پر......بھلا ہو گا۔“ اور آخر کار وہ برکت صاحب کی جیب سے 500 روپے نکلوا کر ہی گھر کے اندر داخل ہوا۔

چنگا واقعہ بھلا چنگا تھا۔ گول مٹول، سرخ و سفید اور ہٹا کٹا......اس کی بڑی بڑی مونچھیں اور پھٹی پھٹی سی آنکھیں اسے کافی چوکنا اور چاق و چوبند ثابت کر رہی تھیں۔

پھر وہ دونوں مرید خاص، برکت صاحب کے ہمراہ کمرے میں پہنچے اور گاگے شاہ پر نظر پڑتے ہی چونک اٹھے۔ چنگا نے فوراً ہی خوں خوار نظروں سے جن کی طرف دیکھا، ادھر جن کے بھی تیور بدلے۔

برکت صاحب نے دونوں کے ارادے بھانپ لئے اس لئے فوراً ہی بولے۔

”ارے نہیں بھئی چنگا صاحب......! جن نے کچھ نہیں کیا، گاگے شاہ خود ہی کرسی میں پھنس گئے ہیں۔“

”اوہ......“ دونوں کے منہ سے نکلا۔

”ہاں بھئی......چنگا، منگا......اب نکالو مجھے کرسی سے......“ گاگے شاہ نے کراہتے ہوئے کہا۔

”آپ نے پھر بدپرہیزی کر دی شاہ صاحب......“ چنگا نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

”بس بھئی......ہو گئی......اب کیا کریں؟“ گاگے شاہ نے مسمسی صورت بنا کر کہا۔

”کون سی بدپرہیزی؟“ برکت صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

”دراصل ڈاکٹر نے ان کو کرسی اور ٹیکسی میں بیٹھنے سے سختی سے منع کیا ہوا ہے۔“ چنگا نے بتایا۔

جن پر ایک بار پھر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ ”اوئے......“ چنگا نے آنکھیں نکالیں۔ ”ہمارے پیر صاحب کا مذاق اڑاتا ہے......“

منگا کے تیور بھی اچھے نہیں تھے۔

"میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ جنوں کو قابو کرنے والا ایک کرسی سے نہیں نکل سکتا...... واہ......" جن نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر کہا۔

"ہمارے ساتھ یہی تو مجبوری ہوتی ہے۔" گاگے شاہ بولے۔ "ہم لوگ اپنے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔"

"فاتحہ تو پڑھ سکتے ہو؟ وہی پڑھ ڈالو۔" جن نے مشورہ دیا۔

اب گاگے شاہ کی طرف ان کے مرید بڑھے اور پھر تو کمرے میں گویا رسہ کشی کا سماں پیدا ہو گیا۔ خود برکت صاحب بھی پیچھے نہیں رہے تھے۔

لیکن گاگے شاہ ٹس سے مس نہ ہو سکے۔ آخر کار تینوں ہی ناکام رہ گئے۔ جن بڑی دلچسپی سے ان کی کارروائی دیکھ رہا تھا۔

"اسے دیکھو......" گاگے شاہ نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ "کھڑا ہوا تماشہ دیکھ رہا ہے۔ یہ نہیں کہ خود بھی مدد کر دے۔ ایک ہاتھ ہی لگا دے۔"

"کیسے......؟" جن نے چونک کر پوچھا۔

"ابے ویسا ہاتھ نہیں...... ایسا...... ایسا۔" گاگے شاہ نے جھنجھلا کر اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔

گاگے شاہ نے جن کو پیار سے پچکارا۔ "ابے آ جا یار...... تھوڑی سی جان تو بھی دکھا دے۔ جن نہیں ہے میرا پیارا سا......؟ ہیں......؟" انہوں نے باقاعدہ اسے پچکارا۔

"تم انسانوں میں یہی خرابی ہے۔ تم لوگ وقت پڑنے پر گدھے کو بھی باپ بنا لیتے ہو۔ تھوڑی دیر پہلے تک تو مجھے گالیاں دے رہے تھے اور اب......" جن نے منہ بنایا۔

"وہ سب تو اپنی جگہ پر ہے......" گاگے شاہ نے پیار سے سمجھایا۔ "مگر یہ دوسرا معاملہ ہے...... رہی بات گدھے کی تو وہ تم ہرگز نہیں ہو سکتے...... کیونکہ تمہارے سر پر سینگ موجود ہیں۔"

جن نے پہلے سے بھی زیادہ برا منہ بنایا۔

"چھوڑیئے شاہ صاحب! میں محلے والوں کو بلا کر لے آتا ہوں۔ اخلاقی قدریں تو انسانوں میں ہوتی ہیں، کسی اور میں یہ گن کہاں......" برکت صاحب نے ہانپتے ہوئے کہا۔

نہ جانے اس جملے میں کیا جادو تھا......؟ جن فوراً ہی آگے بڑھا۔ اس نے تینوں کو گاگے شاہ کے پاس سے ہٹایا اور ان کے دونوں ہاتھ تھام کر ایک زوردار جھٹکا مارا۔

دوسرا لمحہ حیران کن تھا۔ گاگے شاہ کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ انہیں کرسی سے نجات مل چکی تھی۔

☆......☆......☆

چونکہ جنگ دو مخلوقوں کے درمیان تھی۔ اس لئے کام نکل جانے کے بعد گاگے شاہ نے اپنی آنکھیں دوبارہ ماتھے پر رکھ لیں۔ نہ جن اپنی ہٹ دھرمی چھوڑ رہا تھا اور نہ گاگے شاہ اسے چھوڑنے کو تیار تھے بلکہ اب تو جن کو رسی کے ذریعے پلنگ سے باندھ دیا گیا تھا۔

جن کے احتجاج کے باوجود یہ کام ہوا تھا۔ اس کی ایک وجہ اور بھی تھی اور وہ یہ کہ کھانے کا وقفہ ہو رہا تھا۔ گاگے شاہ اور ان کے مریدوں کو شدید بھوک لگ آئی تھی۔

آخر دستر خوان لگایا گیا......اور پیر و مرید بری طرح کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ خوب خوب بوٹیاں بھنبھوڑی گئیں۔ جن حیرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

دفعتاً گاگے شاہ کو جن کا خیال آ گیا۔ انہوں نے اخلاقاً اس سے کھانے کا پوچھا۔ ''تو بھی کھائے گا بھئی...... ہیں......؟''

''تم لوگ ہی کھاؤ......'' جن کا جواب تھا۔ ''نہ جانے تم لوگ کس کس مخلوق کے دشمن ہو......بے چاری......معصوم مرغیاں......''

اس بات پر سب نے ہاتھ روک کر جن کو آنکھیں دکھائیں۔ خدا خدا کر کے ان لوگوں کا پیٹ بھرا۔

گاگے شاہ نے پانی پینے کے بعد ایک طویل و عریض ڈکار لی اور برکت صاحب کے منگائے ہوئے پانوں کی پڑیا کھولی۔ ایک پان منہ میں ڈالا اور اعلان کرنے والے انداز میں بولے۔

''برکت میاں......! اب جنگ کے لئے میدان چاہئے۔ کافی کھلی جگہ ہونی چاہئے۔ نہ جانے اس کے قبیلے والے کس قسم کے ہوں اور کتنی تعداد میں حاضر ہوں۔''

''ہمارا صحن کافی بڑا ہے شاہ صاحب......'' برکت صاحب نے بتایا۔

''پھر ٹھیک ہے۔ وہیں انتظام کرتے ہیں۔'' گاگے شاہ سر ہلا کر بولے۔ پھر جن کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''اس مردود کو بھی وہیں لے کر چلنا ہے۔''

''یہ کیسے جائے گا؟'' برکت صاحب تشویش سے بولے۔

''یہ کام چنگا اور منگا کریں گے............'' گاگے شاہ مسکرائے۔

''تو پھر......میں صحن کی صفائی وغیرہ کروا لوں؟'' برکت صاحب نے پوچھا۔

''ہاں.........کروالو..........جب تک میں اس کا انٹرویو لے لوں۔''

یہ کہہ کر گاگے شاہ جن کی طرف مڑے۔ برکت صاحب اسی وقت کمرے سے چلے گئے۔

''ہاں بھئی......نام کیا ہے تیرا......؟''

''کیوں......؟ اخبار میں اشتہار لگواؤ گے؟'' جن نے پوچھا۔

''سیدھی طرح نام بتا......''

طاہر جاوید مغل کے قلم سے جرم وسزا پر مبنی کتاب
لاش، ہیجڑا اور حسینہ
قیمت:150

“بوقاف......”

“باپ کا نام؟”

“کس کے باپ کا......؟”

“ابے اپنے باپ کا بتا......”

“روناف......”

“ہوں......” گاگے شاہ نے ہنکارا ابھرا۔ “کون سا قبیلہ ہے تیرا؟”

“طبلاش......”

“کیا تم لوگ طبلے بناتے ہو......؟” منگے نے جن سے پوچھا۔

“یہ کیا ہوتا ہے............؟” جن کے انداز میں حیرت تھی۔

“تم چپ رہو............” گاگے شاہ نے منگا کو ڈانٹا۔ “دیکھ رہے ہو میں ابھی حساب کتاب لگا رہا ہوں۔”

“تم جھوٹ کیوں بول رہے ہو؟” جن نے کہا۔ “تمہارے ہاتھ میں تو کوئی کتاب نہیں ہے۔”

“زیادہ مسخری مت کر......” گاگے شاہ نے آنکھیں نکالیں۔

“اچھا......نہیں کرتا۔” جن نے سعادت مندی کا مظاہرہ کیا۔

“سارے کس بل نکل جائیں گے۔ فکر مت کر......اپنے سردار کو آ لینے دے۔”

جن کی ہنسی چھوٹ گئی۔ “کیوں مذاق کر رہے ہو؟”

“تو ابھی مجھے جانتا نہیں ہے۔ میں گاگے شاہ حلوائی ہوں۔ سمجھا کہ نہیں......!”

“سمجھ کر کروں گا کیا......؟”

“اچھا چھوڑ......یہ بتا......تو نے جو کچھ بتایا ہے وہ غلط تو نہیں ہے؟ جھوٹ تو نہیں بولا تو نے......؟”

“انسان بولتے ہیں جھوٹ............اور میں جن ہوں۔” اس نے صاف گوئی سے کہا۔

ذرا سی دیر کے لئے گاگے شاہ بغلیں جھانکنے لگے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ برکت صاحب اسی وقت کمرے میں داخل ہوئے اور گاگے شاہ سے مخاطب ہو کر بولے۔

“شاہ صاحب......! صحن کی صفائی وغیرہ کا کام مکمل ہو چکا ہے۔”

“اچھا......” انہوں نے جواب دیا۔ پھر وہ چنگا اور منگا کی طرف گھومے۔ “چلو بھئی......اسے صحن میں پہنچانا ہے۔ یہ لو پانوں کی پڑیا......پان اس کے منہ میں ٹھونسو......جب یہ ٹن ہو جائے گا تو اٹھا کر صحن میں لے چلنا۔”

یہ کہہ کر گاگے شاہ نے پان کی پڑیا اچھالی، جسے چنگا نے کیچ کیا۔

''واہ...... کیا ترکیب ہے......!'' برکت صاحب کے منہ سے نکلا۔

ادھر چنگا اور منگا بڑے نپے تلے انداز میں جن کی طرف بڑھے۔ چنگا نے احتیاطاً جن کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ پھر منگا نے پان کی پڑیا کھولی اور بیک وقت چار پان نکال کر جن کے منہ کی طرف بڑھائی۔ جن نے فوراً ہی منہ پھیر لیا۔

''اب کھا لے......'' منگا بولا۔ ''تو خوش قسمت ہے جو منگا کے ہاتھ سے کچھ کھا رہا ہے، ورنہ منگا نے ہمیشہ دوسروں سے کھایا ہی ہے، کھلایا کسی کو نہیں۔''

''اپنا ریکارڈ خراب مت کرو......'' جن نے جواب دیا۔ گردن بدستور دوسری طرف تھی۔

''شاہ صاحب کا حکم ہے...... تجھے پان تو کھانے پڑیں گے......'' یہ کہہ کر منگا نے ایک ہاتھ سے اس کے کلے دبائے اور دہانہ کھلتے ہی چاروں پان اندر گھسیڑ کر اس کا منہ بند کر دیا۔

''اوغ...... بوغ...... بوغ......'' جن کے منہ سے لایعنی آوازیں نکلیں۔

برکت صاحب خاموشی سے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ گاگے شاہ بڑے مزے سے خود بھی پان کھاتے ہوئے اس منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

عین اسی وقت ایک بار پھر برکت صاحب کے ماتھے کی شامت آئی۔ پتھر اب کی بار بھی ماتھے پر ہی لگا تھا۔

وہ جھنجھلا کر دروازے کی طرف لپکے۔ ''بہت مشکل ہے جو آج رات میرا سر سلامت رہے۔'' انہوں نے بھناتے ہوئے لہجے میں گل بانو سے کہا۔

وہ تیزی سے ماتھا بھی سہلا رہے تھے۔

''پھر اور کیا کرتی......؟ آواز تو دینے سے رہی۔'' گل بانو نے اپنا مخصوص جملہ ادا کیا، پھر حسب عادت ان کی طرف توجہ دیئے بغیر بولیں۔

''یہ...... اندر کیا ہو رہا ہے؟''

''اتنا نہیں ہو رہا............ جتنا تم میرے ساتھ کر رہی ہو۔'' وہ اب بھی بھنائے ہوئے تھے۔

''بتایئے نا...... آپ بھی بس......''

''جن کو بے ہوش کرنے کی کوشش ہو رہی ہے...... تاکہ اسے صحن میں لایا جا سکے۔'' انہوں نے بتایا۔

''ارے...... تو ماریئے کم بخت کے سر پر سل کا بٹہ...... ایک منٹ بھی نہیں لگے گا بے ہوش ہونے میں...... بولیئے...... لا کر دوں؟''

''نہیں بھئی نہیں......'' وہ جلدی سے بولے۔ ''دم نکل جائے گا بے چارے کا۔ تم اپنی ترکیبیں، اپنے باورچی خانے میں ہی رکھو۔''

''مرضی ہے آپ کی...... ورنہ تو......'' گل بانو کہتے کہتے رک گئیں۔

''اور کچھ......؟'' برکت صاحب نے سوال کیا۔

’’اور تو کچھ نہیں......بس...... بھا......‘‘ گل بانو نے منہ پھاڑ کر جماہی لی۔

’’اتنی سی بات پر تم نے پتھر دے مارا......؟ جاؤ...... جا کر سو جاؤ...... تمہیں نیند آ رہی ہے۔‘‘

’’اے لو...... کیسے سو جاؤں......؟ پورا محلہ ہماری وجہ سے جاگ رہا ہے۔‘‘

’’تو محلّہ کم از کم میرے سر پر پتھروں کی بارش تو نہیں کرے گا۔ اسے جاگنے دو..........‘‘ یہ کہہ کر برکت صاحب واپس آ گئے۔ گل بانو برا سامنہ بنا کر وہیں کھڑی رہیں۔ ادھر کمرے میں ایک اور منظر برکت صاحب کا منتظر تھا۔

جن کا منہ پان سے لبالب بھرا ہوا تھا، یہاں تک کہ اس کی باچھوں سے کتھا بہہ رہا تھا اور وہ خوب مزے لے لے کر پان چبا رہا تھا۔ اس کا سر باقاعدہ ہل رہا تھا۔

’’بھئی واہ...... یہ تو بڑی مزے دار چیز تھی۔ واہ...... مزا آ گیا......‘‘ جن نے پان حلق سے اتارنے کے بعد کہا۔

’’ابھی اور مزے آئیں گے۔‘‘ گاگے شاہ مسکرائے۔ ’’فکر مت کر......‘‘

چنگا اور منگا ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر بے ڈھنگے انداز میں ہنس دیئے۔

جن حیرت سے ان کی شکلیں تکنے لگا۔ پھر یک بیک اسے ایک زوردار جھٹکا لگا۔ اس نے گردن کو زور سے جنبش دی۔ پھر آنکھیں پھاڑنے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اسے سب کچھ دھندلا دکھائی دے رہا ہو۔ تمبا کو اپنا اثر دکھا رہا تھا۔

پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سینگ تھام لئے، لیکن سینگ بھلا کیا کرتے...... آخر کار وہ جھومتے ہوئے لڑکھڑایا اور فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

’’ہاہاہا...... ہوہوہو......‘‘ گاگے شاہ اپنے مخصوص انداز میں ہنسے۔

’’کم بخت......! لڑکیوں پر سوار ہوتا تھا، آج ظہور راجانی اور قوام نے مل کر اس پر سواری کر دی۔‘‘

’’میرے خیال سے شاہ صاحب......‘‘ چنگا نے جن کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’پانوں میں افیم بھی تھی۔‘‘

’’ایں......‘‘ گاگے شاہ چونکے۔ ’’میں نے بھی تو وہ پان کھائے ہیں۔‘‘

’’آپ کی تو بات ہی نرالی ہے شاہ صاحب......‘‘ منگا نے مکھن رسید کر دیا۔ ’’آپ پر افیم، گانجہ اور چرس کا کہاں اثر ہو گا۔‘‘

گاگے شاہ یہ سن کر اور بھی پھول گئے۔ پھر تعریف کی ہوا نکلی تو برکت صاحب سے مخاطب ہوئے۔

’’لو بھئی...... یہ تو ہو گیا بے ہوش...... اب تم ہم تینوں درویشوں کے لئے گرما گرم دودھ پتی اور ساتھ میں کچھ اور بھی لوازمات کا بندوبست کرو...... اس کے بعد پھر اگلا پروگرام شروع ہو گا۔ تمہارے گھر کے صحن میں شاید جنگ کا بازار گرم ہو جائے، ایک فیصلہ کن جنگ...... کیوں کہ جنوں کا سردار مجھ پر اور میرے مریدوں پر حملہ بھی کر سکتا ہے۔‘‘ گاگے شاہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

برکت صاحب کافی ’’متاثرہ‘‘ دکھائی دے رہے تھے۔ کیونکہ ان کی گردن بے تحاشہ ہل رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہاں چائے وغیرہ کا دور چلا۔ اس دوران جن کو ہوش نہیں آیا تھا۔

پھر گاگے شاہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

''چلو چنگا اور منگا......! اسے اٹھا کر صحن میں لے چلو۔ اب میں ایک زوردار وظیفہ کھینچوں گا اور اس کا سردار بھاگا چلا آئے گا۔''

☆......☆......☆

جنوں کے خیموں سے ذرا فاصلے پر اس وقت رقص و سرور کی گرما گرم محفل سجی ہوئی تھی۔

یہ کافی کھلی جگہ تھی، جہاں ایک بڑی سی چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ اس چٹائی پر جنوں کا سردار، اپنے چند مصاحبوں کے ساتھ گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھا ہوا جھوم رہا تھا۔ اس کام میں مصاحب بھی اس کا پورا پورا ساتھ دے رہے تھے۔

ان کے سامنے کئی لال، پیلی اور نیلی رقاصائیں ناچ رہی تھیں۔ ایک چھوٹا سا ڈسک پلیئر سردار کے برابر میں رکھا ہوا تھا، جس سے گانے کی آواز نکل کر فضا میں گونج رہی تھی۔

''کانٹا لگا......'' گانے کے بول تھے۔

یہ گانا شروع ہوتے ہی سردار اس قدر مدہوش ہو کر جھوما کہ اس کے سینگ، برابر میں بیٹھے ہوئے مصاحب کے سینگوں سے ٹکرا گئے۔

سردار بھنا اٹھا اور مصاحب پر گرجا۔

''دوسری بار ٹکرائے ہو تم......اپنے سینگوں کو سنبھال کر نہیں رکھ سکتے......؟''

''آ......آپ......خود......ہی تو ٹکرائے ہیں۔'' مصاحب ہکلایا۔

''اچھا......!'' سردار نے آنکھیں نکالیں۔ ''میں تم سے ٹکرا رہا ہوں......؟ تم اپنے ہوش میں تو ہو......؟ سنبھل کر بیٹھو......اب ٹکرائے تو تمہارے سینگ کاٹ دوں گا......سمجھے......!''

یہ سنتے ہی مصاحب کا چہرہ سفید پڑ گیا، جیسے اس کو پھانسی کا حکم دے دیا گیا ہو۔ وہ پتھر کے بت کی طرح ساکت ہو گیا۔ گانا بدستور چل رہا تھا، سردار دوبارہ جھومنے لگا۔ اب وہ مصاحب کافی محتاط تھا اور ذرا پیچھے بھی سرک گیا تھا۔

رقص جاری تھا......سردار خاص طور پر ایک رقاصہ کی طرف متوجہ تھا اور واقعی وہ دوسروں میں نمایاں دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے لال رنگ کا لباس زیب تن کر رکھا تھا، نام بھی اس کا لاسنی تھا۔ وہ خود بھی کئی بار مسکرا کر سردار پر نظر التفات ڈال چکی تھی۔

سردار نے مصاحبوں کی نظر بچا کر کئی بار اسے اشارے کئے۔ لیکن وہ چکنی مچھلی کی طرح تڑپ کر مزید دور چلی گئی۔

''ہائے......ہائے......ظالم......بالکل ایشوریہ ہے۔'' سردار ٹھنڈی سانس بھر کر بڑبڑایا۔

''آپ نے مجھ سے کچھ کہا سردار......؟'' بائیں جانب والے مصاحب نے چونک کر پوچھا۔

''نہیں......'' سردار نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔

''اوہ...... میں سمجھا تھا کہ آپ مجھ سے کچھ کہہ رہے ہیں۔''

''اپنے کانوں کا علاج کرواؤ۔'' سردار نے سخت لہجے میں کہا اور دوبارہ لاسنی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

عین اسی وقت سردار کا مصاحب خاص دوڑتا ہوا سردار کے قریب آ کھڑا ہوا۔ یہ سردار کا سیکریٹری تھا۔

قبیلے کے خارجی امور اور کئی مسئلے مسائل اسی کے ذمے تھے۔ بیرونی حالات کی آگہی سے وہی سردار کو باخبر رکھتا تھا۔

''س...... سس...... سردار......'' گانے کے شور میں وہ اتنا ہی کہہ سکا۔

سردار نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھا اور ڈسک ریکارڈر کی آواز دھیمی کر دی۔

''کیا ہوا......؟ تمہارے تھوتھنے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟'' سردار نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

سیکریٹری کا چہرہ واقعی دھواں دھواں سا ہو رہا تھا۔ ''بات ہی ایسی ہے سردار...... پندرہ بھی بج سکتے ہیں۔''

''کیا ہوا......؟ جلدی سے بک بھی چکو......'' سردار جھنجھلایا۔ ''ناچ خراب ہو رہا ہے۔'' سیکریٹری نے جھک کر ڈسک ریکارڈر بند کر دیا۔ فوراً ہی فضا میں سکوت قائم ہو گیا۔

''یہ کیا کر دیا......؟'' سردار بھنا کر بولا۔

''ادھر آئیے سردار...... بہت ضروری بات ہے۔ بہت ضروری......''

سیکریٹری نے ایک جانب اشارہ کیا۔ ''اتنی کہ صرف تخلیے میں ہو سکتی ہے۔''

''کون سی آفت ٹوٹ پڑی ہے؟ سارا مزہ غارت کر دیا۔'' سردار کا موڈ آف ہو رہا تھا۔

''آپ آئیے تو سہی......'' سیکریٹری نے ضد کی۔

سردار کے چہرے پر بیزاری کے آثار اور بھی نمایاں ہو گئے...... اس نے اپنے مصاحبوں کی طرف اچٹتی سی نظر ڈالی۔ وہ بھی ان ہی دونوں کی طرف متوجہ تھے، لیکن جیسے ہی سردار نے انہیں دیکھا...... وہ آنکھیں بند کر کے خواہ مخواہ جھومنے لگے۔ سردار انہیں گھورتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اوئے!'' سردار مصاحبوں پر گرجا۔ ''بند کرو یہ خواہ مخواہ سر ہلانا...... سیدھے ہو کر بیٹھو۔'' ظاہر ہے کہ غصہ تو کہیں نہ کہیں اتارنا تھا۔ مصاحب گڑبڑا کر سیدھے ہو گئے۔ سردار اور سیکریٹری ایک جانب چل دیئے۔

''لاسنی کو تم نے ہائر کیا تھا؟'' دو چار قدم آگے چلنے کے بعد سردار نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''جی...... جی ہاں۔'' سیکریٹری نے جواب دیا۔

''بھئی واہ......'' سردار پر مسرت لہجے میں بولا۔ ''پھر تو میں تمہاری بات ضرور سنوں گا۔ کہو...... کیا بات ہے۔ بیان کرو......''

سیکریٹری نے ادھر ادھر دیکھا اور ڈرامائی انداز میں بولا۔ ''وظیفہ آیا ہے سردار......''

یہ سن کر سردار بری طرح چونک اٹھا۔

''وظیفہ آیا ہے......؟ کیا مطلب......؟ کہاں سے آیا ہے وظیفہ......؟''

''برابر والے قصبے سے...........نورس نام ہے اس قصبے کا......'' یہ کہہ کر سیکریٹری نے قمیض کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک مڑا تڑا سا کاغذ نکالا اور سردار کی طرف بڑھا دیا۔

''یہ آیا ہے سردار......اور یہ......کسی وقت بھی پھٹ سکتا ہے۔''

''کس نے بھیجا ہے......؟'' سردار نے کاغذ کو سرسری انداز میں دیکھا۔

''آپ کو فوراً بلایا ہے سردار......'' سیکریٹری نے پھر کہا۔

''میں پوچھ رہا ہوں کس نے بھیجا ہے......؟'' سردار جھنجھلایا۔

''مجھے نہیں معلوم......ہو گا کوئی عامل......اب چلئے......فوراً بلایا ہے آپ کو......''

''کیا تمہارا دماغ خراب ہے......؟ کیوں جانا پڑے گا......؟ ہم کیا کسی کے باپ کے نوکر ہیں......؟ رات کا 1 بج رہا ہے، ادھر محفل اپنے عروج پر ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ جانا پڑے گا!'' سردار تنک کر بولا۔

''یہی تو آپ سمجھ نہیں رہے۔'' سیکریٹری کے لہجے میں بیزاری تھی۔

''میں فی الحال سمجھنا بھی نہیں چاہتا۔'' سردار نے جیسے کان پر سے مکھی اڑائی۔

''اس وظیفے کو اپنے طور پر پھس کر دو......صبح دیکھیں گے۔''

''اُفوہ......سردار......آپ......آپ خود ہی وظیفے کی آخری لائنیں پڑھ لیجئے......''

یہ کہہ کر اس نے سردار کے ہاتھ سے پرچہ لیا، اسے کھولا اور سردار کی آنکھوں کے قریب کر دیا۔

سردار نے پہلے تو بے دلی سے پرچے کو دیکھا اور پھر چونک اٹھا، لکھا تھا۔

''یہ صرف ہلکا سا نمونہ ہے، اگر تم نہیں آئے تو وظیفۂ سلیمانی روانہ کیا جائے گا اور تمہارا قبیلہ بھک سے اڑ جائے گا۔ جلدی پہنچو۔''

نیچے ایڈریس درج تھا۔ سردار آگ بگولہ ہو گیا۔ اس کے نتھنے پھولنے پچکنے لگے، پر پھڑ پھڑانے لگے۔ سیکریٹری خاموشی سے اس کی بدلی ہوئی کیفیت دیکھ رہا تھا۔

''کون ہے یہ بدتمیز......؟'' سردار گرجا۔

''معلوم نہیں......وہاں جا کر ہی پتا چل سکتا ہے۔'' سیکریٹری مسمسی صورت بنا کر بولا۔

''چلنے کی تیاری کرو......اسے وہیں جا کر سبق سکھانا پڑے گا۔ کم بخت......وظیفۂ سلیمانی کی بات کر رہا ہے۔'' سردار بھنائے ہوئے لہجے میں دانت پیس کر بولا۔

سیکریٹری نے جلدی سے سر ہلایا۔ سردار کے مصاحب اور قبیلہ کے تمام لوگ کھڑے ہوئے ان کی شکلیں تک رہے تھے۔

☆......☆......☆

چچا تندوری کو کافی دیر بعد معلوم ہوا کہ برکت صاحب کی لڑکی پر بھی جن نے ''حملہ'' کر دیا ہے۔ وہ بھی جن کے ''درشن'' کرنے کے لئے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ ویسے تو چچی نے تنگ کر کہا تھا۔

''اتنی رات گئے وہاں جا کر تم کیا کرو گے؟''

''ماروں گا سالے کو......'' چچا تندوری نے فوراً کہا۔

''وہ جن ہے......کوئی مرغا نہیں ہے۔'' چچی بولیں۔

''تم بھی حد کرتی ہو......'' چچا تندوری بھنا گئے۔ ''ارے......میں کوئی پاگل تھوڑی ہوں......جو خواہ مخواہ مرغوں کو جان سے مار ڈالوں گا۔ وہ مجھے چڑاتے ہیں، تو ان کی کم بختی آتی ہے۔''

''وہ بانگ دینا چھوڑ دیں تمہارے لئے......؟'' چچی نے پلٹ کر جواب دیا۔

''دیں ضرور دیں......منہ تو نہ چڑائیں۔''

یہ کہہ کر چچا تندوری گھر سے نکل آئے۔ گلی میں اس وقت نیم تاریکی چھائی ہوئی تھی۔

چچا کی سالخوردہ چپل نے سکوت کو توڑ ڈالا۔ وہ تھوڑی دور آگے گئے ہوں گے کہ ایک موٹا تازہ کتا کہیں سے نکل کر سامنے آ کھڑا ہوا۔

''ابے......کہاں تھا تو......؟'' چچا تندوری کے چہرے پر خوشی کے آثار نمایاں ہو گئے۔ ''بڑے دن بعد نظر آیا ہے......ہیں......؟''

کتا فوراً ہی دم ہلانے لگا۔ وہ بھی اب انہیں پہچان چکا تھا۔

چچا تندوری نے اسے چمکارا اور پھر آگے بڑھ گئے۔ جیسے ہی وہ گلی کے کونے پر پہنچے، قریب سے ہی کسی مرغے کی بانگ فضا میں گونجی۔

چچا تندوری کے اٹھتے قدم رک گئے۔ آنکھوں سے غصہ نمودار ہوا اور پورے جسم پر پھیل گیا، ان پر جیسے رعشہ طاری ہو گیا تھا۔

اس آواز کو سن کر ایک آگ سی بھڑکی تھی جو تلوے سے شروع ہو کر سر پر بجھی تھی۔ انہوں نے طیش کے عالم میں ادھر ادھر دیکھا۔

☆......☆......☆

گل بانو یہی سمجھ رہی تھیں کہ مہ پارہ سو چکی ہے، ورنہ حقیقت یہ تھی کہ مہ پارہ اس وقت اپنے کمرے کی لائٹ آف کر کے کمرے کے اندر ہی بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔

بات دراصل یہ تھی کہ وہ ''عشق زدہ'' ہو چکی تھی۔ پہلی ہی نظر میں اسے جن سے محبت ہو گئی تھی۔

''دل ہی تو ہے، یہ تو کسی پر بھی آ سکتا ہے۔ جن کے سر پر سینگ تھے تو کیا ہوا......؟

ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ بستر پر لیٹ کر تصور ہی تصور میں جن کے ساتھ ایک ڈوئیٹ گانا بھی گا چکی تھی۔ پھر جب بے چینی بڑھی تو وہ اٹھ کر ٹہلنے لگی۔

''کتنا خوب صورت تھا وہ......'' مہ پارہ نے سوچا۔ ''کڑیل جوان، مضبوط جسم، چوڑے چکلے سینے والا ''جنّیانہ'' وجاہت کا پیکر......''

مہ پارہ اس کے خیالوں میں ڈوب گئی۔ جن اسے خوابوں کا شہزادہ معلوم ہونے لگا۔ اس میں کسی چیز کی کمی نہ دکھائی دی بلکہ پروں اور سینگوں کا اضافہ ہی تھا۔

مہ پارہ نے اسی وقت فیصلہ کیا کہ اگر جن اسے مل گیا تو پہلی فرصت میں وہ اس کے پر جھڑوائے گی اور سینگوں کو کٹوا دے گی۔

"کیا وہ میرا ہو سکے گا......؟"

یہ سوال پریشان کن تھا، لیکن کمرے میں اندھیرے کے باوجود مہ پارے کے دل نے اثبات میں جواب دیا۔ اور خواہشوں کے کئی جگنو کمرے کی تاریکی کو روشنی سے منور کر گئے۔

ایک بار پھر جن کو دیکھنے کی تمنا دل میں جاگی......وہ تڑپ کر کمرے سے نکل آئی۔

گل بانو باورچی خانے میں برتن سمیٹ رہی تھی...... مہ پارہ آگے بڑھ گئی......سامنے ہی صحن تھا...... جہاں برکت صاحب وغیرہ کے ساتھ اسے جن بھی دکھائی دیا۔

لیکن وہ اس وقت جس صورت حال سے دوچار تھا، وہ مہ پارہ کے لئے تکلیف دہ تھی۔

صحن میں نیم کا گھنا اور اونچا درخت لگا ہوا تھا، اسی کے موٹے تنے سے جن کو باندھا گیا تھا اور وہ اس وقت بھی بے ہوش تھا۔

مہ پارہ کے دل کو دھکا سا لگا۔ اس کے محبوب کی یہ اوقات کہ اسے بکروں اور دنبوں کی طرح رسی میں جکڑ دیا گیا تھا......! اف......

مانا کہ اس کے سر پر سینگ تھے، لیکن اس طرح جانوروں والا سلوک تو اس کے ساتھ نہ ہونا چاہئے تھا۔ وہ دل مسوس کر رہ گئی۔ کسی سے کیا کہتی......؟ ناچار وہ نامرادی ہو کر اپنے کمرے کی طرف لوٹ آئی۔

☆......☆......☆

صحن میں دری بچھا دی گئی تھی، جس پر سب سے نمایاں تھے گاگے شاہ...... ان کے عقب میں دونوں مرید خاص موجود تھے...... ایک طرف برکت صاحب بھی بیٹھے ہوئے تھے۔

جن کو رسی کے ذریعے نیم کے درخت سے باندھ دیا گیا تھا۔ وہ اب بھی بے ہوش تھا۔

گاگے شاہ وظیفے کا اسٹارٹ لینے والے تھے۔ ادھر برکت صاحب بہ ظاہر تو مطمئن تھے لیکن اندرون خانہ ان کی حالت کافی پتلی تھی۔

ان کے ذہن پر کئی سوالوں اور اندیشوں نے یلغار کر رکھی تھی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ......

(1) اگر جنوں کی پوری فوج آ گئی تو......!

(2) اگر جن، انڈر ورلڈ سے متعلق ہوئے تو......!

(3) اگر انہوں نے مار مار کر ہم لوگوں کو دنبہ بنا دیا، تو......!

(4) اتنی رات گئے کوئی مرہم پٹی بھی کرنے والا نہ ملا تو......!

یہی سب کچھ سوچ سوچ کر وہ پہلو بدلتے اور اپنی ٹانگیں ہلانے لگتے۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ ان کی ٹانگیں خوف کے مارے خود ہی کانپ رہی ہوں۔ ویسے وہ اپنے چہرے کے تاثرات سے ظاہر کر رہے تھے کہ اس صورت حال سے کافی محظوظ ہو رہے ہیں۔

گاگے شاہ کے قریب چھوٹی سی انگیٹھی میں آگ جل رہی تھی۔ وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ پڑھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے جیب سے ایک کاغذ کا پرزہ نکالا، اس پر پھونک ماری اور کاغذ کو آگ میں جھونک دیا۔ پھر ہاتھ جھاڑ کر بولے۔

”لو بھئی..........میں نے بوقاف کے سردار کو حاضر ہونے کا حکم دے دیا ہے۔“

”اچھا......!“ برکت صاحب ہونقوں کی طرح گردن ہلا کر اتنا ہی بولے۔

”ہاں......اور چنگا، منگا......! ذرا ہوشیار رہنا......اچھا......“

”ٹھیک ہے شاہ صاحب......ہم ہوشیار ہیں۔“ دونوں بیک وقت بولے اور مزید اکڑ کر بیٹھ گئے۔

اسی وقت جن یعنی بوقاف کو ہوش آ گیا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا چاروں طرف دیکھنے لگا۔

”میں ابھی تک یہیں ہوں......؟“ وہ بڑبڑانے کے انداز میں بولا۔ لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔

”خواب دیکھا ہوگا تو نے کہ آزاد ہو گیا ہوں......“ گاگے شاہ طنزیہ انداز میں مسکرائے۔

”نہیں......“ جن نے برا سا منہ بنایا۔ ”بلکہ میں رانی مکرجی کے ساتھ گیٹ وے آف انڈیا میں گھوم رہا تھا اور وہ بھی مادر پدر آزاد۔“

”بدتمیز بھی ہے......“ گاگے شاہ نے اسے گھورا۔

”حاضر جواب بھی ہوں..........“ جن نے سر ہلا کر تائید کی۔

برکت صاحب کی بے ساختہ ہنسی نکل گئی۔ لیکن گاگے شاہ کی تیز نظروں نے فوراً اسی ہنسی کا گلا گھونٹ دیا۔

”جب تک اس کا سردار آئے......تم ایک بار پھر دودھ پتی بنوا لاؤ۔“

گاگے شاہ نے گویا برکت صاحب کو ہنسنے کی سزا سنا دی۔ ”جی اچھا......“ وہ سنتے ہی کسی پالتو بکرے کی طرح گردن جھکا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

”مجھے کم از کم پانی ہی پلا دو......ظالموں......“ جن کراہا۔

”رسی کھول دوں؟ خون پی لینا ہمارا کیوں......؟“ چنگا نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دے کر کہا۔

”ابھی میں اس ڈگری کا جن نہیں ہوں......“ جواب ملا۔

”اچھا......تم لوگوں کے یہاں بھی ڈگریاں ہوتی ہیں؟“ برکت صاحب حیرت سے بولے۔

”ہاں......کیوں نہیں اور وہ کام میں بھی آتی ہیں، کیونکہ ہمارے یہاں سفارش نہیں چلتی۔“ جن نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ برکت صاحب بغلیں جھانکنے لگے۔

”تم جاؤ......اس کے منہ نہ لگو۔ فٹافٹ چائے بنواؤ۔ یہ تو ایسا ہی باتونی ہے۔“ گاگے شاہ نے دخل دیا۔

برکت صاحب سر کھجا کر وہاں سے چل دیئے۔ پھر چائے کا دور چلا تھا......جس کے ختم ہوتے ہی گاگے شاہ بڑبڑائے۔

”حیرت ہے......ابھی تک سردار حاضر نہیں ہوا......کمال ہے۔“

”آج دن کیا ہے؟“ جن نے اچانک ہی سوال کیا۔

”کیوں......؟“ گاگے شاہ کی نظر ترچھی ہوگئی۔

”بتا تو سہی......“

”آج ہفتہ ہے۔“

”ہوں......سٹرڈے نائٹ اسپیشل......“ جن نے سوچ میں گم ہو کر کہا۔

”کیا مطلب......؟“

”مطلب یہ کہ آج سردار محفل میں ہوں گے۔ ہر ہفتے کی رات کو وہاں رقص و سرور کا پروگرام ہوتا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”قوالی کا......؟“ چنگا نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔ عریانی کا......“ جن نے بتایا۔

”کیا مطلب؟“ چنگا الجھ گیا۔

”بچوں کے سمجھنے کی بات نہیں ہے، تمہیں کیوں بتاؤں......؟“

اس سے پہلے کہ......چنگا کچھ کہتا یا کچھ کرتا، اسی وقت بادلوں کی سی گڑگڑاہٹ ہوئی اور صحن میں دھواں دھواں سا پھیل گیا۔ اس آواز میں اتنی گھن گرج تھی کہ گل بانو اور مہ پارہ بھی کمروں سے نکل آئیں۔

برکت صاحب کی ٹانگیں مزید ہلنے لگیں، کیونکہ اب دھوئیں نے ہیولوں کی شکل اختیار کرلی تھی۔

گاگے شاہ اور ان کے مریدوں کے علاوہ سب ہی آنکھیں پھاڑ کر اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔

اور پھر......یہ ہیولے، چار جسموں میں ڈھل گئے۔ یہ لمبے تڑنگے اور بڑی بڑی سینگوں والے جن تھے۔ ان سب میں ایک کافی نمایاں دکھائی دے رہا تھا، یہ سردار تھا، جو اپنے سیکریٹری اور دو مصاحبوں کے ساتھ ”نازل“ ہوا تھا۔

وہ بڑی خونخوار نظروں سے گاگے شاہ وغیرہ کی طرف دیکھ رہے تھے، انداز بھی جارحانہ تھا۔

”کون ہے وہ گستاخ......؟ جس نے اتنی رات گئے ہمیں للکارا ہے؟“ سردار کی دھماکے دار آواز صحن میں گونجی۔

گاگے شاہ فوراً ہی تن کر کھڑے ہوگئے، ان کے گرگوں نے بھی فوراً ان کی تقلید کی۔

”میں نے تمہیں بلایا ہے......“ گاگے نے رعب دار آواز میں کہا۔ ”تم سردار ہونا......؟“

وہ ذرا بھی مرعوب دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ جنوں کے سردار سے مخاطب ہیں۔

''ہاں...... ہم ہی سردار ہیں...... اور تم......'' سردار بولتے بولتے رک گیا، وہ غور سے گاگے شاہ کو دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً اس کی آنکھوں میں چمک سی نمودار ہوئی۔

''تم...... کچھ جانے پہچانے سے معلوم ہو رہے ہو......''

''تو پھر پہچانو کہ میں کون ہوں......؟'' گاگے شاہ کی مسکراہٹ عجیب سی تھی۔

سردار غور کرتا رہا، پھر وہ چونکا۔ ''اوہ...... اوہ...... گاگے شاہ حلوائی...... ہمارے مہربان...... ہمارے دوست...... یہ تم ہی ہو نا؟''

''بالکل ٹھیک پہچانا......'' گاگے شاہ بھرپور انداز سے مسکرائے اور بڑی شان سے برکت صاحب کی طرف دیکھا، جو منہ کھولے ہوئے ان دونوں کی گفتگو سن رہے تھے۔

برکت صاحب کی حیرت کا کیا پوچھنا...... وہ سوچ رہے تھے کہ آخر گاگے شاہ کتنی پہنچی ہوئی چیز ہیں کہ جنوں کے سردار تک ان کی رسائی ہے۔ واہ...... واہ میرے گاگے شاہ۔

ادھر سردار کو دیکھتے ہی بوقاف نے شور مچانا شروع کر دیا۔ ''سردار...... سردار......! ان لوگوں نے مجھے باندھ رکھا ہے۔''

''میں دیکھ چکا ہوں......'' سردار نے باوقار انداز میں ہاتھ اٹھایا۔ ''ذرا خاموش رہو......''

جن چپ ہو گیا۔ پھر سردار دوبارہ گاگے شاہ کی طرف متوجہ ہوا جو غصہ اس کے چہرے پر کچھ دیر پہلے نمایاں نظر آ رہا تھا، وہ اب ماند پڑ چکا تھا۔

''سناؤ بھئی گاگے شاہ...... کیسے ہو؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں......''

''بوقاف کا کیا چکر ہے؟'' سردار نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''یہ ہمارا مجرم ہے...... اسی کے فیصلے کے لئے تمہیں بلایا گیا ہے۔'' گاگے شاہ نے جواب دیا۔

یہ سنتے ہی سردار کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ ''تم نے وظیفۂ سلیمانی کی دھمکی دے کر اچھا نہیں کیا۔'' سردار نے کہا۔

''اس کے بغیر تم نہیں آتے............!'' گاگے شاہ مسکرائے۔ ''وہ تو صرف ایک بہانہ تھا تمہیں بلانے کے لئے۔''

''اوہ......'' سردار کے ہونٹ بھنچ گئے۔ ''تمہاری جگہ اگر اس وقت یہاں کوئی اور ہوتا تو یقین مانو کہ خاک و خون میں لوٹ رہا ہوتا۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ یہ تم ہو، اس لئے مجبوری ہے۔ ہم کریں بھی تو کیا......؟ تمہاری مٹھائی نے تو ہم سمیت پورے قبیلے کو دیوانہ بنا رکھا ہے۔ تمہارے علاوہ کسی اور کی مٹھائی منہ کو ہی نہیں لگتی......'' سردار نے پہلے دھمکی آمیز اور پھر تعریفی جملوں سے نوازا۔

''کئی قبیلوں میں جاتی ہے میری مٹھائی......'' گاگے شاہ نے فخریہ لہجے میں کہا۔ ''دور دور سے تمہاری قوم کے لوگ میرے پاس آتے ہیں۔''

''میں تو نہیں کھاتا مٹھائی......'' بوقاف نے منہ بناتے ہوئے دخل دیا۔

"تمہارے تو ڈھنگ ہی نرالے ہیں۔" گاگے شاہ کے لہجے میں کاٹ تھی۔

"آتے ہوں گے...... دور دور سے لوگ ضرور آتے ہوں گے۔" سردار نے ان دونوں کی طرف دھیان دیئے بغیر سر ہلا کر کہا۔ "ایسی مٹھائی اور ملے گی بھی کہاں......؟"

ادھر یہ گفتگو ہو رہی تھی...... ادھر گھر کے مکین حیران و پریشان تھے۔

برکت صاحب کا خیال تھا کہ سردار کے نمودار ہوتے ہی وہ ہنگامہ برپا ہوگا کہ خدا کی پناہ...... لیکن اس وقت صورت حال ان کی سوچ سے قطعی برعکس تھی۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ جن حضرات مٹھائی کے بہت شوقین ہوتے ہیں، لیکن اب ایسا بھی کیا...... کہ مٹھائی کی اتنی اہمیت تھی کہ سردار کا غصہ اور جاہ وجلال ہی اڑن چھو ہو گیا تھا۔ گاگے شاہ نے دھوکے سے سردار کو بلوایا تھا، اس لئے ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ سردار گاگے شاہ کو پٹخ کر رکھ دیتا، لیکن وہ اس وقت اتنی اہم بات کو نظر انداز کر کے دوستانہ ماحول میں باتیں کر رہا تھا۔

اس وقت برکت صاحب کو گاگے شاہ کی خود اعتمادی حد درجے عجیب لگی........... وہ خود جنوں کے سردار سے زیادہ پُراسرار لگ رہے تھے۔

اگر وہ مٹھائی والے تھے تو مٹھائی تو جگہ جگہ سے دستیاب ہو سکتی ہے...... پھر کیا چکر ہے......؟ وہ الجھے رہے۔

گل بانو بھی منہ پھاڑ کر یہ تماشہ دیکھ رہی تھیں۔ البتہ مہ پارہ اور بوقاف ان سب سے بے نیاز ہو کر ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ دل میں امنگوں کی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔

محبت کا پودا، جوان سال ہو کر سایہ دار گھنا درخت بن جانا چاہتا تھا۔ جس کے برفیلی چھاؤں میں بیٹھ کر محبت کے مدھ بھرے گیت گائے جا سکیں، جس سے دھوپ چھن کر نہ آ سکے، جس میں سریلی ہواؤں کا شور ہو اور بس وہی دونوں ہوں، اور...... اور کوئی نہ ہو۔ کوئی بھی نہ ہو۔ ان دونوں کو موجودہ صورت حال سے کوئی غرض نہیں تھی۔

تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں، اس دوران میں سیکریٹری کافی مضطرب دکھائی دیا۔

اور پھر اصل موضوع پر گفتگو شروع ہوئی۔ گاگے شاہ نے ازسرنو بوقاف کی تمام روداد سردار کے گوش گزار کر دی۔

سردار خاموشی سے سنتا رہا۔ کئی بار اس نے بوقاف پر نظر ڈالی، جو اسے مہ پارہ میں ہی گم دکھائی دیا۔ آخر میں گاگے شاہ نے کہا۔

"میں نے اسے بہت سمجھایا، غصہ بھی کیا، لیکن یہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس نے ہٹ دھرمی کی انتہا کر دی۔ یہ سمجھ رہا تھا کہ میں اس کے قبیلے والوں کو بلا نہیں سکوں گا۔"

"آہم...... ہوں......" سردار نے ہنکارہ بھرا۔ "تو یہ بات ہے۔" یہ کہہ کر وہ بوقاف کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"بوقاف......! یہ میں کیا سن رہا ہوں؟ تم اس قدر بدتمیز اور بدتہذیب ہو، مجھے اندازہ نہیں تھا۔ تم نے انسانوں میں ہمارے قبیلے کی عزت خاک میں ملا دی۔"

بوقاف نے فوراً ہی سر جھکا لیا تھا، بولا کچھ نہیں۔

''اب تم کیا چاہتے ہو گاگے شاہ......؟'' سردار ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''اس بات کی گارنٹی کہ اب یہ اس لڑکی پر دوبارہ سوار نہیں ہو گا۔ تمہیں میں نے اسی لئے بلایا ہے کہ اس مسئلے کا حل نکلے۔ میں اب واپس اپنے گاؤں چلا جاؤں گا، میرے جانے کے بعد اگر اس نے لڑکی کو دوبارہ تنگ کیا تو مجھے پھر واپس آنا پڑے گا اور اگر میں ان ہی چکروں میں رہا تو پھر مٹھائی کون تیار کرے گا۔''

''نہیں......نہیں......'' سردار جلدی سے بولا۔ ''اس مسئلے کا ابھی حل نکل آئے گا۔ تم فکر مت کرو۔ پھر تم آرام سے مٹھائی بنانا...... میں ابھی اس کے باپ کو بلواتا ہوں۔''

یہ کہہ کر سردار سیکریٹری کی طرف مڑا۔

''جاؤ سیکریٹری......! اور بوقاف کے باپ کو یہاں لے آؤ۔'' سیکریٹری فوراً ہی غائب ہو گیا۔

''بوقاف......! بوقاف......!'' سردار مٹھیاں بھینچ کر اتنا ہی کہہ سکا۔

اب برکت صاحب کی بھی کچھ ہمت بڑھی۔ انہوں نے آگے آتے ہوئے کہا۔

''سردار میں بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

''آپ کی تعریف......؟'' سردار کا انداز شاہانہ تھا۔

''یہ......یہ لڑکی کے باپ ہیں......'' گاگے شاہ نے تعارف کروایا۔ ''ان کا نام برکت ہے۔''

''اوہ......اچھا۔ کہئے......'' سردار چونکا۔

''بات یہ ہے جناب، کہ یہ صرف میری بیٹی کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ پورے قصبے کا مسئلہ ہے۔ قصبے کی کئی لڑکیاں اس کا شکار بن چکی ہیں، اور اب ان بے چاریوں کے رشتے نہیں آتے۔ وہ کنواری اپنے گھروں میں بیٹھی ہوئی ہیں۔ جو لڑکیاں جن یا آسیب زدہ رہ چکی ہوں، ان سے کوئی بھی شادی نہیں کرتا۔ یہ ایک گمبھیر مسئلہ ہے۔ اس کا کیا حل ہے؟ کیا ان لڑکیوں کو اس نے زندہ درگور نہیں کر دیا......؟''

برکت صاحب کی اس بات نے فضا پر سکوت طاری کر دیا۔ سردار کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ تڑپ کر بوقاف کی طرف گھوما۔ ''کیا یہ بھی سچ ہے بوقاف؟ تم اور بھی کئی لڑکیوں کو پریشان کر چکے ہو؟''

بوقاف تھوڑی دیر خاموش رہا۔ پھر اس کے ہونٹ ہلے۔ ''یہ لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں، سب سچ ہے سردار...... سب سچ ہے...... میں اپنی غلطیاں اور جرائم کا اعتراف کرتا ہوں۔ لیکن سردار......! میں اب جو کچھ کہوں گا...... وہ بھی سچ ہے۔''

یہ الفاظ کسی دھماکے سے کم نہیں تھے......خاص طور پر برکت صاحب اور گل بانو تو دھک سے رہ گئے۔

''ہائے......ہائے............'' گل بانو کلیجہ تھام کر بڑبڑائیں۔ ''دلیپ کمار کو دیکھو تو......بڑا آیا......ہونہہ......حرام صورت......''

مہ پارہ بجلی کے شرارے کی طرح اپنے کمرے کی طرف لپکی۔ تاکہ کوئی اس کے چہرے پر کھلنے والے پھولوں کو نہ دیکھ لے۔

''دیکھا......دیکھا آپ نے سردار......؟'' برکت صاحب نے احتجاج کیا۔ ''یہ کس قدر بے شرمی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ حد ہو گئی......بھلا بتاؤ تو......''

''یہ کیا بے ہودگی ہے بوقاف؟ تم ہوش میں تو ہو؟''

''عشق، بے ہودگی ہرگز نہیں ہوتا سردار............'' بوقاف نے جواب دیا۔

''بکواس بند کر......'' سردار نے ڈپٹ کر کہا۔

''آپ اسے بکواس کہہ رہے ہیں......'' بوقاف نے حیرت سے کہا۔ ''کیا آپ کو طالوت یاد نہیں ہیں؟ انہوں نے بھی تو......''

سردار کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ اس نے فوراً بات کاٹی۔ ''ہاں......ہاں......یاد ہیں......بس......چپ رہ......''

''یہ طالوت کون صاحب ہیں؟'' برکت صاحب نے حسب عادت اڑائی۔

''ایں......'' سردار چونکا۔ پھر سنبھل کر بولا۔ ''آپ کے یہاں کے ایک مصنف ہیں، ان کا نام ہے شکیل انجم، ان سے ہی معلوم کیجئے گا طالوت کے بارے میں......''

سردار نے یہ کہتے ہوئے برا سا منہ بنایا۔ اس سے پہلے کہ برکت صاحب کچھ کہتے صحن میں ایک بار پھر بادل گرجے اور سیکریٹری ایک نئے جن کے ساتھ نمودار ہوا۔

نیا جن کافی عمر رسیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی شکل کافی حد تک بوقاف سے مماثل تھی۔ یہ یقیناً بوقاف کا باپ تھا۔ اس کے چہرے پر شدید غصے کے آثار نمایاں تھے۔ وہ فوراً ہی بوقاف کی طرف لپکا، پاؤں سے جوتا اتارا اور بوقاف کو پیٹنا شروع کر دیا۔

''کم بخت، بے غیرت، بے حیا......اس سے بہتر تھا کہ پیدا ہوتے ہی ہم نے تیرے سینگ توڑ دیئے ہوتے۔ کم از کم یہ دن تو نہ دیکھنا پڑتا۔'' بوقاف کا باپ نہ جانے کیا کیا اول فول کہتا رہا اور بوقاف کو جوتے مارتا رہا۔

وہ خاموشی سے پٹتا رہا۔ آخر برکت صاحب سے رہا نہ گیا۔ وہ آگے بڑھے اور اس کے باپ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''ارے بھئی......بس......بس کریں......''

''جان سے ماردوں گا اسے۔ زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' وہ دوبارہ خود کو چھڑا کر بوقاف کی ٹھکائی کرنے لگا۔

عین اسی وقت گل بانو کا ''کاشن'' موصول ہوا اور برکت صاحب اپنے ماتھے کو سہلاتے ہوئے ان کی طرف لپکے۔ ''تمہیں کوئی اور طریقہ نہیں سوجھتا......؟'' انہوں نے پوچھا۔

''تو پھر اور کیا کرتی؟ آواز تو دینے سے رہی۔'' پرانا جواب ملا۔

''میں یہ کہہ رہی ہوں کہ...... آپ کو کیا ضرورت تھی مداخلت کرنے کی۔ ٹھکائی ہونے دیجئے کم بخت کی، اس کے ساتھ ہونا بھی یہی چاہیے۔ ابھی سنا نہیں تھا......؟ کیا کیا بک رہا تھا خبیث......''

''وہ تو ٹھیک ہے بیگم...... مگر......''

''اگر مگر کچھ نہیں...... اچھا ہے جو اس کی درگت بن رہی ہے۔ وہ ہے ہی اسی قابل...... بلکہ میرا بس چلے تو میں بیلن لا دوں۔''

''اچھا بھئی...... اچھا اور ہاں...... اب تم پتھراؤ بند کر دو۔ ورنہ آج رات کم از کم میرا سر سلامت نہیں رہے گا۔ تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ تم اب تک کتنے پتھر مار چکی ہو؟ کوئی حساب بھی ہے؟''

''میں صرف باورچی خانے کی چیزوں کا حساب رکھتی ہوں۔ جیسے آٹا، چینی، چاول اور......''

''بس بس......'' برکت صاحب گھبرا گئے۔ ''میں جا رہا ہوں، ضرورت پڑے تو اب بھلے آواز دے لینا، میری طرف سے اجازت ہے۔''

وہ دوبارہ صحن میں آ گئے۔ ادھر جن کا باپ ایک طرف کھڑا ہوا ہانپ رہا تھا۔ شاید بوقاف کو مار مار کر تھک گیا تھا۔ پھر وہ یک لخت سردار کی طرف گھوما۔

''دیکھ لیجئے سردار! میں نے اپنی اولاد کو، جگر کے ٹکڑے کو، سب کے سامنے مارا ہے۔ کیونکہ غلطی اسی کی ہے، کسی اور کی قطعاً نہیں ہے۔ میں نے ہزار بار اسے منع کیا ہے کہ انسانوں کی بستی کا رخ نہ کرے۔ ہزار بار سمجھایا کہ یہ مخلوق بہت خطرناک ہوتی ہے، اس سے بچ کر رہا کر، لیکن یہ ایک نہیں مانتا اور آج...... مجھے یہ دن دیکھنا نصیب ہوا۔ صرف اس نامراد کی وجہ سے۔ اگر یہ میری نصیحتوں کو اپنے پروں سے باندھ لیتا تو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔''

''نصیحت......! پروں سے باندھ لیتا......؟'' برکت صاحب نے حیرت سے دہرایا اور پھر بے ساختہ ان کی ہنسی نکل گئی۔

''انہیں کیا ہوا............؟'' سردار نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے گاگے شاہ سے سرگوشی کی۔

''صدمہ......'' گاگے شاہ کے لہجے میں افسردگی تھی۔ ''بیٹی کی طبیعت نے کافی اثر ڈالا ہے ان کے ذہن پر......''

''اوہ...... اچھا۔'' سردار نے فوراً سر ہلایا اور ہمدردی سے برکت صاحب کی طرف دیکھا۔

برکت صاحب فوراً ہی سنبھل گئے۔ انہیں احساس ہو گیا تھا کہ سردار انہیں عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔

''میں ایک بات اور کہوں گا سردار۔'' دفعتاً بوقاف کے باپ نے عجیب سے لہجے میں گزارش کی۔

''ہاں...... ہاں۔ کہو روناف...... اجازت ہے۔'' سردار نے سر ہلایا۔

''میرا بیٹا قصور وار ہے...... میں نے مانا...... لیکن اس سارے معاملے میں لڑکی کا بھی کچھ نہ کچھ ہاتھ ہے۔'' اس نے نئی کہی۔ سب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

☆......☆......☆

’’کیا مطلب......؟ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟‘‘ گاگے شاہ نے تیوری پر بل ڈال لئے۔ برکت صاحب بھی روناف کو گھور رہے تھے۔

’’اپنی بات کی وضاحت کرو، روناف......‘‘ سردار بھی بول اٹھا۔

روناف نے اپنے گردوپیش ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور پھر گلہ کھنکار کر بولا۔ ’’میرا کہنے کا یہ مقصد ہے کہ آخر لڑکی کو کیا ضرورت پڑی ہے چھت پر جانے کی......؟ اتنا بڑا مکان ہے......! اگر وہ چاہے تو یہاں بھی ٹہل سکتی ہے، چھت پر ٹہلنے کا آخر مقصد کیا ہے؟‘‘

’’یہ کیا بات ہوئی......؟‘‘ گاگے شاہ نے اسے گھورا۔ ’’لڑکی کے باپ کا مکان ہے، وہ جہاں چاہے جائے، کمروں میں، صحن میں، چھت پر...... جہاں اس کا دل چاہے گا جائے گی۔ کون ہے اس پر پابندی لگانے والا......؟‘‘

’’ٹھیک ہے...... میں مانتا ہوں......‘‘ روناف نے تسلیم کیا۔ ’’لیکن بال کھولنے کی کیا ضرورت ہے...... بالوں کو باندھ کر بھی چھت پر جایا جاسکتا ہے۔‘‘

’’یہ بھی اس کی مرضی میں شامل ہے۔‘‘ گاگے شاہ فوراً بولے۔ ’’وہ بال کھولے یا باندھے۔‘‘

’’یہ تو ہٹ دھرمی ہے۔‘‘ روناف نے منہ بنایا۔ ’’ظاہر ہے کہ جب بال کھلے ہوں گے تو بے چارے معصوم جن ان میں پھنس سکتے ہیں اور ہوتا بھی یہی ہے، لڑکیوں کے بال کھلے ہوتے ہیں اور جن، ان بالوں میں الجھ کر پھنس جاتے ہیں۔ انسانوں نے جو اصول بنائے ہیں۔ ان پر عمل بھی تو کرنا چاہئے کہ نہیں......؟‘‘

’’اصولوں پر تو واقعی عمل کرنا چاہئے......‘‘ گاگے شاہ نے تائید کی۔ برکت صاحب نے انہیں گھورا۔ انہوں نے آنکھ ماردی۔

’’تو پھر......؟‘‘ روناف نے جوش سے کہا۔ ’’آپ لوگ ان لڑکیوں کو بال باندھ کر رکھنے کی ہدایت کرتے ہیں نا؟ یہ لڑکیاں اس ہدایت پر عمل کیوں نہیں کرتیں؟‘‘

’’میں نے مان لیا......‘‘ گاگے شاہ نے سر تسلیم خم کیا۔ ’’اب ذرا بات ہوجائے آپ کے اصول کی...... تو جناب......! آپ یہ بتائیے کہ آپ لوگ جب انسانی آبادی کا رخ کرتے ہیں تو ہمارے گھروں کی چھتوں سے کتنے فاصلے پر آپ کی پرواز ہوتی ہے؟‘‘

☆......☆......☆

’’کم از کم آدھا میل دور ہوتے ہیں ہم چھتوں سے۔‘‘ روناف کے لہجے میں الجھن تھی۔

’’یعنی آپ لوگ آدھے میل کا فاصلہ رکھ کر سفر کرتے ہیں؟‘‘ گاگے شاہ کی آنکھوں میں چمک سی آگئی۔

’’ہاں......‘‘ روناف نے بتایا۔ ’’اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں چھتوں پر کھڑی ہوئی لڑکیوں سے ہی بچنا ہوتا ہے۔‘‘

’’یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں سردار؟‘‘ گاگے شاہ نے سردار سے تصدیق چاہی۔

’’بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔‘‘ سردار نے جواب دیا۔

''یہ ہوئی نا بات......'' گاگے شاہ نے بچوں کی طرح خوش ہو کر کہا۔ ''اب آپ مجھے یہ بتائیے کہ کیا ہماری لڑکی کا قد آدھا میل لمبا ہے، جو تمہارا لڑکا اس کے بالوں میں پھنس گیا......؟''

یہ سوال کافی زوردار تھا۔ روناف کو جواب نہ سوجھ سکا۔ وہ بغلیں جھانکنے لگا۔ سردار بھی کافی متاثر دکھائی دے رہا تھا۔ ادھر گاگے شاہ کی گردن اکڑ گئی تھی اور وہ دادطلب نظروں سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگے۔

''بھئی واہ......سوال واقعی اچھا اور غور طلب ہے۔'' سردار نے خود بھی تعریف کی۔

''شکریہ سردار۔'' گاگے شاہ کی مسکراہٹ کافی دلکش تھی۔

روناف کو جواب تو نہ سوجھا، البتہ اس کا غصہ ضرور دوبارہ اس پر سوار ہو گیا۔ وہ ایک بار پھر بوقاف کو مارنے دوڑا۔ بڑی مشکل سے اسے روکا گیا، ورنہ ایک بار پھر اس پر ''جوتے کا دورہ'' پڑ چکا تھا۔

برکت صاحب دل ہی دل میں گاگے شاہ کی ذہانت پر عش عش کر رہے تھے۔ واقعی کس طرح انہوں نے روناف کو لاجواب کیا تھا۔ بوقاف پر نہ جانے کیوں خاموشی طاری تھی۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد خلا میں گھورنے لگتا، بالکل دیوداس لگ رہا تھا۔

اور پھر، سردار اور گاگے شاہ کے درمیان مختصر سے مذاکرات ہوئے، جس میں سردار نے یقین دہانی کروائی کہ بوقاف اب اس قصبے کا رخ ہرگز نہیں کرے گا۔ ادھر گاگے شاہ نے بھی مہ پارہ کے لئے ہدایت کی کہ وہ بلاضرورت چھت پر نہیں جائے گی۔ دونوں فریقین نے معاہدے کی شرائط کو تسلیم کیا اور پھر بوقاف کو کھول دیا گیا۔

جنوں کا قافلہ اب واپسی کے لئے پر تول رہا تھا۔ سب نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلائے، آپس میں سلام دعا کی۔

''دیکھ لیجئے گا سردار......!'' گاگے شاہ بول اٹھے۔ ''بوقاف اب ادھر نہ آئے۔''

''فکر مت کرو گاگے شاہ۔'' سردار سر ہلا کر بولا۔ ''آپ لوگ بھی اپنی لڑکی پر ذرا سختی رکھئے گا۔''

اور پھر سردار سمیت سارے جن وہاں سے غائب ہو گئے۔ اگلے ہی لمحے صحن میں گاگے شاہ، ان کے مرید اور برکت صاحب کھڑے پلکیں جھپکا رہے تھے۔

کچھ دیر اسی طرح گزر گئی۔ جو کچھ گزرا تھا، وہ اب خواب لگ رہا تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے یہاں جنوں کا قافلہ موجود تھا۔ پھر اس سکوت کو گاگے شاہ کی آواز نے توڑا۔

''چلو بھئی......خیر سے یہ معاملہ بھی نمٹا۔ اب تھوڑا آرام کرتے ہیں اور پھر صبح ناشتہ کر کے یہاں سے روانہ ہوں گے۔''

سب خیالات سے چونک اٹھے۔ برکت صاحب کے ذہن میں کئی سوالات نے یلغار کر دی۔ وہ کچھ دیر تو خاموش رہے اور جب سب آرام سے دری پر بیٹھ گئے تو انہوں نے گاگے شاہ سے کہا۔

''شاہ صاحب! میں کچھ پوچھنے کے لئے بڑی دیر سے بے چین ہوں۔ یہ بتائیے کہ جنوں کا سردار اور اس کے باقی چیلے آپ سے کافی

مرعوب دکھائی دے رہے تھے، اس کی کیا وجہ تھی؟ میں شروع سے ہی یہ بات محسوس کر رہا تھا۔‘‘

’’ہاہا...... ہوہو...... ہی ہی......‘‘ گاگے شاہ اپنے مخصوص انداز میں ہنسے۔

برکت صاحب ان کی شکل تکتے رہے۔ پھر گاگے شاہ نے کہا۔ ’’اس کی وجہ صرف مٹھائی تھی۔ میری دکان کی مٹھائی۔‘‘

’’مٹھائی......!‘‘ گاگے شاہ نے حیرت سے دہرایا۔ ’’لیکن مٹھائی تو ہر جگہ مل جاتی ہے۔‘‘

جواباً گاگے شاہ پراسرار انداز میں مسکرا دیئے۔ عین اسی وقت بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔

☆......☆......☆

دور دور تک چچا تندوری کو کوئی مرغا نہ دکھائی دیا، وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گردوپیش پر نظر دوڑا رہے تھے۔

’’ککڑوں...... کوں......‘‘ پھر آواز آئی اور اب کے بار انہوں نے اندازہ کر لیا کہ آواز کہاں سے آئی ہے۔

’’ٹھہر جا...... مرغے کی اولاد...... تیری تو میں نسلیں بھی گنجی کر دوں گا۔‘‘ چچا تندوری غصے سے دانت پیستے ہوئے آگے بڑھے۔

قریب ہی جھاڑیاں تھیں اور آواز ان جھاڑیوں میں سے ہی آئی تھی۔ انہوں نے جھاڑیوں کو ہٹایا تو ان کے عقب میں ایک خالی مکان تھا اور یہ آواز رہی۔ خالی مکان سے ہی آئی تھی۔ وہ فوراً اس مکان کی طرف بڑھے۔ چاند کی روشنی میں اس مکان کا دروازہ کھلا ہوا دکھائی دیا۔ چچا تندوری بے دھڑک اندر گھس گئے۔

اندر سناٹے اور اندھیرے کا راج تھا۔ چچا تندوری آنکھیں پھاڑتے ہوئے گزر کر آگے بڑھے۔ یہاں نہ مرغا تھا اور نہ مرغے کی ذات۔ وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ عین اسی وقت بیرونی دروازہ زوردار آواز سے بند ہوا۔ چچا تندوری اس وقت ایک کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔

چچا تندوری دروازے کی طرف متوجہ ہوئے ہی تھے کہ یکایک کمرے میں روشنی سی پھیل گئی۔ اور پھر...... چچا تندوری نے دیکھا کہ کمرے کے وسط میں ایک کرسی رکھی ہے اور اس کرسی پر کوئی بیٹھا ہوا ہے۔

اس کے چہرے اور لباس پر نظر پڑتے ہی چچا تندوری چونک اٹھے۔ وہ کفن نما سفید رنگ کے لباس میں ملبوس تھا، اس کا چہرہ بہت خوفناک تھا۔ توے کی مانند رنگ، سر کے بالوں سے بے نیاز، منہ کے دہانے سے لمبے لمبے دانت باہر جھانک رہے تھے، آنکھیں لال انگارہ تھیں۔ غرض وہ کوئی بہت بھیانک بلا تھی۔ انسانوں میں تو اس کا شمار ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ چچا تندوری کے علاوہ اگر کوئی اور اس وقت وہاں موجود ہوتا تو یقیناً اس کا ہارٹ فیل ہو چکا ہوتا۔

دفعتاً اس نے ایک زوردار اور بھیانک قسم کا قہقہہ لگایا۔ ’’ہاہاہا...... آ گیا شکار جال میں...... ہاہا۔‘‘ اس کی آواز بھی کھردری سی تھی۔

’’کون سا شکار......؟‘‘ چچا تندوری نے حیرت سے پوچھا۔

’’تم...... اور کون......؟‘‘ میں اب تمہارا خون پیوں گا...... گرم گرم خون...... اور پھر گوشت کھاؤں گا...... ہاہاہا......‘‘ وہ پھر ہنسا۔ دانت اور بھی نمایاں ہو گئے۔ چہرہ مزید بھیانک ہو گیا تھا۔

’’تم ہوکون......؟‘‘ چچا تندوری نے اسے گھورا۔

’’میں......‘‘ اس نے آنکھیں پھاڑیں۔ ’’میں شمولا ایک بھٹکی ہوئی ظالم روح ہوں اور میں نے تمہیں بہانے سے بلایا ہے، تا کہ یہاں آرام سے تمہارے خون کے ذریعے اپنی پیاس بجھا سکوں۔‘‘

’’کس بہانے سے بلایا ہے مجھے؟‘‘ چچا تندوری نے الجھن آمیز لہجے میں پوچھا۔

’’وہی......ککڑوں کوں......‘‘ وہ ہنسا۔

چچا تندوری یہ آواز سنتے ہی آپے سے باہر ہوگئے۔ طیش کے عالم میں آگے بڑھے اور شمولا کے پہلے تو دو ہنٹر جھاڑے اور پھر جو اس کی دھنائی کی تو......خدا کی پناہ۔

’’ارے......ارے......یہ......یہ کیا......‘‘ شمولا بوکھلا اٹھا۔

’’چپ کر کم بخت......تیرا ستیاناس......مرغے کے علاوہ کسی اور بہانے سے بلاتا تو میں خود ہی تجھے اپنا خون پلا دیتا، اب......مجھ میں خون ہی کتنا ہے؟ لیکن......اب......میں خود تیرا خون پی جاؤں گا۔‘‘

یہ کہہ کر چچا تندوری نے ایک فلمی زقند لگائی اور شمولا کے اوپر جا گرے۔ شمولا کی کرسی الٹ گئی، اور وہ دھڑام سے فرش پر گرا اور چچا تندوری اسے چھاپ بیٹھے۔

☆......☆......☆

سائیڈ ٹریک

سائیڈ ٹریک، مظہر کلیم کی عمران سیریز کا ایک ناول ہے یہ عمران کے ایک سائیڈ مشن کی کہانی جس میں عمران اور اُس کا ساتھی جوانا ایک یورپین ایجنٹ کے خلاف برسرِ پیکار ہیں۔ اس ناول میں مظہر کلیم نے عمران، جوانا اور ٹائیگر کے کئی بہت خوبصورت مارشل آرٹ فائیٹ کے سین پیش کیے ہیں۔ اس بار عمران مین مشن کی بجائے سائیڈ مشن پر کیوں کام کر رہا ہے؟ اگر عمران مین مشن پر نہیں ہے تو مین مشن پر کون کام کر رہا ہے اور پاکیشیا سیکریٹ سروس کہاں مصروف ہے؟ کیا عمران اور اس کے ساتھی اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے۔ ان سب سوالوں کے جواب جاننے کے لئے پڑھیے ناول ’’سائیڈ ٹریک‘‘۔

سائیڈ ٹریک کتاب گھر پر دستیاب ہے۔ جسے **ناول** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

گل بانو نے دروازہ کھولا تو سامنے چچا تندوری کی بیوی، چچی کھڑی دکھائی دیں، وہ کافی پریشان لگ رہی تھیں۔ گلی میں کوئی اور موجود نہیں تھا۔ دراصل رات اتنی گزر چکی تھی کہ سب ہی اپنے اپنے گھروں میں واپس جا چکے تھے۔

"کیا ہوا چچی جان......!" گل بانو بھی انہیں چچی ہی کہتی تھیں۔

"تمہارے چچا یہاں آئے تھے......؟"

"چچا...... نہیں تو...... وہ تو یہاں نہیں آئے۔" گل بانو نے جواب دیا۔

"ہائے...... پھر کہاں چلے گئے؟ وہ تو کہہ رہے تھے کہ مہ پارہ کو دیکھنے جا رہا ہوں۔" چچی اور بھی گھبرا گئیں۔

گل بانو انہیں گھر میں لے آئیں۔ برکت صاحب اور گاگے شاہ کو معلوم ہوا تو انہوں نے چچی کو صحن میں ہی بلا لیا۔ چچی نے سارا ماجرا بیان کیا۔ گاگے شاہ غور سے سن رہے تھے۔ آخر میں بولے۔

"معلوم تو ہو جائے گا کہ وہ اس وقت کہاں ہیں لیکن اس میں کافی خرچہ ہوگا۔"

"خرچہ......؟ کیا مطلب؟" چچی نے چونک کر پوچھا۔ "خرچہ کس بات کا؟"

"بھئی...... ان کو واپس بلانے کے لئے عمل کرنا پڑے گا...... اسی میں ہوگا خرچہ......" گاگے شاہ نے سمجھایا۔

"کیا ان کی واپسی ہوائی جہاز سے ہوگی؟" چچی کی آواز میں الجھن تھی۔ چنگا اور منگا منہ پھیر کر ہنسنے لگے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" گاگے شاہ نے غصے میں دھاڑ کر ان سے پوچھا۔

"کک...... کک...... کچھ نہیں شاہ جی...... ہم تو...... ہم تو......" دونوں بوکھلاہٹ میں اتنا ہی کہہ پائے۔

"کیا ہم تو...... ہم تو لگا رکھی ہے؟ سیدھے بیٹھو......" گاگے شاہ نے انہیں ڈپٹا اور چچی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ "آپ بہت بھولی ہیں...... کسی گمشدہ آدمی کو واپس بلانے کے لئے کچھ چیزوں کے اوپر پڑھائی کرنی پڑتی ہے، اور وہ چیزیں خریدنی پڑتی ہیں۔ اسی لئے میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ خرچہ ہوگا۔"

"کتنا خرچہ ہوگا......؟" چچی نے پوچھا۔

"کم سے کم ایک ہزار روپے......"

"ایک...... ہزار...... روپے......؟" ان کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ "اتنی رقم میں کہاں سے لاؤں گی؟"

"آپ ابھی دوگی...... میں ابھی ابھی اپنے مریدوں کو بھیج کر سامان منگوالوں گا...... اور ہاں ٹیکسی کا کرایہ بھی ہوگا۔" گاگے شاہ نے کہا، انہوں نے جیسے چچی کی بات سنی ہی نہیں۔

"ائے...... کہاں سے دوں گی؟" وہ حیران تھیں۔

برکت صاحب نے کھنکھار کر گاگے شاہ کو اشارہ کیا۔

''چھوڑو اماں......'' چنگا نے کہا، انداز ہمدردانہ تھا۔ ''خواہ مخواہ پرانے آدمی پر ہزار روپیہ خرچ کرو گی......اتنے پیسوں میں مارکیٹ سے نیا بندہ ہی مل جائے گا۔''

''ان جیسا نہیں مل سکتا۔'' برکت صاحب نے حسب عادت دخل دیا۔ ''وہ بڑے اینٹک ہیں۔ ایسا مال ہمیشہ مارکیٹ میں شارٹ رہتا ہے۔''

''اوئے......بند کرو یہ اسٹاک ایکس چینج۔'' گاگے شاہ چیخے اور وہ دونوں سہم گئے۔ اب گاگے شاہ غور سے چچی کو دیکھ رہے تھے۔ ''ہاں جی......کیا ارادہ ہے پھر......؟'' انہوں نے پوچھا۔

چچی نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ منگا نے صدا لگا دی۔ ''دے دے چاچی......مولا بھلا کرے گا۔''

''او......جا......کم بخت......! شرم نہیں آتی؟ ہٹا کٹا ہو کر مانگتا ہے، بے غیرت کہیں کا۔'' انہوں نے منگا کو بری طرح جھڑکا۔ وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔

پھر وہ گاگے شاہ سے بولیں۔ ''میرے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ اگر آپ کو معلوم کرنا ہے تو ایسے ہی کروا دیں۔''

گاگے شاہ کا منہ بن گیا۔ ''کوشش کریں شاہ صاحب۔'' برکت صاحب جلدی سے بولے۔ ''آپ تو بہت پہنچے ہوئے ہیں۔''

''کیوں جھوٹ بول رہے ہو برکت میاں؟'' چچی حیرت سے بولیں۔ ''یہ تو کہیں بھی نہیں پہنچے، یہیں تو بیٹھے ہوئے ہیں اتنی دیر سے۔''

''میرا مطلب تھا کہ شاہ صاحب بڑی کرامت والے ہیں۔''

''اوہ......اچھا۔'' چچی نے گردن ہلائی۔

''چلو......'' گاگے شاہ کے انداز میں مایوسی تھی۔ ''میں کوشش کرتا ہوں۔''

پھر وہ منگا سے مخاطب ہوئے۔ ''منگا......! ہو جا سر کے بل کھڑا......'' منگا فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھا اور بجلی کی سی سرعت سے سر کے بل کھڑا ہو گیا۔

''ان کا نام کیا ہے؟'' گاگے شاہ نے چچی سے پوچھا۔

''چچا تندوری......'' ان کے بجائے برکت صاحب بول اٹھے۔

چچی نے انہیں گھورا اور پھر گاگے شاہ سے بولیں۔ ''جی......ان کا نام رحمت ہے۔''

''ہوں......ان کی ماں کا نام؟''

''مائی لشکاراں۔''

''یہ کیا نام ہوا؟''

''پہلے ایسے ہی نام ہوتے تھے۔ لیکن لوگ بڑے کام کے ہوتے تھے۔ آج کل دیکھ لو کیسے کیسے نام ہیں......اور کام......اللہ معافی۔''

"او...... میرا خیال ہے جی......" چنگا معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ "جوانی میں وہ بڑے لشکارے مارتی ہوں گی، اسی لئے ان کا نام......"

"بک بک مت کر...... چپ رہ......" گاگے شاہ نے اسے ڈانٹا۔

"مجھے سر کے بل کھڑا کر کے کیا قاعدہ پڑھا رہے ہو شاہ صاحب؟" منگا کی پھنسی پھنسی آواز آئی۔

"اوہ...... ہاں۔" وہ چونکے۔ "تمہیں تو میں بھول ہی گیا۔ ذرا صبر کرو۔"

"اچھ...... چھا۔" منگا بہ مشکل بول سکا۔

اب گاگے شاہ چچی کی طرف متوجہ ہوئے اور محتاط انداز میں پوچھا۔ "کیا رحمت صاحب کا اپنا تندور ہے...... میرا مطلب ہے کہ ابھی برکت نے انہیں چچا تندوری کہا تھا۔"

"کوئی تندور وندور نہیں ہے۔" وہ برا سا منہ بنا کر بولیں۔ "لوگوں کے دماغ کا فتور ہے۔ ان کا دماغ ذرا گرم رہتا ہے، اس لئے لوگ انہیں چچا تندوری کہتے ہیں۔"

"شاہ...... صاحب۔" منگا پھر کراہا۔

"ہاں...... ہاں...... ٹھہرو ذرا......" وہ جلدی سے بولے۔ اب انہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگے۔ پھر منگا سے پوچھا۔

"ہاں منگا! بتاؤ رحمت بنت لشکارا کہاں ہے؟"

"لشکارا نہیں، لشکاراں۔" چچی نے ٹوکا۔

"ہاں...... ہاں...... وہی۔" گاگے شاہ جواب دے کر پھر منگا کی طرف متوجہ ہو گئے۔ "بتاؤ منگا کہاں ہیں وہ؟"

اسی وقت منگا دھڑام سے ٹانگوں کے بل نیچے آیا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر حیرت تھی۔ "کیوں...... ؟ کیا ہوا......؟" گاگے شاہ نے پوچھا۔

"کھجلی اٹھی ہو گی اس کے۔" چنگا نے ہنستے ہوئے چغلی لگائی۔ "نہاتا بھی تو مہینے کے مہینے ہے۔"

"ابے...... تو کیا تیرے گھر میں نہاتا ہوں؟" منگا اس پر الٹ پڑا۔ "کہہ تو ایسے رہا ہے۔"

"بدبو ہی اتنی آتی ہے۔ اندازہ ہے میرا۔" چنگا نے ناک سکیڑی۔

اس سے پہلے کہ منگا بھنا کر کچھ کہتا، گاگے شاہ جھلا کر بولے۔ "میری نظر میں تو تم دونوں برابر ہو......"

"شکریہ...... شکریہ شاہ صاحب......" دونوں خوش ہو گئے۔

"بدبو کے معاملے میں۔" گاگے شاہ نے جملہ پورا کیا۔ دونوں ہی کے منہ بن گئے۔ برکت صاحب ہونقوں کی طرح پیر اور مریدوں کو دیکھ رہے تھے۔

''ہاں...... اب بتاؤ...... رحمت صاحب کہاں ہیں اور تم نے کیا دیکھا؟''

''وہ...... وہ یہاں سے تین گلی کے فاصلے پر ایک ویران مکان میں موجود ہیں اور ایک خونی بلا شمولا کے لئے عذاب بنے ہوئے ہیں۔'' منگا نے بتایا۔

''الٹا بول گئے ہو کیا؟'' گاگے شاہ نے حیرانی سے پوچھا۔

''الٹا کھڑا ہوگا...... تو الٹا ہی بولے گا......'' برکت صاحب نے پھر دخل اندازی کی۔

''ہائے...... ہائے...... میرے میاں......!'' چچی نے کلیجہ تھام لیا۔

''میں بالکل سیدھا سیدھا اور ٹھیک ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ وہ اس وقت اس مکان میں بری طرح شمولا کی ٹھکائی کر رہے ہیں۔'' منگا نے پھر کہا۔

''اللہ رحم کرے......'' برکت صاحب کے منہ سے نکلا۔

''رحمت صاحب پر......؟'' گاگے شاہ نے پوچھا۔

''نہیں...... شمولا پر۔'' برکت صاحب کا جواب تھا۔ پھر وہ چچی کی طرف مڑے۔ ''پہلے تو وہ صرف مرغوں کے دشمن تھے......!''

''تم بھی ان سے ذرا بچ کر رہنا برکت میاں......!'' وہ جل کر بولیں۔ ''مجھے لگتا ہے کہ وہ انسانوں کے علاوہ سب ہی کے دشمن ہو گئے ہیں۔'' یہ سن کر برکت صاحب کی حالت قابل دید ہوگئی۔

''اب کرنا کیا ہے شاہ صاحب؟'' چنگا کے انداز میں بے زاری تھی۔

''چل کر دیکھنا پڑے گا۔ کسی نہ کسی کی جان خطرے میں ہے۔'' انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ دوسرے بھی کھڑے ہوگئے۔

''بے چارے شمولا کی ہی بن آئی ہوگی۔'' منگا نے خیال ظاہر کیا۔

''کچھ نہیں کہہ سکتے۔ یہ تو وہاں جا کر ہی معلوم ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے تم نے الٹا دیکھ لیا ہو۔'' گاگے شاہ بولے۔

''اس کم بخت کو الٹا کھڑا ہی کیوں کیا تھا۔'' چچی جھلا کر بولیں۔

''آج کل زمانہ ہی سیدھی طرح کا نہیں ہے۔ نائی تک الٹا استرا چلاتا ہے۔'' گاگے شاہ نے سمجھایا۔

''وہ تو اپنا بلیڈ بچاتا ہے، منگا میں بچانے والی کیا چیز ہے؟'' چنگا ترخ کر بولا۔

منگا نے اسے گھورا، بولا کچھ نہیں۔

''فی الحال تو ''جان بچاؤ مہم'' کا آغاز ہو چکا ہے...... چلو بھئی...... منگا راستہ میں بتائے گا۔''

اور پھر سب کے سب گھر سے باہر نکل آئے۔ گل بانو اور مہ پارہ کمرے میں بے خبر سو رہی تھیں۔ منگا اس وقت واقعی گاگے شاہ کی ''ٹرانس'' میں تھا۔ وہ کسی معمول کی طرح سپاٹ چہرہ لئے ہوئے چپ چاپ چلا جا رہا تھا۔

دوسرے بھی آپس میں باتیں کرتے ہوئے اس کے ساتھ ہی قدم بڑھا رہے تھے، لیکن چچی اور چنگا زیادہ نزدیک تھے۔

رات کا سناٹا اور چاند کی چاندنی کے ملاپ سے ایک عجیب سوگوار سا ماحول چاروں طرف پھیلا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ چاند کی روشنی میں چچی نے منگا پر نظر ڈالی اور چنگا سے بولیں۔ ''ائے ہئے...... دیکھو تو...... اس کی حالت کیا ہو رہی ہے، بے چارے کی......''

''اس وقت یہ فل ٹن ہے چاچی......'' چنگا ہنسا۔

''کیوں......؟''

''اپنے پیر صاحب نے عمل کیا ہے نا......! اب جب تک یہ گھر دکھا نہیں دے گا اسی حالت میں رہے گا۔'' اس نے بتایا۔

''کچھ بھی ہو...... میری بلا سے...... لیکن اس وقت یہ موا بالکل صورت حرام لگ رہا ہے۔'' چچی نے منہ بنایا۔ ''اس کا نام بھی بھیک منگا ہے نا......؟''

''خالی منگا چاچی......'' وہ جلدی سے بولا۔

''میرا نام بھی اس سے ملتا جلتا ہے، کچھ خیال کرو۔''

''تو تو بھلا چنگا ہے۔'' چچی مسکرائیں۔ پھر زیر لب بڑبڑائیں۔ ''ہونہہ...... بھوکا ننگا......''

''کیا......؟'' چنگا نے سنا نہیں تھا، چونک کر پوچھنے لگا۔

''میں کہہ رہی تھی کہ تمہارے چاچا نہ جانے کس حال میں ہوں گے؟'' انہوں نے بات بنائی۔

''ٹھیک ہی ہوں گے۔'' چنگا لاپروائی سے بولا۔ ''جو آپ کے ساتھ رہ سکتا ہے، وہ کسی کے بھی ساتھ رہ سکتا ہے۔'' چنگا نے روا روی میں کہا۔

''کیا مطلب......؟'' چچی چونک کر بولیں۔ ''ہوش میں تو ہو؟ یا پھر تم بھی ٹن ہو رہے ہو؟''

''نیند آ رہی ہے چاچی...... بھا...... آ...... آ......'' چنگا نے منہ پھاڑ کر جماہی لی۔

اتنی دیر میں منگا ایک ویران مکان کے قریب آ کر رک گیا۔ سب لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے۔ ''یہی وہ مکان ہے...... جہاں......'' گاگے شاہ نے بولنا چاہا لیکن اسی وقت مکان کے اندر سے زبردست ''دھما چوکڑی'' اور دھینگا مشتی کی آوازیں گونجیں۔ پھر ایک زوردار آواز آئی۔ ''دھڑام......!'' وہ سب ایک دوسرے کی شکلیں تکنے لگے۔

''لو بھئی...... گئے چچا تندوری......'' چنگا کے منہ سے نکلا۔

''تیرے منہ میں بھینس کا گوبر...... کم بخت...... کیا اول فول بک رہا ہے۔'' چچی کا پارہ چڑھ گیا۔

''اوغ...... بھھ...... بھینس کا...... گوبر...... اوغ۔'' منگا کو ابکائی آنے لگی۔ وہ اب نارمل ہو چکا تھا۔

''تجھے کیا ہوا؟'' چچی نے حیرت سے پوچھا۔ ''گوبر جتنی بدبو تو خود تیرے پاس سے بھی آ رہی ہے۔''

''شاہ صاحب......!'' منگا نے شکایت بھرے انداز میں گاگے شاہ کی طرف دیکھا۔

''گوبر...... مم...... میرا مطلب ہے کہ صبر کرو۔ لیڈیز کے منہ لگنا اچھی بات نہیں ہے۔ دیکھ لو...... بسوں میں بھی ان کا کمپارٹمنٹ بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کی سن لیا کرو۔'' گاگے شاہ نے سمجھایا۔ منگا منہ بنا کر رہ گیا۔

’’میرا تو خیال ہے کہ شمولا، بکرا بنا ہوا ہے۔‘‘ منگا نے گفتگو کا موضوع بدلا۔

’’نہیں بے...... چچا تندوری دنبہ بنے ہوئے ہیں۔‘‘ چنگا نے اس کی نفی کی۔

’’نہیں......شمولا بکرا بنا ہوا ہے۔‘‘ منگا نے زور دیا۔

’’بالکل نہیں...... چچا تندوری دنبہ بنے ہوئے ہیں۔‘‘ چنگا بھلا کب ہار ماننے والا تھا۔

شمولا......بکرا......‘‘

’’چچا تندوری......دنبہ......‘‘

’’بکرا......‘‘

’’دنبہ......‘‘

’’بکرا......‘‘

’’دنبہ......‘‘

محمد فیاض ماہی
عین شین قاف
قیمت: 250

’’چپ کرواوئے......‘‘ گاگے شاہ چلا اٹھے۔’’ دنبے اور بکرے کہیں کے۔‘‘ دونوں خاموش ہو گئے۔ لیکن اب وہ اشارتاً ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بدبدا رہے تھے۔

اندر سے ایک بار پھر ایک زوردار آواز آئی، جیسے کسی کو دیوار پہ دھکا دیا گیا ہو۔ عین اسی وقت دھاڑ کی آواز سے دروازہ کھلا اور دوسرے ہی لمحے چچی اور برکت صاحب خوف زدہ انداز میں چیخے۔

وہ بہت ہی خوفناک اور ہیبت ناک شکل کی بلا تھی، جو دروازے سے برآمد ہوئی تھی۔

لیکن اس وقت اس کے بھیانک چہرے پر خوف اور گھبراہٹ کے آثار تھے۔ اس نے گاگے شاہ وغیرہ پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور ایک جانب بھاگ کھڑا ہوا۔

وہ بھاگا، ادھر چچا تندوری دروازے سے نکلے۔’’کم بخت کہاں گیا......؟‘‘ چچا تندوری دھاڑے۔

’’وو......وہ......ادھر......‘‘ برکت صاحب نے ہاتھ اٹھا کر سہما سہما سا اشارہ کیا۔

’’ہاہ......بزدل......ڈرپوک...... بھاگ نکلا سالا۔‘‘ چچا تندوری کے لہجے میں حقارت تھی۔

چچی انہیں زندہ سلامت دیکھ کر بڑی خوش تھیں۔ ان کا چہرہ چمکنے لگا تھا۔’’یہ تھا کون......؟ کتنی منحوس شکل تھی اس کی۔‘‘ چچی نے ایک جھرجھری لے کر پھر اسی طرف دیکھا، لیکن اب وہاں شمولا کا نام و نشان بھی نہ تھا۔

’’شمولا تھا بدبخت......ہونہہ......‘‘ چچا تندوری نے لاپروائی سے کہا۔

’’تم سے بھلا وہ کیا مقابلہ کرتا......‘‘ چچی ٹھنک کر بولیں۔

''میں شوہر بھی تو تمہارا ہوں...... اتنے سالوں سے تمہارے ساتھ رہ رہا ہوں، اب کسی چیز سے ڈر نہیں لگتا۔'' چچا تندوری مسکرائے۔

پھر گاگے شاہ وغیرہ پر نظر ڈالتے ہی چونکے۔ ''یہ کون لوگ ہیں بھئی......؟''

☆......☆......☆

پھر یوں ہوا کہ چچا تندوری اور چچی اپنے گھر کو ہو لئے، اور برکت صاحب وغیرہ اپنے گھر میں آ گئے۔ راستے میں ان کا آپس میں تعارف ہو گیا تھا۔ گاگے شاہ، چچا تندوری سے پوچھتے پوچھتے رہ گئے کہ وہ مرغے کی بانگ سے کیوں چڑتے ہیں۔

دراصل گاگے شاہ، شمولا کا حشر دیکھ چکے تھے۔ اس لئے خاموش رہنے میں ہی بہتری سمجھی۔ ڈریکولا اس طرح سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا تھا کہ پھر اس کی گرد بھی نہیں ملی تھی۔

گھر پہ آنے کے بعد ان سب کو نیند ستانے لگی۔ گاگے شاہ کا پروگرام تھا کہ وہ صبح سویرے گاؤں روانہ ہو جائیں گے۔ سب صحن میں ہی دری پر لیٹ گئے، برکت صاحب بھی ان میں شامل تھے۔

''بھئی برکت...... اب تو کوئی مسئلہ نہیں ہے؟'' گاگے شاہ نے گردن کو کہنی پر ٹکاتے ہوئے پوچھا۔

''جی نہیں شاہ صاحب......!''

''ہوں......'' وہ نیند میں جھوم کر بولے۔ ''ویسے تو بوقاف اب ادھر کا رخ نہیں کرے گا، لیکن اگر وہ آ جائے تو فوراً مجھے بلوا لینا، میں اب کے اسے مرغا ہی بنا دوں گا۔''

''پھر تو چچا تندوری اسے جان سے ہی مار دیں گے۔'' برکت صاحب ہنسے۔

''ہو سکتا ہے۔'' گاگے شاہ نے تائید کی۔ ''اچھا...... یہ تو بتاؤ کہ وہ مرغوں سے کیوں چڑتے ہیں؟''

''یہ تو مرغے ہی...... مم...... میرا مطلب ہے کہ یہ تو چچا تندوری ہی بتا سکتے ہیں۔ آج تک یہ بات راز میں ہی ہے۔'' برکت صاحب نے بتایا۔

''ان کی بیگم کو تو معلوم ہو گا؟''

''شاید معلوم ہو...... کبھی پوچھا نہیں۔''

''ہوں......'' گاگے شاہ نے یہ کہہ کر جماہی لی۔

چنگا اور منگا بے سدھ ہو چکے تھے۔ برکت صاحب کی آنکھیں بھی بوجھل تھیں۔ اچانک انہیں ایک خیال آیا۔

''شاہ صاحب...... وہ بات تو ادھوری ہی رہ گئی۔''

''کون سی بات......!''

''مٹھائی والی...... آخر جن کے سردار کا آپ ہی کی مٹھائی پر اتنا زور کیوں تھا؟ میں محسوس کر رہا تھا کہ آپ کی مٹھائی ان کی کمزوری ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟''

''اماں......کیوں نہ ہوگی کمزوری......'' گاگے شاہ دلآویز انداز میں مسکرائے۔ ''دراصل میں، ان کے لئے بنائی جانے والی مٹھائی میں افیم ملاتا ہوں، اسی لئے وہ میری مٹھائی کے دیوانے ہیں۔''

''اوہ......'' برکت صاحب کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''ایک دن اگر وہ لوگ میری مٹھائی نہ کھائیں، تو سکون سے سو نہیں سکتے۔ اور اگر ایک ہفتہ نہ کھائیں تو اپنی بوٹیاں خود ہی نوچ لیں۔'' گاگے شاہ کے انداز میں فخر تھا۔

''اچھا......!!'' برکت صاحب متحیر تھے۔

''اس راز سے صرف چنگا اور منگا واقف ہیں، یا اب تمہیں معلوم ہوا ہے۔'' گاگے شاہ گھاگھ قسم کے اسٹائل میں مسکرائے۔ ''ایسے ہی تھوڑی میں جنوں سے پنگے لیتا پھرتا ہوں......!!''

برکت صاحب ان کی چالاکی پر عش عش کرتے رہ گئے۔ کس طرح وہ بے چارے جنوں کے پیٹ میں نشہ اتار رہے تھے......اف......واقعی انسان کیا نہیں کرسکتا؟ اسے فی الحال پوچھنے والا کون ہے؟ لو بھلا بتاؤ......دوسری مخلوق کو بھی نہیں چھوڑا......

یہی کچھ سوچتے ہوئے برکت صاحب نیند کی آغوش میں چلے گئے۔

☆......☆......☆

بوقاف، اپنے باپ روناف کے ساتھ خیمے میں داخل ہوا، اس کی ماں خیمے میں بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ روناف نے بوقاف کو اس طرح دھکا دیا کہ وہ سیدھا اپنی ماں کے پیروں میں جا پڑا۔ ''لو......چمٹا لو اسے اپنے کلیجے سے......'' روناف کا غصہ اپنے عروج پر تھا۔ ''اور خوب شاباشی دو۔ اس نے آج جو کارنامہ انجام دیا ہے، اس کی بدولت میری گردن ہی کٹنا باقی رہ گئی ہے، سینگ تو کٹوا دیئے اس نے......''

''ارے......اللہ نہ کرے۔'' جنی کے منہ سے نکلا۔ ''کیوں اول فول اپنے منہ سے نکال رہے ہیں؟ سینگ کٹیں آپ کے دشمنوں کے......''

پھر وہ بوقاف کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ بوقاف نے کھوئے کھوئے سے انداز میں اس کے گھٹنے سے سر ٹکا دیا۔ آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔

''میں واقعی ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ سینگ تو کٹ چکے۔'' روناف کی آواز بھرا گئی۔

''آخر ہوا کیا ہے؟ پتا تو چلے......'' وہ ابھی تک حیران و پریشان تھی۔

جواباً روناف نے غصے سے بوقاف کی طرف دیکھتے ہوئے پوری کہانی سنا ڈالی۔ جیسے جیسے جنی سن رہی تھی، اس کے تیور بھی بدل رہے تھے۔

پھر جیسے ہی روناف خاموش ہوا، جنی نے بوقاف کے دو ہنٹر رسید کئے۔

''کم بخت......دور ہو جا میری نظروں سے......بے غیرت......'' یہ کہہ کر اس نے بوقاف کو پرے دھکیلا۔

''اس نے مجھے انسانوں کے سامنے ذلیل کروایا ہے، اپنے والوں سے الگ شرمندگی اٹھانی پڑی۔ وہ تو شکر کرو کہ اپنے سردار بہت اچھے

ہیں، کوئی اور ہوتا تو ہم لوگوں کو قبیلہ بدر کر دیتا۔''

''اس منحوس کو ہی قبیلہ بدر کروا دو......'' جنی غصے سے بولی۔

''تم بھی ایسا کہہ رہی ہو ماں!'' پہلی بار بوقاف کی زبان کھلی، اس کے انداز میں درد شامل تھا۔

''ہاں...... ہاں...... میں بھی یہی بولوں گی۔ تجھے اپنے ماں باپ کے سینگوں کی پرواہ نہیں ہے تو ہم لوگ کیوں تجھے اپنے سینے سے چمٹا کر رکھیں؟ تیرے ابا بالکل ٹھیک کہتے ہیں، تجھے میرے لاڈ پیار نے بگاڑا ہے۔'' وہ اس پر چڑھ دوڑی۔

روناف بھی اسے گھور رہا تھا، لیکن اب غصہ ماند پڑ چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بولا۔ ''اب بس...... اس کا علاج ہے شادی، گل چیں جنی سے اس کی شادی کر دو...... وہ مجھے بھی اچھی لگتی ہے۔''

''کیا مطلب......؟'' جنی چونکی۔

''مم...... میرا مطلب ہے کہ وہ مجھے اس بدبخت کے لئے اچھی لگتی ہے۔'' روناف جلدی سے بولا۔

''لیکن وہ مجھے اچھی نہیں لگتی۔'' بوقاف ناک سکیڑ کر بولا۔

''تو چپ کر...... اور ہاں...... یہ بتا کہ اب انسانوں کی بستی کا رخ کرے گا؟''

بوقاف خاموش رہا۔

''بول...... جواب دے؟ اب جائے گا وہاں؟''

وہ اب بھی چپ رہا۔

''ہوں......'' روناف غرایا۔ ''اس کا مطلب یہ ہے کہ تو...... اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے گا۔ ٹھیک ہے...... میں ابھی تیرا انتظام کرتا ہوں۔''

یہ کہہ کر روناف اپنی بیوی کی طرف مڑا۔ ''جاؤ...... قینچی لے کر آؤ۔''

''کیوں؟'' جنی بری طرح چونکی۔

''میں اس کے پر ہی کاٹ دوں گا۔ نہ پر ہوں گے اور نہ یہ انسانوں کی بستی کا رخ کرے گا۔''

''نہیں...... نہیں۔'' جنی خوف زدہ انداز میں بولی۔ ''میں...... میں اسے سمجھا دوں گی، اب ادھر نہیں جائے گا۔''

''تم نے پھر اس کی طرفداری کی......؟'' روناف نے بیوی پر آنکھیں نکالیں، وہ سہم گئی۔ پھر روناف نے خود ہی اٹھ کر قینچی تلاش کی تھی، اور ساکت بیٹھے ہوئے بوقاف کے پروں کے نزدیک لے جا کر پوچھا۔ ''بول...... اب جائے گا وہاں؟''

بوقاف اب بھی خاموش رہا۔ ادھر جنی کے چہرے پر تذبذب کے آثار تھے۔ وہ بول اٹھی۔ ''کہہ دے نا اپنے باپ سے کہ اب نہیں جائے گا۔ منہ سے پھوٹ تو......؟''

بوقاف پر کوئی اثر نہ ہوا۔ جھلا کر روناف نے اس کے پروں پر قینچی چلادی۔ پر کٹ کر زمین پر آ گرے۔ ماں نے منہ پھیر کر ہونٹ بھینچ لئے تھے۔ بوقاف کسمسا کر رہ گیا۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس ردعمل سے ناخوش ہے۔

’’اب پڑا رہ ادھر ہی...... جب تیرے پر آئیں گے، شاید ان کے ساتھ عقل بھی آجائے۔ تجھے اپنے بزرگوں کے کتنے قصے سنائے ہیں، مگر تجھ پر کبھی کوئی اثر ہی نہیں ہوا، اے نالائق......! ان لوگوں کو تو صدیاں گزر جاتی تھیں انسانوں کی بستی دیکھے ہوئے، اگر کبھی ان کی اڑان وہاں سے ہوتی بھی تھی تو اپنی آنکھیں بند کر لیتے تھے، تاکہ انسان کی لڑکیوں پر نظر نہ پڑے۔‘‘ روناف بولتا چلا گیا۔

’’ان لوگوں کی تو کیا بات تھی......‘‘ جنی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ’’نیک لوگ تھے وہ...... نیک......!‘‘

’’تم سنبھالو اپنے سپوت کو...... میں ابھی آتا ہوں۔‘‘ یہ کہہ کر روناف خیمے سے باہر نکل گیا۔

روناف کے جاتے ہی جنی نے بوقاف کے کٹے ہوئے پر سمیٹے اور بڑبڑانے کے انداز میں کہنے لگی۔ ’’تو نے بھی تو حد ہی کر دی تھی...... بھوکا بھی ہوگا......! کچھ کھایا پیا تو نے؟‘‘

’’صرف ایک گلاس پانی......!‘‘ بوقاف نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

’’ضرورت تو تجھے صرف چلو بھر کی تھی...... چل...... منہ ہاتھ دھو لے، میں کھانا گرم کر کے لاتی ہوں، یہ بتا...... ہڈیاں کھائے گا یا کوئلے لا کر دوں......؟‘‘

☆......☆......☆

گڑبڑ گھوٹالہ

گڑبڑ گھوٹالہ ڈاکٹر مظہر عباس رضوی کی مزاحیہ شاعری کا مجموعہ کلام ہے۔ یہ اُنکی مزاحیہ شاعری کی تیسری کتاب ہے۔ اس سے پہلے اُن کی شاعری کی دو کتابیں ’’ہوئے ڈاکٹری میں رسوا‘‘ اور ’’دوا بیچتے ہیں‘‘ شائع ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر مظہر عباس رضوی کی یہ شاعری اس اعتبار سے منفرد ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں ڈاکٹری، ہسپتال اور بیماریوں جیسے خشک موضوعات کو مزاح کے لطیف قالب میں ڈھالا ہے۔ اُن کی نظموں اور غزلوں کے چند عنوانات ہیں ’’یرقان آرزو، سو ہے وہ بھی ڈاکٹر، دردعرق النساء، پیوندکاری، نرس، ای سی جی، لفظی پوسٹمارٹم، ٹکڑے جگر کے‘‘ وغیرہ وغیرہ۔

گڑبڑ گھوٹالہ کتاب گھر پر دستیاب۔ جسے **شاعری** کے **طنز و مزاح** سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

مہ پارہ پر سختی سے پابندی عائد تھی، یعنی اس کا چھت پر جانا قطعی ممنوع تھا۔ گو کہ بوقاف جن کی طرف سے ابھی تک کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی، اور نہ ہی وہ پلٹ کر آیا۔ پھر بھی احتیاطاً برکت صاحب اور گل بانو نے مہ پارہ کو ''نظر بند'' کیا ہوا تھا۔

مہ پارہ نے دل ہی دل میں بوقاف کی محبت کو چھپا رکھا تھا۔ لیکن ماں پھر ماں ہوتی ہے، بیٹی کے بدلے ہوئے انداز اور طور اطوار دیکھ کر گل بانو کا ماتھا ٹھنکا......

مہ پارہ کا زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں گزرتا، اگر کمرے سے نکل بھی آتی تو گم صم رہتی، اگر بات کرتی بھی، تو صرف مقصد کی، ورنہ پہلے تو وہ بے تکان بولا کرتی تھی۔

اور اب وہ خیالوں سے چونکا کرتی تھی، خلاؤں کو گھورنے لگی تھی، کھوئی کھوئی سی رہنے لگی تھی۔ اس نے اب تک نئی مرغیوں کے لئے بھی فرمائش نہیں کی تھی، حالانکہ وہ مرغیاں پالنے کی بے حد شوقین تھی، پچھلی مرغیاں تو ساری کی ساری گاگے شاہ اور ان کے مریدوں کی ''نذر'' ہو گئی تھیں۔

بس ایک ہی دن اس کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی تھی کہ جب گل بانو نے کپڑے دھوئے تھے۔

مہ پارہ اس وقت کمرے سے نکلی تھی، دھلے ہوئے کپڑوں کا ڈھیر دیکھ کر وہ فوراً ادھر لپکی۔ ''امی جان......! کپڑے چھت پر ڈال آؤں؟'' اس نے پوچھا۔

''رہنے دو......'' گل بانو ہاتھ اٹھا کر بولیں۔ ''میں خود ڈال آؤں گی۔ اگر وہ خبیث جن تمہاری تاک میں ہوا تو......؟''

مہ پارہ کا چہرہ بجھ سا گیا۔ وہ ایک لفظ کہے بغیر دوبارہ اپنے کمرے کی طرف پلٹ پڑی۔ گل بانو اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئیں۔ پھر وہ دوبارہ کپڑے نچوڑنے لگیں۔ ''آخر اسے ہوا کیا ہے؟'' وہ آپ ہی آپ بڑبڑائیں۔

آج انہیں مہ پارہ کا رویہ کچھ زیادہ ہی عجیب لگا تھا۔ انہوں نے اسی وقت فیصلہ کیا کہ برکت صاحب سے اس کے متعلق ضرور بات کریں گی۔ برکت صاحب صبح سے ہی کسی کام کے سلسلے میں شہر گئے ہوئے تھے، ویسے بھی وہ گھر میں کم ہی رہتے تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت گھر سے باہر ہی گزرتا تھا۔

وہ کپڑے دھوتی رہیں اور مہ پارہ کے متعلق سوچتی رہیں۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ مہ پارہ اپنے کمرے سے نکلی اور دوبارہ ان کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

''امی جان......!''

''ہاں......مہ پارہ......بولو......؟''

''مجھے شاعری کی کتاب خریدنے کے لئے بازار جانا ہے، یہ بتائیں کہ کون سا شاعر زیادہ اچھا ہے، وصی شاہ، سعد اللہ شاہ یا پھر راشد نذیر طاہر۔''

''ایں......'' وہ چونکیں۔ ''یہ موا......راشد نذیر طاہر کون ہے؟''

''شاعر ہی ہوں گے۔'' مہ پارہ نے بتایا۔ ''میں نے ایک ڈائجسٹ میں ان کی غزل پڑھی تھی۔''

''اس کی کوئی کتاب ہے مارکیٹ میں؟'' گل بانو نے پوچھا۔

''معلوم نہیں۔'' مہ پارہ نے جواب دیا۔

''تو پھر...... تم کیوں اسے بڑے شاعروں سے ملا رہی ہو؟ غضب خدا کا ...... جسے دیکھو، شاعر بنا ہوا ہے۔ ہر کوئی اپنا دیوان اٹھائے چلا آ رہا ہے، جب ہی تو آج کل کی شاعری کا یہ حال ہے کہ صرف تک بندی ہو رہی ہے، مقصد کوئی نہیں ہے، گویا شاعری نہ ہوئی، پرچون کی دکان ہوگئی کہ ہر کوئی کھولے بیٹھا ہے۔ تم...... کس کے ساتھ جاؤ گی مارکیٹ؟''

''بشریٰ کے ساتھ۔'' اس نے بتایا۔

''اچھا...... چلی جانا...... اور ہاں کسی ڈھنگ کے شاعر کی کتاب لانا، یہ راشد نذیر طاہر واہر کو مت اٹھا کے لے آنا۔''

''جی اچھا۔'' وہ سعادت مندی سے بولی۔

''اور ہاں......'' وہ اچانک چونک کر بولیں۔ ''یہ تمہیں شاعری کا بھوت کب سے سوار ہوگیا؟''

''جب سے جن اترا ہے۔'' وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔

گل بانو اسے گھورتی رہ گئیں۔

☆......☆......☆

شام کے وقت برکت صاحب گھر لوٹے تو گل بانو نے مہ پارہ کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ ساری بات سنا کر وہ آخر میں بولیں۔ ''سب سے زیادہ فکر تو مجھے اس کی صحت کی ہے، اس نے کھانا پینا بھی کم کر دیا ہے۔''

''تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا......؟'' برکت صاحب بولے۔

''کیوں......؟ آپ کیا کرتے؟''

''میں اسے حکیم طولانی کے پاس لے جاتا۔'' انہوں نے بتایا۔

''ان کا تو نام ہی مت لیا کریں میرے سامنے......'' وہ منہ بنا کر بولیں۔ ''ان سے تو میری جان جلتی ہے۔''

''کیوں بھئی......؟ تمہاری کیوں جان جلتی ہے؟'' وہ حیرت سے بولے۔

''مجھے تو وہ بالکل پاگل ہی لگتے ہیں، ان کی حرکتیں بھی دیکھی ہیں آپ نے؟ میز پر طبلہ بجاتے ہیں، غزلیں پڑھتے رہتے ہیں۔''

''اوہو بھئی...... یہ تو ان کی عادت ہے۔ حکیم وہ بڑے پائے کے ہیں، نبض پکڑتے ہی مرض بتا دیتے ہیں۔ خاندانی حکیم ہیں، لیکن ان کے سینے میں حکیم کے ساتھ ساتھ ایک شاعر بھی چھپا ہوا ہے۔''

''سینہ نہ ہوا، پنجرہ ہوگیا۔'' گل بانو نے منہ بنا کر کہا۔ یہ بات برکت صاحب کے سر پر سے گزر گئی۔

''مہ پارہ کہاں ہے؟'' انہوں نے دریافت کیا۔

’’تھوڑی دیر پہلے ہی بشریٰ کے ساتھ مارکیٹ گئی ہے۔‘‘

’’اچھا......اچھا۔ چلو......آئے گی تو اسے حکیم طولانی کے پاس لے جاؤں گا۔ میرا خیال ہے کہ اسے صرف کمزوری ہے، کوئی بیماری نہیں ہے، بھلی چنگی ہے وہ...... چونکہ اس پر اتنا بھاری بھر کم جن سوار تھا، اس لئے اس کی طبیعت اب تک نڈھال ہے۔ حکیم طولانی کی ایک ہی خوراک سے وہ چالاک اور پھرتیلی لومڑی ہو جائے گی۔‘‘

’’لومڑی......؟‘‘ گل بانو چونک سی گئیں۔ ’’اس کا مطلب ہے کہ حکیم صاحب اپنی دوا خود بھی کھاتے ہوں گے۔‘‘

’’تم کیا کہنا چاہتی ہو؟‘‘ برکت نے انہیں گھورا۔

’’مجھے وہ خود بھی اودبلاؤ لگتے ہیں۔‘‘ وہ منہ بنا کر بولیں۔

’’تم سے تو بس......الٹی سیدھی باتیں کروالو......ارے ہاں بیگم...... وہ ذرا......گرما گرم چائے تو پلادو۔‘‘

’’بنا دیتی ہوں...... پی خود لیجئے گا۔ ہاں......‘‘

☆......☆......☆

لمبا قد، دبلا پتلا جسم، آنکھوں میں ایک وحشیانہ چمک، دہانہ اس نوعیت کا کہ کسی وقت بھی پھٹ پڑنے کا گمان ہو، سر پر ترکی ٹوپی، جسم نازک پر گرفت شیروانی و پاجامہ، کہ اگر......انہیں کھیتوں میں چھوڑ دیا جائے تو چڑیاں اناج نہ چگ سکیں اور غلہ نقصان سے محفوظ رہے۔

یہ تھے حکیم طولانی، جس وقت برکت صاحب اور مہ پارہ ان کے مطب میں پہنچے، تو وہ کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ وہ کرسی پر اکڑوں بیٹھے ہوئے تھے، الٹے ہاتھ کی کہنی میز پر ٹکی ہوئی تھی اور ہتھیلی نے چہرے کو تھام رکھا تھا۔ جیسے ہی برکت صاحب اور مہ پارہ ان کے قریب پہنچے، وہ اچھل کر کرسی سے اترے اور ساتھ ہی چلائے۔

’’آ گیا......آ گیا بھئی......آ گیا۔‘‘

مہ پارہ نے گھبرا کر برکت صاحب کی طرف دیکھا، وہ خود بھی حیران تھے کہ حکیم صاحب کو کیا ہو گیا......

’’ابو جان......!‘‘ مہ پارہ نے سرگوشی کی۔ ’’حکیم صاحب کے پاس شاید کوئی مریض نہیں آتا، اسی لئے وہ ہمیں دیکھ کر اتنا خوش ہو رہے ہیں۔‘‘

’’واہ بھئی واہ......خوب آیا......واہ......‘‘ پھر حکیم صاحب کی آواز آئی۔ وہ اب بھی اپنی دھن میں مگن تھے۔ اب تو باقاعدہ ان کا سر بھی ہل رہا تھا۔

برکت صاحب نے ہمت کر کے انہیں متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ ’’حکیم صاحب! اتنا خوش مت ہوں، ہو سکتا ہے کہ ہم لوگ دوا نہ لیں۔‘‘

حکیم صاحب نے چونک کر ان کی طرف دیکھا، جیسے اب تک ان کی آمد سے بے خبر ہوں۔ ’’تم......تم لوگ کب آئے بھئی......؟‘‘

’’آپ ہمیں دیکھ کر خوش نہیں ہو رہے تھے؟‘‘

’’ارے لاحول ولاقوۃ......‘‘ وہ منہ بنا کر بولے۔ ’’تم لوگ انسان ہو، بٹیر نہیں ہو کہ میں تمہیں دیکھ کر خوش ہو جاؤں۔ بٹیر کا گوشت مجھے

بہت پسند ہے۔“

”پھر آپ کے خوش ہونے کی کیا وجہ تھی؟“ برکت صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

”میرے خوش ہونے کی وجہ یہ تھی کہ......ارے بھئی......تم لوگ کھڑے کیوں ہو؟ بیٹھو......ہاں۔“ انہیں اچانک خیال آیا۔ پھر وہ خود بھی اپنی کرسی پر براجمان ہو گئے۔

برکت صاحب اور مہ پارہ بنچ پر بیٹھ گئے۔ ”نام کیا ہے بھئی......؟“ حکیم صاحب نے پوچھا۔

”جی......میرا نام برکت ہے، اور یہ میری بیٹی مہ پارہ ہے۔“ انہوں نے تعارف کروایا۔

”برکت......اوہ......ارے یار! میری یادداشت بھی کمزور ہو گئی ہے۔ تمہیں تو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ بلکہ پورا محلّہ جانتا ہے۔ دراصل بات یہ ہے برکت میاں کا......! ایک مصرعہ صبح سے تنگ کر رہا تھا، کم بخت ابھی ابھی شعر مکمل ہوا ہے۔ اسی لئے میں خوش ہو رہا تھا۔“

”مصرعہ کیا تھا حکیم صاحب؟“ مہ پارہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

”بھئی......مصرعہ تھا۔

جن کے چہرے پہ نور ہوتا ہے۔

عشق اس کو ضرور ہوتا ہے۔“ مہ پارہ جلدی سے بول اٹھی۔

”واہ بیٹی......واہ۔“ حکیم صاحب جھوم اٹھے۔ ”تم بہت ذہین ہو اور اہلِ ذوق بھی ہو۔ لیکن تم سے ایک غلطی ہو گئی، یہاں پر عشق اس کو نہیں بلکہ عشق ان کو......ہو گا۔“ حکیم صاحب نے اصلاح کی۔

”اوہ اچھا۔ لیکن یہ جن کون سا ہے؟“ مہ پارہ نے چونک کر پوچھا۔

یہ سن کر حکیم صاحب نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور پھر بولے۔ ”خوب......خوب......بذلہ سنج بھی ہو......“ انہوں نے زور سے سر ہلایا۔

برکت صاحب ان دونوں کی شکلیں دیکھ رہے تھے۔ پھر وہ کھنکھار کر بولے۔ ”حکیم صاحب......ذرا اسے دیکھ لیں۔ اس نے تو پریشان کر رکھا ہے۔“

”کیوں بھئی......کیا ہوا ہے اسے؟ لاؤ بیٹی، تمہاری نبض دیکھوں۔“

مہ پارہ نے کلائی آگے بڑھا دی۔ حکیم صاحب نے نبض پر انگلیاں رکھیں اور سوچ میں ڈوب گئے۔ پھر وہ سر ہلاتے ہوئے مہ پارہ سے مخاطب ہوئے۔

”کیوں بھئی......! بھوک نہیں لگتی؟“

”جی نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”دل پریشان رہتا ہے؟“

محترم انور احسن صدیقی کے قلم سے بہترین کتاب
رقصاں سرِ بازار
قیمت 150 روپے
ہمارے معاشرے کی ناہمواریوں اور ناانصافیوں پر مبنی سچی کہانیاں۔
سماجی جبر کا شکار ان مظلوم عورتوں کی کہانیاں جن کی آنکھیں آنسو نہیں لہو روتی ہیں۔

’’جی ہاں۔‘‘

’’گم صم سی، کھوئی کھوئی سی رہتی ہو؟‘‘

’’جی ہاں......‘‘

’’کمرے کی چھت کو آسمان بنا کر تارے گنتی ہو؟‘‘

’’جج......جی......جی ہاں۔‘‘

’’شاعری کرنے کو اور پڑھنے کو جی چاہتا ہے؟‘‘

’’جی ہاں......‘‘

حکیم صاحب نے اس کی نبض چھوڑ دی اور تاسف بھرے لہجے میں بولے۔

’’خطرناک مرض......بہت خطرناک مرض۔‘‘

برکت صاحب بھونچکے رہ گئے۔ ’’کیا ہوا ہے میری بچی کو حکیم صاحب؟‘‘

’’اسے......اسے لوریا ہو گیا ہے۔‘‘ حکیم صاحب نے انکشاف کیا۔

’’لوریا......!‘‘ برکت صاحب نے حیرت سے دہرایا۔ ’’یہ کون سا مرض ہے؟‘‘

’’بہت خطرناک مرض ہے۔ اس کی ابتدائی علامات یہی ہیں۔ رات رات بھر ہو جاتی ہے، کروٹیں بدلتے ہوئے، اس کا درد بہت تڑپاتا ہے۔‘‘

’’اوہ......تو پھر حکیم صاحب اس کا علاج بتائیں؟‘‘ برکت صاحب پریشان ہو گئے۔

’’علاج......!‘‘ حکیم صاحب چونکے۔ پھر انہوں نے ایک ہاتھ سے میز پر طبلہ بجایا اور دوسرا ہاتھ کان پر رکھ کر سریلے انداز میں گانے لگے۔

’’خوب کرتے ہیں یہ بیمار محبت کا علاج،
درد بڑھتا ہی رہے، ایسی دوا دیتے ہیں۔‘‘

’’حکیم صاحب......حکیم صاحب۔‘‘ برکت صاحب نے انہیں ٹوکا۔ ’’میں نے دوا کے متعلق پوچھا تھا۔‘‘

’’طلعت محمود صاحب کی کیا بات تھی، خوب ہی گاتے تھے، موتی چنتے تھے، موتی......ارے ہاں......تم کچھ کہہ رہے تھے؟‘‘ آخری جملہ انہوں نے چونک کر کہا تھا۔

برکت صاحب نے اپنا سوال دہرایا۔

’’ویسے تو یہ مرض لاعلاج ہے۔‘‘ حکیم صاحب نے ماہرانہ رائے دی۔ ’’لیکن شادی سے کسی قدر افاقہ ہو سکتا ہے۔‘‘

’’شادی......؟‘‘

’’ہاں......شادی۔ اس لڑکی کی شادی کر دو۔ اس مرض کے جراثیم آپ ہی آپ ہلاک ہو جائیں گے۔ شادی ہی دوا ہے، شادی ہی علاج ہے۔ بس......اب جاؤ۔‘‘

یہ کہہ کر حکیم صاحب نے دوبارہ میز کو طبلہ بنا لیا۔ اب وہ ان دونوں سے قطعی لاتعلق دکھائی دے رہے تھے۔

☆......☆......☆

کاغذی قیامت

ہماری دنیا میں ایک ایسا کاغذ بھی موجود ہے جس کے گرد اس وقت پوری دنیا گھوم رہی ہے۔ اس کاغذ نے پوری دنیا کو پاگل بنا رکھا ہے۔ دیوانہ کر رکھا ہے۔ اس کاغذ کے لئے قتل ہوتے ہیں۔ عزتیں نیلام ہوتی ہیں۔ معصوم بچے دودھ کی ایک ایک بوند کو ترستے ہیں۔ اور یہ کاغذ ہے کرنسی نوٹ...... یہ ایسا کاغذ ہے جس پر حکومت کے اعتماد کی مہر لگی ہے۔ لیکن اگر یہ اعتماد ختم ہو جائے یا کر دیا جائے تو پھر کیا ہوگا؟ اس کاغذ کی اہمیت یکلخت ختم ہو جائیگی اور یقین کیجئے پھر کاغذی قیامت برپا ہو جائے گی۔ جی ہاں! کاغذی قیامت......

اور اس بار مجرموں نے اس اعتماد کو ختم کرنے کا مشن اپنا لیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کاغذی قیامت پوری دنیا پر برپا ہو گئی۔ اس قیامت نے کیا کیا رخ اختیار کیا۔ پوری دنیا کی حکومتوں اور افراد کا کیا حشر ہوا؟ اسے روکنے کے لئے کیا کیا حربے اختیار کیے گئے۔ کیا مجرم اپنے اس خوفناک مشن میں کامیاب ہو گئے......یا......؟

اس کہانی کی ہر ہر سطر میں خوفناک ایکشن اور اس کے لفظ لفظ میں اعصاب شکن سسپنس موجود ہے۔ یہ ایک ایسی کہانی ہے جو یقیناً اس سے پہلے صفحہ قرطاس پر نہیں ابھری۔ اس کہانی کا پلاٹ اس قدر منفرد ہے کہ پہلے دنیا بھر کے جاسوسی ادب میں کہیں نظر نہیں آیا۔ عمران اور پاکیشیا سیکرٹ سروس نے اس کہانی میں کیا کردار ادا کیا ہے جہاں دنیا بھر کی حکومتیں اور سیکرٹ سروسز خوف و دہشت سے کانپ رہی ہوں جہاں موت کے بھیانک جبڑوں نے دنیا میں بسنے والے ہر فرد کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہو وہاں عمران اور سیکرٹ سروس کے جیالوں نے کیا رنگ دکھائے۔ یہ عمران کی زندگی کا وہ لافانی اور ناقابل فراموش کارنامہ ہے کہ جس پر آج بھی عمران کو فخر ہے اور کیوں نہ ہو، یہ کارنامہ ہے ہی ایسا......

کاغذی قیامت کتاب گھر کے **جاسوسی ناول سیکشن** میں دیکھا جا سکتا ہے۔

بوقاف، اس وقت اپنے بہترین دوست مالوط کے پاس بیٹھا ہوا، اسے اپنے عشق کی داستان سنا رہا تھا۔ مالوط اس کا ہم عمر اور ہم عصر تھا۔ اس کے ماں باپ اس کے بچپن میں ہی انتقال کر گئے تھے۔ تب سے وہ اپنے دادا کی سرپرستی میں تھا۔ اس پر کسی قسم کی پابندی نہیں تھی، اس لئے وہ من موجی جن تھا۔ اس کی زندگی کا زیادہ تر حصہ گھومنے پھرنے میں گزرا تھا، آزاد منش تھا، لیکن دوستی کے لئے جان بھی دے سکتا تھا۔

مالوط نے بڑے غور اور دلچسپی سے بوقاف کی کہانی سنی، بوقاف کے پروں کا حال دیکھ کر اس نے دکھ اور افسوس کا اظہار بھی کیا تھا۔ “اس کا مطلب یہ ہے کہ خالہ اور خالو اس وقت بہت غصے میں تھے۔” پوری کہانی سننے کے بعد مالوط نے اظہار خیال کیا۔ وہ بوقاف کے والدین کو خالہ اور خالو ہی کہتا تھا۔

“ہاں یار…… بس مت پوچھو۔” بوقاف نے ٹھنڈی سانس بھری اور خلا میں گھورنے لگا۔

“اب تمہارے کیا ارادے ہیں؟” مالوط نے پوچھا۔

“اس کی محبت میری رگوں میں دوڑ رہی ہے۔ میں اتنی لڑکیوں پر رہا، لیکن کوئی بھی دل کو نہ بھائی۔ بس میرے دوست وہی دل میں آ کر اپنا گھر کر گئی ہے۔ میرا بس نہیں چل رہا ورنہ میں ابھی اڑ کر جاؤں اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال دوں، اسے اپنی محبت کی آغوش میں لے لوں۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ وہ بھی میری طرح بے چین ہے اور میرا انتظار کر رہی ہوگی۔”

“اوہو…… ابھی سے اتنے دعوے؟” مالوط مسکرایا۔

“ابھی سے کیا میرے دوست؟ محبت کے لئے تو بس ایک لمحہ کافی ہوتا ہے۔ صرف ایک لمحہ……” بوقاف جذباتی لہجے میں بولا۔

“کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ وہ بھی تم سے محبت کرنے لگی ہے؟” مالوط نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

“آنکھیں کبھی دھوکا نہیں دیتیں، ان آنکھوں میں، میں نے محبت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر دیکھا ہے، جس کی موجیں صرف میرے لئے ہیں…… صرف میرے لئے…… ان موجوں پر وفا کے چمکتے ہوئے سورج کی کرنوں سے جو نام لکھا ہوا ہے، وہ میرا نام ہے۔” بوقاف جذباتی انداز میں بولتا چلا گیا۔

“تم تو بہت سنجیدہ دکھائی دے رہے ہو بوقاف……؟” مالوط کے انداز میں تشویش تھی۔ “میں جو کچھ اب کہوں گا…… تم شاید برا مان جاؤ، لیکن دوستی کی خاطر میں تمہیں حقیقت سے آگاہ ضرور کروں گا۔”

“کہو…… کیا کہنا چاہتے ہو؟” بوقاف نے پوچھا۔

“میں یہ کہنا چاہتا ہوں میرے دوست……!” مالوط نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ “انسان میں وفا نہیں ہوتی۔ تمام مخلوقات میں یہ سب سے زیادہ خطرناک مخلوق ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں ایک طرح سے تن تنہا جن ہوں…… میں انسانوں کی بستیوں میں بہت وقت گزاری کر چکا ہوں اور میں نے یہ تجزیہ کیا ہے کہ انسان دھوکے باز ہے، مکار ہے، فریبی ہے…… تم شاید یقین نہ کرو……، لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ انسان لوگ دولت کی ہوس میں اپنے سگے رشتہ داروں کو بھی جان سے مار ڈالتے ہیں۔ بیٹا اپنے باپ پر ہاتھ اٹھا لیتا ہے، بیٹی ماں سے زبان درازی کرتی ہے اور بیوی اپنے شوہر

پر رعب جماتی ہے۔ اس مخلوق کے جتنے بھی رنگ ہیں، چند کو ہٹا کر سارے ہی بھیانک ہیں۔'' مالوط نے سنجیدہ انداز میں چھوٹی سی تقریر کر ڈالی۔

''تم تو مجھے ڈرائے دے رہے ہو۔'' بوقاف کی مسکراہٹ بے جان سی تھی۔

''میں تمہیں حقیقت سے آگاہ کر رہا ہوں۔ تم یقین کرو کہ ہماری جنیاں بہت اچھی ہیں، تم انسانوں کی لڑکیوں کا حال تو دیکھو...... سارا دن نہ جانے کیا کیا الا بلا اپنے چہرے اور ہاتھوں پر تھوپتی رہتی ہیں۔ نہ کسی کام کی، نہ کاج کی...... اگر ماں نے کوئی کام کہہ دیا تو ان کا منہ بن گیا۔ مہینے بھر کا ان کے صرف چہرے کا خرچہ ہزاروں روپے کا ہوتا ہے، باقی جسم تو علیحدہ ہے۔ اسی لئے وہ لوگ زیادہ حسین بھی لگتی ہیں، اور تمہارے جیسے کئی جن ان کے عاشق ہو جاتے ہیں۔ ہماری جنیاں ان کے مقابلے میں مانا...... کہ کم خوب صورت ہیں، لیکن یہ تو دیکھو کہ کس طرح بے چاری سارا دن کام کاج میں لگی رہتی ہیں۔ تو پھر...... خوب صورت کون ہوا؟ کام کرنے والا یا کام چور؟ بتاؤ......؟'' مالوط نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو مالوط......! لیکن میں کیا کروں......؟ میرا دل میرے قابو میں نہیں ہے۔ ہر پل اس کی یاد میرے سینے پر کسی تھکے ماندے مسافر کی طرح دستک دے رہی ہے۔'' بوقاف کے لہجے میں بے چارگی کا عنصر شامل تھا۔

''ابھی تمہاری سمجھ میں میری کوئی بات نہیں آئے گی، کیونکہ عشق کا بھوت تمہارے سر پر سوار ہے۔'' مالوط کی مسکراہٹ پھیکی سی تھی۔ ''لیکن میرے دوست......! ایک وقت آئے گا، جب تمہیں میری باتیں یاد آئیں گی، اور تمہیں افسوس ہوگا کہ کاش میں نے مالوط کی بات مان لی ہوتی۔ خیر...... وہ تو بعد کی بات ہے۔ فی الحال تو یہ بتاؤ کہ کیا میں اس سلسلے میں تمہارے کسی کام آ سکتا ہوں؟ اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو میں حاضر ہوں۔''

''شکریہ دوست......!'' بوقاف کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''میرا...... بس ایک کام کر دو۔ یہ مجھ پر ایک احسان ہوگا۔''

''دوستی میں کوئی احسان نہیں ہوتا۔ صرف دوست کی خدمت ہوتی ہے، تم بتاؤ...... میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''مجھے صرف ایک بار میری محبوبہ سے ملوا دو...... صرف ایک بار، میں اس سے مل کر پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا وہ بھی میرے لئے تڑپ رہی ہے؟ وہ بھی میری طرح ہے کہ نہیں؟ اسے بھی نیند آتی ہے کہ نہیں؟ وہ بھی تارے گنتی ہے کہ نہیں؟ اس کی بھی بھوک اڑی ہے کہ نہیں......؟ مجھے اس سے بہت کچھ پوچھنا ہے، بس ایک بار مجھے اس سے کسی طرح ملوا دو۔'' بوقاف نے التجا کی۔

''تو تم...... اس سے ملنا چاہتے ہو؟''

''ہاں...... اس سے ملے بغیر میری زندگی ایسی ہے، جیسے جسم بغیر سانسوں کے۔'' بوقاف نے کہا۔

''اچھا...... تو پھر میں کچھ سوچتا ہوں۔'' مالوط یہ کہہ کر واقعی سوچ میں ڈوب گیا۔

''اور ہاں...... اس بات کا خیال رہے کہ کسی کے علم میں یہ بات ہرگز نہ آئے، ورنہ میری کھال اتار دی جائے گی۔'' بوقاف نے یاد دہانی کروائی۔

''ہاں...... ہاں...... تم اس بات کی فکر مت کرو، میں جانتا ہوں۔'' مالوط نے چونک کر سر ہلایا اور پھر دوبارہ سوچ میں ڈوب گیا۔

بوقاف حسرت بھری نگاہ سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر اسی عالم میں گزر گئی۔ آخر کار مالوط نے سر اٹھایا، اس کی آنکھوں میں ایک معنی خیز

چمک تھی۔ ''ایک ترکیب آئی ہے میرے ذہن میں...... اگرچہ اس میں مجھے بھی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے، لیکن دیکھا جائے گا۔ نمٹ لیں گے اس سے بھی۔'' مالوط نے کہا۔

''کیا ترکیب ہے؟'' بوقاف جلدی سے بولا۔

''پہلے تو مجھے کبوتر کا روپ دھارنا پڑے گا، اور پھر گدھے کا۔'' مالوط نے سنجیدگی سے کہا۔

''بھلا یہ کیا ترکیب ہوئی؟'' بوقاف کا منہ بن گیا۔

''اس سے بہتر اور کوئی ترکیب ہو ہی نہیں سکتی۔'' مالوط نے سر ہلایا۔

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے......؟'' بوقاف نے اسے ترچھی نگاہ سے دیکھا۔

''بالکل ٹھیک ہے۔'' وہ فوراً بولا۔ ''کیونکہ ابھی مجھے کسی سے محبت نہیں ہوئی۔''

''مذاق اڑا رہے ہو میرا......؟''

''نہیں دوست...... انسانوں میں رہ کر کسی کے منہ سے ایک جملہ سنا تھا، وہی دہرا رہا ہوں۔''

''کیا جملہ تھا وہ......؟''

''عشق کہتے ہیں جسے، خلل ہے دماغ کا۔'' مالوط مسکرا کر بولا۔

''اوہ......'' بوقاف کے منہ سے نکلا۔ ''لیکن اس کا مطلب کیا ہوا؟''

''معلوم نہیں۔'' مالوط نے کندھے اچکائے۔

''خیر...... ہاں...... وہ ترکیب تو درمیان میں ہی رہ گئی۔'' بوقاف نے یاد دلایا۔

''کبوتر اور گدھے والی......؟'' مالوط نے مسکرا کر پوچھا۔

''ہاں...... وہی......'' بوقاف نے ہونقوں کی طرح گردن ہلائی۔

''بتا دوں گا......'' مالوط نے گردن ہلائی۔ ''پہلے تم مجھے ایک بات بتاؤ۔''

''ہاں...... ہاں۔ پوچھو......؟'' بوقاف نے کہا۔

''ذرا سوچ سمجھ کر جواب دینا......'' مالوط کا انداز ڈرامائی تھا۔

''تم پوچھو تو......!'' وہ بے چین ہو گیا۔

''یہ بتاؤ کہ آگ اور مٹی کا ملاپ ممکن ہے؟'' مالوط نے سوال کیا۔

بوقاف نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

چند لمحے خاموشی رہی، بوقاف اس دوران مالوط کو ٹکر ٹکر دیکھتا رہا، مالوط نے گھبرا کر کہا۔ ''کیا تم ناراض ہو گئے؟ میری بات تمہیں بری لگی؟''

''نہیں مالوط......ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' بوقاف کے ہونٹوں پر بجھی بجھی سی مسکراہٹ عود کر آئی۔

''تو پھر......تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا......''

''تمہاری......بات......کا جواب......ہاں......جواب یہ ہے کہ ملاپ تو واقعی ممکن نہیں ہے، مگر ہوگا کیا......؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہ مٹی کو آگ پر ڈال دیا گیا تو آگ بجھ جائے گی، بس......اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے؟'' بوقاف نے پرسکون انداز میں کہا۔

''آگ بجھے گی کیوں......؟ آگ تو جلا دیتی ہے۔'' مالوط نے بتایا۔

''جلانے کے لئے آگ کو خود بھی تو جلنا پڑتا ہے میرے دوست، یہ بات کیوں بھول رہے ہو؟'' بوقاف مسکرایا۔

مالوط خاموش ہو گیا۔ ایک ٹھنڈی سانس ضرور بھری تھی۔ ''ہاں......تم ترکیب بتا رہے تھے؟'' بوقاف نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔

''کبوتر اور گدھے والی......؟'' مالوط ہنسا۔

''ہاں......معلوم تو ہو کہ کبوتر کون ہے اور گدھا کون ہے؟''

''دونوں میں ہی ہوں......'' مالوط نے سر ہلایا۔ ''سب سے پہلے مجھے کبوتر بن کر تمہارا پیغام اس لڑکی تک پہنچانا پڑے گا، تاکہ وہ بروقت اپنی چھت پر آ جائے اور پھر چونکہ تمہارے پر کٹ چکے ہیں، اس لئے تمہیں اپنے اوپر سوار کر کے اس کی چھت پر لے جانا پڑے گا۔ اس طرح ہو گی تم دونوں کی ملاقات۔ آئی عقل میں؟''

''زندہ باد......مالوط......زندہ باد۔'' بوقاف کی آنکھیں چمک اٹھیں اور وہ جوش سے بولا۔

''ارے......ارے......'' مالوط گھبرا گیا۔ ''میں انسانوں کا سیاسی لیڈر ہرگز نہیں ہوں، جو تم اس طرح نعرے لگا رہے ہو۔''

بوقاف ہنس پڑا۔ وہ کافی حد تک خوش گوار موڈ میں آ چکا تھا۔ ''اور اب تم جلدی سے اپنی محبوبہ کے نام ایک محبت نامہ لکھ دو، تاکہ میں وہ اس تک پہنچا دوں اور ہاں......ملنے کا وقت بھی لکھ دینا۔'' مالوط نے کہا۔

''محبت نامہ......؟ وہ کیسے لکھتے ہیں؟'' مالوط نے حیرت سے پوچھا۔

''اوہو......'' مالوط جھنجھلایا۔ ''کیسے عاشق ہو......؟ انسانوں میں محبت کی شروعات ہی محبت نامے سے ہوتی ہے۔ شروع شروع میں یہی چلتا ہے، بعد میں محبوب اور محبوبہ دونوں ہی چغد ہو جاتے ہیں۔''

''مگر میں کیا لکھوں؟'' بوقاف اب بھی الجھن میں تھا۔

''بتا دوں گا......دو چار فضول قسم کے شعر بھی ٹھونکنے ہوں گے۔ وہ بھی حد درجے ضروری ہوتے ہیں۔'' مالوط نے بتایا۔ پھر وہ چونکا۔ ''ارے ہاں......تم نے اپنی محبوبہ کا پتا تو بتایا ہی نہیں......!''

☆......☆......☆

برکت صاحب نے اپنی بیگم کو حکیم طولانی کی ''رپورٹ'' سے آگاہ کر دیا۔

مہ پارہ اپنے کمرے کا رخ کر چکی تھی، گل بانو منہ پھاڑے اپنے میاں کی شکل ہی دیکھتی رہ گئیں۔ پھر ان کے منہ سے نکلا۔ ''کیا بالکل ہی دماغ خراب ہو گیا ہے؟''

''میرا......؟'' برکت صاحب نے آنکھیں نکالیں۔

''جی نہیں......'' وہ تڑ سے بولیں۔ ''ان طبلہ نواز حکیم کا......''

''ان کا بھی ٹھیک ہے۔'' برکت صاحب نے سر ہلا کر بتایا۔ ''نہ تو ان کے بال کھچڑی تھے، نہ لباس میلا کچیلا تھا اور نہ ہی منہ سے کف بہہ رہا تھا۔''

''توبہ ہے آپ سے بھی۔'' وہ جھنجھلا گئیں۔ ''پاگلوں کا پورا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا۔ میں تو محاورتاً کہہ رہی تھی۔''

''اچھا چھوڑیئے......اور مہ پارہ کے بارے میں سنجیدگی سے غور کیجئے۔ اگر اس کی بیماری کا علاج واقعی شادی ہے تو جلدی سے کسی لڑکے کا انتظام کیجئے۔ دیر کرنا نامناسب ہے۔'' ان کے لہجے میں تشویش تھی۔

''تم ٹھیک کہتی ہو......اچھا...... یہ بتاؤ......لڑکا ڈیکوریشن کی دکان پر مل جائے گا؟''

''آپ نے پھر مذاق میں بات ٹالی......؟'' گل بانو نے نگاہ ترچھی کی۔

''اچھا......اچھا...... ناراض مت ہو۔'' وہ بولے۔ ''میں کچھ کرتا ہوں اور ہاں ...... یہ بتا دوں کہ میں خاندان میں ہرگز بات نہیں چلاؤں گا۔''

''کیوں......؟''

''خاندان میں کون شادی کرتا ہے......؟'' جس کے منہ سے سنو، وہ یہی کہتا ہے کہ غیروں میں شادی کریں گے۔ پھر میں کیوں اپنوں میں کروں؟'' برکت صاحب نے اکڑ کر کہا۔

''یہ آپ طنز کر رہے ہیں؟''

''نہیں......بات یہ ہے کہ خاندان میں سب کے عیب معلوم ہوتے ہیں اور غیروں میں عیب شادی کے بعد کھلتے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں......شہر میں میرے کئی جاننے والے ہیں، میں ان سے تذکرہ کروں گا۔ ماشاءاللہ سے ہماری لڑکی لاکھوں میں ایک ہے۔ کوئی نہ کوئی ہونہار لڑکا مل ہی جائے گا۔''

''تو پھر جلدی سے اس مہم پر نکل جائیں۔'' وہ بے تابی کے عالم میں بولیں۔

''چھری کے نیچے دم لو ذرا......اپنی بیٹی سے بھی معلوم کر لو۔'' برکت صاحب نے مشورہ دیا۔

''اس سے بعد میں پوچھ لیا جائے گا۔ آپ کام تو شروع کریں۔''

''ہوں......'' برکت صاحب نے پر خیال انداز میں سر ہلا دیا۔

☆......☆......☆

محلے والوں کو جلد ہی یقین آ گیا کہ گاگے شاہ نے آسیب کو قصبے سے مار بھگایا ہے۔ دراصل ایسے ہی اندازہ ہو رہا تھا۔ پہلے تو ایک سوگوار سی فضا قائم رہا کرتی تھی، لیکن اب کچھ دنوں سے یہاں رونق سی آ گئی تھی۔ در و دیوار بھی سکون کا سانس لیتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

سب ہی خوش تھے، اور گاگے شاہ و برکت صاحب کو ڈھیروں دعائیں دے رہے تھے۔ برکت صاحب گھر سے باہر نکلتے تو لوگ پہلے کی نسبت اور بھی زیادہ عزت کرتے۔

صرف چچا تندوری کو خونی بلا شمولا کے بھاگ جانے کا افسوس تھا، ان کی حسرت ہی رہ گئی کہ وہ بلا کو "طبیعت سے کوٹتے" بالوں سے پکڑ کر "منجائی" کرتے اور...... اور بھی بہت کچھ کر گزرتے، مگر افسوس......!

حکیم طولانی کی نظم ابھی تک "زیر تعمیر" تھی، انہوں نے تہیہ کیا تھا کہ جس دن بھی غزل مکمل ہوئی، وہ اپنے گھر پر باقاعدہ مشاعرہ کروائیں گے، جس میں مہمان خصوصی گاگے شاہ ہوں گے۔ وہ جلد ہی یہ محفل سجانے والے تھے۔

ادھر ایک بار پھر قصبے کی رونق بحال ہونے سے شبن خیراتی کی چاندی ہو گئی تھی۔ خیراتی ہوٹل میں رات گئے تک محفلیں سجتیں، خوب چائے پانی کا دور چلتا اور کاؤنٹر کے قریب لگے ہوئے اسپیکروں سے پرانے انڈین گانے گونجتے رہتے۔ مکھیوں کی بھنبھناہٹ کا سا سماں رہتا اور اب واقعی قصبہ نورس اپنی پرانی جون پر آ گیا تھا۔ وہی قصبہ نورس، جہاں زندگی اپنے خوب صورت رنگوں میں وقت کی ڈال پر مہکتی تھی، تازہ گلاب کی طرح......!

☆......☆......☆

بہت خوب صورت تھا وہ کبوتر...... اتفاقاً ہی مہ پارہ کی نظر اس پر پڑ گئی تھی۔ وہ نیم کے درخت کے پاس نہ جانے کب سے منڈلا رہا تھا۔ مہ پارہ اس وقت گل بانو کے ساتھ صحن میں بیٹھی ہوئی تھی، گل بانو دوپہر کے کھانے کی تیاری کے لئے دال بین رہی تھیں۔

اچانک ہی گل بانو نے مہ پارہ کو تھال تھمایا اور یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "لو...... مہ پارہ...... ذرا دال کا کچرا نکالنا...... میں ذرا چاول دیکھ آؤں...... ارے...... کچھ کام کیا کرو، ہر وقت منہ لٹکائے بیٹھی رہتی ہو۔"

یہ کہہ کر گل بانو چلی گئیں۔ مہ پارہ کا لٹکا ہوا منہ، کچھ اور لٹک گیا۔ گل بانو کے جاتے ہی ایک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ "غٹرغوں...... غٹرغوں......"

اس نے چونک کر اوپر دیکھا، اور دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ کسی عمدہ نسل کا کبوتر تھا وہ......! مہ پارہ نے اپنی زندگی میں ایسا کبوتر نہیں دیکھا تھا۔ جیسے ہی مہ پارہ اس کی طرف متوجہ ہوئی، وہ اپنے پر پھڑپھڑاتا ہوا اس کے قریب آیا، مہ پارہ نے دیکھا، اس کے سر پر دو چھوٹے چھوٹے سینگ بھی تھے۔

اس سے قبل کہ وہ حیران ہوتی، کبوتر نے بجلی کی سرعت سے اپنا ایک پنجہ کھول دیا۔ فوراً ہی ایک چھوٹا سا رول نما کاغذ مہ پارہ کی گود میں آ گرا۔ وہ اچھل پڑی، پھر بے ساختہ کبوتر کی طرف دیکھا، کبوتر نے گویا گردن ہلائی اور اپنے پروں کو پھڑپھڑا کر تیزی سے اڑ گیا۔ چند ہی لمحوں میں وہ فضا میں غائب ہو چکا تھا۔

مہ پارہ گم صم سی رہ گئی، کبھی وہ آسمان کی طرف دیکھتی اور کبھی اس کاغذ کی طرف۔ دل کی ایک عجیب سی کیفیت تھی، شاید دھڑکنیں بے ترتیب

ہوگئی تھیں۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے کاغذ اٹھالیا۔

اسے کھول کر دیکھا تو حالت اور بھی غیر ہوگئی۔ اسی وقت باورچی خانے سے کھٹ پھٹ کی آوازیں آئیں۔ مہ پارہ نے جلدی سے خود کو سنبھالا۔ ماتھے سے پسینہ پونچھا اور کاغذ کو موڑ کر کپڑوں میں چھپالیا۔

اب اس نے تھال اٹھایا اور دال میں سے کنکر نکالنے لگی۔ وہ کن اکھیوں سے باورچی خانے کی طرف بھی دیکھ رہی تھی۔ اس کے دل و دماغ میں بھونچال سا آرہا تھا۔

اسی وقت گل بانو نمودار ہوئیں۔ مہ پارہ نے خاموشی سے انہیں تھال پکڑایا اور جلدی سے اٹھ کر کمرے کی طرف لپکی۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے ایک طویل سانس لی۔ دروازہ بند کیا اور کاغذ نکال کر کھولا۔ چند عشقیہ اشعار کے بعد لکھا تھا۔

''تمہارا نام تو مجھے معلوم نہیں ہے، البتہ مجھے یقین ہے کہ وہ بھی خود تمہاری طرح خوب صورت ہوگا۔ میں تم سے ملنے کے لئے شدید بے تاب ہوں۔ میرے پر تو کٹ چکے ہیں، اسی لئے اپنے ایک دوست کے ذریعے یہ خط بھجوا رہا ہوں۔ اگر تم بھی میری طرح بے چین ہو تو جمعہ کی رات کو ٹھیک 2 بجے اپنی چھت پر میرا انتظار کرنا۔ میں تم سے ملنے آؤں گا۔

فقط۔ تمہارا اور صرف تمہارا بوقاف

☆......☆......☆

دوسرے دن برکت صاحب شہر سے واپس لوٹے تو ان کا چہرہ مسرت اور طمانیت سے کھلا پڑ رہا تھا۔ گل بانو سے رہا نہ گیا۔ ''بہت خوش دکھائی دے رہے ہیں آپ؟ خدانخواستہ بیٹی کے بجائے اپنا رشتہ تو لگا کر نہیں آگئے؟''

''لاحول ولاقوۃ بیگم......!'' وہ جھینپ گئے۔ ''تم اس قدر صاف گوئی سے کام لیتی ہو کہ بس......''

''ارے......تو کیا واقعی......؟'' وہ چونک گئیں۔

''مذاق کر رہا تھا۔'' وہ ہنسے۔ ''مومن وہی ہے، جسے سانپ صرف ایک بار ڈسے۔ اب کبھی بھول کر بھی میں دوبارہ یہ حماقت نہیں کر سکتا۔ ہاں تو......میں اس لئے خوش ہوں کہ میں اشرف الدین سے مہ پارہ کی بات کر آیا ہوں۔''

''ایں......'' وہ چونکیں۔ ''آپ تو کل کسی سلیم کی بات کر رہے تھے؟''

''اوہو......اشرف الدین اس کے باپ ہیں۔''

''اچھا......'' گل بانو نے سر ہلایا۔ ''میں سمجھی کہ......''

''بس......بس۔'' وہ ہاتھ اٹھا کر بولے۔ ''اپنی سمجھ دانی باورچی خانے تک ہی محدود رکھو تو اچھا ہے۔''

''انہوں نے کہا کیا......؟'' وہ بے تاب تھیں۔

''بس......قسمت کی بات کہہ لو۔ جوڑے واقعی آسمانوں پر بنتے ہیں۔ وہ خود بھی اپنے لڑکے کے لئے کسی مناسب رشتے کے خواہاں تھے،

میں نے مہ پارہ کا تذکرہ کیا تو انہوں نے فوراً ہی مہ پارہ کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اب وہ لوگ اتوار کو ہمارے گھر آئیں گے۔''

برکت صاحب نے تفصیل بتائی۔

''اوہ......آج بدھ ہے......یعنی چار دن بعد......''

''ہاں......کافی وقت ہے۔ کل سے ہی گھر کی صفائی ستھرائی وغیرہ کا کام شروع کر دو۔ مہ پارہ کو بھی لگاؤ اپنے ساتھ......''

''لیکن یہ تو بتایئے کہ لڑکا کرتا کیا ہے؟''

''سپر مارکیٹ میں کپڑے کی دکان ہے اس کی......اور کیا چاہئے......؟ سیدھا سادا سا کاروباری ذہن کا مالک ہے وہ لڑکا۔ دکان سے گھر اور گھر سے دکان۔ یہی ہے اس کی مصروفیت۔ اللہ نے چاہا تو مہ پارہ ٹھاٹ سے رہے گی۔''

''انشاءاللہ......'' گل بانو کے منہ سے نکلا۔

''اور ہاں......پھر کہے دیتا ہوں، مہ پارہ کو آگاہ کر دو، یہ ضروری ہے۔ تم سمجھ نہیں رہی ہو۔''

''اچھا......میں بتا دوں گی۔'' انہوں نے حامی بھر لی۔

برکت صاحب سے فراغت ملی تو گل بانو مہ پارہ کے پاس جا پہنچیں۔ وہ اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی شاعری کی کتاب پڑھ رہی تھی۔ گل بانو کو دیکھ کر اٹھ بیٹھی۔ مہ پارہ کے چہرے پر اس وقت کھلے گلاب جیسی تازگی تھی۔ کافی خوش دکھائی دے رہی تھی وہ......!

''کتاب میں لطیفے لکھے ہوئے ہیں؟'' گل بانو نے اسے غور سے دیکھا۔

''نن......نہیں امی جان۔'' وہ گڑبڑا گئی اور فوراً ہی کتاب پلنگ پر رکھ دی۔

''مجھے تو ایسا ہی لگ رہا ہے۔ بہت خوش دکھائی دے رہی ہو۔''

''بس ایسے ہی امی جان۔'' وہ خواہ مخواہ ہنس پڑی۔ انہیں بتاتی بھی کیا۔ دل میں امڈنے والی مسرتیں تو چھپا کر رکھنی تھیں۔

''اچھا......!'' گل بانو نے ایک طویل سانس لی۔ ''اچھی بات ہے۔ اسی طرح خوش رہا کرو۔''

''جی......امی......'' وہ سر جھکا کر بولی۔

گل بانو نے غور سے اس کا جائزہ لیا۔ پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑے چاؤ سے بولیں۔ ''مہ......پارہ......! مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔''

''جی امی......کہیئے۔''

''دراصل......بات یہ ہے کہ......اب تمہاری شادی ہو جانی چاہئے۔ تمہارے ابو نے ایک جگہ تمہاری بات ڈالی ہے، اور وہ لوگ تمہیں دیکھنے کے لئے اتوار کو ہمارے یہاں آئیں گے۔''

''جی......؟'' مہ پارہ بھونچکی رہ گئی۔ اس کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ کسی زہر آلود خنجر کی طرح یہ الفاظ اس کے کانوں سے ٹکرائے اور دل میں اتر گئے۔

''تمہارے ابو کے دوست کا لڑکا ہے وہ...... ان کا دیکھا بھالا بھی ہے۔ بہت اچھے لوگ ہیں۔ تم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ لینا، تاکہ تمہارے دل میں بھی کوئی گلہ شکوہ نہ رہے۔ یاد رکھو......! ماں باپ ہمیشہ اپنی اولاد کے لئے بہتر اور فائدہ مند فیصلہ کرتے ہیں۔'' گل بانو نے پھر کہا۔

مگر سن کون رہا تھا......؟ مہ پارہ کا ذہن تو گویا آندھیوں کی زد میں تھا۔ وہ دل ہی دل میں چیخ رہی تھی۔ ''بوقاف......! بوقاف......! کہاں ہو تم......؟ جلدی آؤ...... ہماری محبت کی دنیا لٹ رہی ہے۔ وفاؤں کا تاج محل ریزہ ریزہ ہونے کو ہے۔ اسے بچالو...... آجاؤ......!''

☆......☆......☆

بوقاف ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ نہ جانے وہ کس قسم کا خواب تھا، جس نے اسے نیند سے جھنجھوڑ دیا تھا، اسے یاد نہ آسکا۔ ویسے بھی وہ بے وقت سویا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ گم صم سی کیفیت میں رہا۔ دل کی عجیب سی حالت تھی۔ نہ جانے کیوں اسے اپنی ''انسانی محبوبہ'' کی یاد بڑی شدت سے ستائی۔ وہ بے تاب ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کی ماں کھانا پکانے میں مصروف تھی۔ روناف بھی کہیں گیا ہوا تھا۔ بوقاف خیمے سے باہر نکل آیا۔ شام ڈھل رہی تھی، اس لئے گلی میں کافی چہل پہل تھی۔ بوقاف نے محسوس کیا کہ دوسرے جن اس سے کنی کترا رہے ہیں، اسے نظر انداز کر رہے ہیں۔ شاید اس کی وجہ وہ داستان تھی، جو ایک انسانی وجود سے وابستہ تھی۔ بوقاف نے ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی کیفیت دیکھی۔ ان آنکھوں میں کئی سوال تھے۔ لیکن بوقاف سے ہم کلام کوئی بھی نہ ہوا تھا۔

بوقاف لاپروائی سے گردن جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔ اب اسے ان لوگوں کی قطعی پرواہ نہیں تھی۔ وہ خیموں کے درمیان سے آگے بڑھ رہا تھا کہ یکدم ہی ایک خیمے کا پردہ ہٹا، اور ایک مسکراتا ہوا نسوانی چہرہ دکھائی دیا۔ ''کیا حال ہیں اجنبی......؟'' اس کا انداز چبھتا ہوا تھا۔ آنکھوں میں ایک عجیب سی ویرانی چھپی ہوئی تھی۔

''میں اجنبی کہاں ہوں گل چیں......؟ میں تو بوقاف ہوں۔'' اس نے کہا۔

گل چیں ہنس دی۔ زخمی سی ہنسی تھی یہ...... ''شکر ہے کہ تمہیں میرا نام یاد ہے۔ ورنہ میرے خیال سے تمہیں بھولنے کی بہت عادت ہے۔ خاص کر اپنوں کو بھول کر تم پرائے لوگوں کو بہت یاد رکھتے ہو...... کیوں......؟''

''اوہ......'' بوقاف نے گردن ہلائی۔ ''تو تم تک بھی خبر پہنچ گئی۔''

''خبر غلط ہے کیا......؟''

''نہیں...... بالکل درست ہے۔''

''اوہ......'' گل چیں کا لہجہ مایوسانہ تھا۔ ''کاش...... غلط ہوتی......''

''کیوں......؟'' بوقاف نے اسے گھورا۔

''تمہارے اس کیوں کا جواب میرے پاس ہے، لیکن میں دوں گی نہیں، کیونکہ بہت ساری باتیں کہی نہیں جاتیں بلکہ محسوس کی جاتی ہیں۔

اگر کبھی...... کسی بھی دن...... تمہیں میرا احساس ہوجائے، تو مجھ تک پہنچنے میں دیر مت لگانا۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔ ہاں...... میں تمہاری منتظر رہوں گی، جب تک زندہ ہوں۔’’ یہ کہہ کر گل جبیں پیچھے ہٹی اور پردہ برابر کر دیا۔

بوقاف ہلتے ہوئے پردے کو تکتا رہ گیا۔

☆......☆......☆

جنوں کا سردار، اپنے عالی شان خیمے میں بیٹھا ہوا مزے سے کوکا کولا پی رہا تھا۔ ہر گھونٹ پر وہ آنکھیں بند کر کے طویل سانس لیتا اور گردن جھٹکنے لگتا۔ اس کی بیوی، سامنے بیٹھی ہوئی برے برے منہ بنا رہی تھی۔ آخر سردار سے رہا نہ گیا، وہ بول اٹھا۔

‘‘کیا تمہارے دانت میں درد ہو رہا ہے؟’’

‘‘جی نہیں......’’ بیوی نے اور بھی برا منہ بنایا۔ ‘‘میں کچھ دنوں سے نوٹ کر رہی ہوں کہ آپ کوکا کولا کچھ زیادہ ہی استعمال کر رہے ہیں اور اپنے یہاں کا شربت خاص پینا بالکل ترک کر دیا ہے۔’’

‘‘مت پوچھو بیگم......’’ سردار نے چسکارا بھرا۔ ‘‘قسم سے...... کیا ذائقہ ہے اس کا...... واہ......’’

‘‘اپنے شربت خاص سے زیادہ اچھا تو نہ ہوگا۔’’

‘‘منہ لگنے کی بات ہے بیگم...... انسان بھی کیا بلا ہے...... کیا چیز ایجاد کی ہے کم بخت نے...... دل بھرتا ہی نہیں ہے، بلکہ کہتا ہے کہ اور......’’ سردار ابھی تک کوک کے نشے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اور پھر اسے ایک زبردست قسم کی ڈکار آئی۔ ساتھ ہی اس کا چہرہ بگڑ گیا۔ جیسے کسی تکلیف میں مبتلا ہو گیا ہو۔

‘‘بس...... یہ خرابی ہے اس میں۔’’ اس نے کراہتے ہوئے بوتل کو دیکھ کر کہا۔ ‘‘یوں لگتا ہے جیسے ناک کے راستے روح پرواز کر گئی ہو...... اف......’’

وہ بوتل کو ایک جانب رکھ کر لمبا لمبا لیٹ گیا، اس کی آنکھیں چھت کی طرف مرکوز تھیں۔ اس کی بیوی نہ جانے کیا کیا بڑبڑاتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اسی وقت خادم اندر داخل ہوا اور سعادت مندی سے ہاتھ باندھ کر بولا۔

‘‘سردار......! آپ سے ملاقات کی غرض سے ایک وفد تشریف لایا ہے۔ اب آپ حکم صادر کریں؟’’

‘‘وہ تو میں بعد میں صادر کروں گا۔’’ سردار نے بھنا کر اٹھتے ہوئے کہا۔ ‘‘پہلے یہ بتاؤ کہ تم بغیر اجازت کیوں خیمے میں داخل ہوتے ہو؟ یاد ہے...... اس دن میں کتنی قابل اعتراض حالت......’’

‘‘مجھے یاد نہیں رہتا سردار......’’ خادم نے خوشامدی انداز میں دانت نکالے۔ ‘‘معاف کر دیں۔’’

‘‘جاؤ...... معاف کیا۔’’ سردار نے ہاتھ اٹھا کر فراخدلی سے کہا۔ ‘‘اب بتاؤ کہ کون آیا ہے؟’’

‘‘آپ سے ملاقات کی غرض سے کچھ لوگوں پر مشتمل ایک وفد آیا ہے۔’’ اس نے دوبارہ بتایا۔

”اوہ......اچھا۔ انہیں مہمان خانے میں بٹھاؤ اور کوکا کولا......مم......میرا مطلب ہے کہ شربت خاص نوش کرواؤ......ہم ابھی آتے ہیں۔“ خادم سر جھکائے ہوئے چلا گیا۔

☆......☆......☆

تھوڑی دیر بعد سردار، مہمان خانے میں داخل ہوا تو پانچ جن اس کے منتظر تھے۔ وہ سردار کے لئے قطعی اجنبی تھے، جہاں تک اسے یاد پڑتا تھا، وہ شاید پہلی مرتبہ ان سے مل رہا تھا۔

سردار کو دیکھتے ہی وہ پانچوں اٹھ کھڑے ہوئے، دعا سلام اور مصافحہ کے بعد وہ سب آرام سے بیٹھے اور پھر سردار کی سوالیہ نگاہوں کے جواب میں وفد کے ایک فرد نے بات چیت شروع کی۔

”آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ہم لوگ آپ کے پاس کیوں آئے ہیں......! جبکہ ہم آپ کے لئے اجنبی ہیں......سب سے پہلے تو آپ کے شربت خاص کی تعریف کروں گا......بہت لذت آمیز اور فرحت بخش تھا۔“

”ہم آپ کی تعریف کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔“ سردار نے باوقار انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

”یہ آپ کی نوازش ہے......“ وہی فرد بولا۔ پھر ذرا سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے گویا ہوا۔ ”اپنی آمد کا مقصد بیان کرنے سے پہلے میں اپنا اور اپنے ساتھیوں کا تعارف کروا دوں......“

یہ کہہ کر وہ اپنے ساتھیوں کی طرف مڑا۔ ”ہم سب الگ الگ قبیلوں سے تعلق رکھتے ہیں، اور کافی دور دراز علاقوں کا سفر کرتے ہوئے آپ کے پاس آئے ہیں۔ ان کا نام طوھار ہے، یہ گاسا ہیں، یہ جروش ہیں......اور ان کا نام ہے اشاق۔“ اپنے ساتھیوں کا تعارف کرانے کے بعد وہ دلکش انداز میں مسکراتے ہوئے پھر سردار کی طرف متوجہ ہوا۔

”اوہ......اچھا۔“ سردار کے منہ سے نکلا۔ ”اور آپ کی تعریف......؟“

”میرا نام قالان ہے......اور میں قبیلہ جُباش سے تعلق رکھتا ہوں۔“ اس نے بتایا۔

”اوہ......“ سردار چونکا۔ ”قبیلہ جُباش تو یہاں سے ہزاروں میل کے فاصلے پر واقع ہے۔“

”جی ہاں......دیکھ لیجئے......مسئلہ ہی کچھ ایسا ہے کہ مجھے آنا پڑا۔“

”آپ بیان جاری رکھیں۔“ سردار نے سر ہلا کر کہا۔

”دراصل بات یہ ہے کہ ہم نے ایک تنظیم کی بنیاد رکھی ہے۔ ہم آپ کو بھی اپنی تنظیم کا رکن بنانا چاہتے ہیں۔ اس تنظیم کا مقصد یہ ہے کہ پوری دنیا میں جتنے بھی مظلوم اور کمزور جن ہیں، ان کی مدد اور ان کے حق کے لئے آواز اٹھائی جائے۔“

”ہوں......“ سردار نے ہنکارا بھرا۔ ”اس تنظیم کا نام کیا ہوگا......؟“

”انجمن برائے انسداد جن گردی۔“ قالان نے بتایا۔ ”یہ تنظیم دراصل انسانوں کے مظالم کے خلاف ہوگی۔ ہم اس میں ”جن بچاؤ مہم“

چلائیں گے......''

''یعنی آپ انسانوں کو ہلاک کریں گے......؟'' سردار چونکا۔

''ہرگز نہیں۔ آپ غلط سمجھے۔'' قالان نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ انسانوں نے ہم لوگوں پر اپنی جو اجارہ داری قائم کر رکھی ہے، اس کا خاتمہ کیا جائے۔ دیکھئے نا......! انسان کتنا فتنہ پرور ہے، وہ ہمارے مظلوم اور کمزور لوگوں کو اپنے قابو میں کر لیتا ہے اور پھر اپنے طابع کر کے ان بے چاروں سے گدھوں کی طرح کام لیتا ہے۔ یہاں تک کہ بار برداری بھی کروائی جاتی ہے۔ کبھی کوئی عمارت اٹھوائی جا رہی ہے۔ کبھی پہاڑ تڑوائے جا رہے ہیں اور کبھی کسی آستانے کی جھاڑو دلوائی جا رہی ہے۔ یہ انسان اتنے چالاک ہوتے ہیں کہ ان کے عامل، جنوں کی نفسیات پڑھ کر ان پر ہاتھ ڈالتے ہیں، اگر جن طاقتور اور دلیر ہوتے ہیں تو یہ لوگ ان پر ہاتھ نہیں ڈالتے اور اگر جن معصوم اور بھولے بھالے ہوں تو انسانوں کے عامل فوراً ہی ان کی گردن ناپ لیتے ہیں۔ کیا یہ ظلم کی انتہا نہیں ہے......؟''

''سراسر ظلم ہے۔'' سردار نے فوراً تائید کی۔

''بس تو پھر آپ بھی اس تنظیم کے ممبر بن جائیے۔'' قالان جوش میں بھر گیا۔

''میں تیار ہوں...... مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' سردار نے پوچھا۔

''بہت خوب......'' قالان خوش ہو گیا۔ ''آپ نے کرنا کچھ بھی نہیں ہے، بس...... صرف اس تنظیم کی پہلی میٹنگ کانفرنس میں شرکت کرنی ہے، جہاں اس موضوع پر سیر حاصل گفتگو ہوگی۔''

''ایں......'' سردار چونکا ''یعنی اب ہم لوگ بھی انسانوں کی طرح کاغذی کارروائیاں کیا کریں گے اور مسئلہ کا حل صفر...... کیوں......؟''

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' قالان جلدی سے بولا۔ ''میٹنگ میں جو بھی فیصلہ ہوگا، اس پر عمل کیا جائے گا''

''اچھا......!'' سردار نے سانس لے کر کہا۔ ''آپ لوگوں کے ارادے بہت نیک اور مقصدیت سے بھرپور ہیں۔ میں بھی آج سے اس تنظیم کا ممبر ہوں۔'' یہ کہہ کر سردار نے بڑی گرمجوشی سے ان سب سے ہاتھ ملایا۔ قالان بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔

''اچھا...... اب یہ بتائیے کہ میٹنگ کب اور کہاں ہوگی؟'' سردار نے پوچھا۔

''ہمالیہ کی ترائی میں...... آج سے ٹھیک ایک ماہ بعد۔'' قالان نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

☆......☆......☆

رات کا ایک بج چکا تھا، لیکن شدید تھکن کے باوجود مہ پارہ کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ وہ تھکن کا شکار اس لئے تھی کہ دن بھر پورے گھر کی صفائی ستھرائی میں لگی رہی تھی اور اب گھر چودھویں کے چاند کی طرح جگ مگا رہا تھا۔

اور یہ سب گل بانو کی ایما پر ہوا تھا۔ اتوار کو لوگ مہ پارہ کو دیکھنے کے لئے آ رہے تھے، اور گھر کی صفائی ستھرائی ضروری تھی۔ مانا کہ مہ پارہ قطعی طور پر اس کے حق میں نہیں تھی، لیکن مشرقی لڑکی کب اپنے ماں باپ کے آگے زبان کھولتی ہے...... سو قہر بر دشیں، جاں بر دشیں......!

یہ تو تھی تھکن کی وجہ...... اور نینداس لئے اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی کہ آج جمعہ تھا۔ بوقاف (جن) کا آج ہی کے دن اس سے ملنے کا وعدہ تھا اور وہ بھی کچھ ہی دیر بعد یعنی ٹھیک دو بجے۔ مہ پارہ کے دل کا عجیب عالم تھا، جسم میں چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔ کئی خدشے اور وسوسے بھی تھے، جو خواب ناک جذبوں کو گھائل کر رہے تھے۔ اگر بوقاف نہیں آیا تو......؟؟

کیا اسے بھی مجھ سے اتنی ہی محبت ہے، جتنی مجھے ہے......؟ اگر...... اگر...... وہ آ بھی گیا...... اور...... اور...... کسی کو پتا چل گیا تو......؟؟

ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ اس کے مساموں سے پھوٹ پڑا۔ وہ اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ یونہی ٹہلتے ٹہلتے نہ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ اچانک ہی اس کی نظر گھڑی کی طرف اٹھی تو کلیجہ ہی منہ کو آ گیا۔ دو بجنے میں صرف دس منٹ باقی تھے۔

منہ پارہ کا برا حال ہو گیا۔ ٹانگیں نہ جانے کیوں لرز اٹھیں۔ بہر حال اس نے کسی نہ کسی طرح خود کو قابو میں کیا اور کمرے سے باہر نکل آئی۔

پورے گھر پر ہو کا عالم طاری تھا۔ برکت صاحب اور گل بانو خواب غفلت کا شکار تھے۔ ادھر ان کی بیٹی خواب دیکھ کر اس کی تعبیر ڈھونڈ نے نکل رہی تھی۔ یہ حصہ بھی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، باورچی خانے کے ساتھ ہی اوپر جانے کے لئے زینے کا راستہ تھا۔

مہ پارہ نے ذرا دیر رک کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی زینے کے قریب آ پہنچی۔ اس نے ایک بار پھر مڑ کر دیکھا اور کس طرف سے کوئی آہٹ نہ پا کر زینے پر قدم رکھ دیا۔

وہ چھت پر آ پہنچی، آسمان پر تارے جگمگ کر رہے تھے، دور دور تک تاریکی اور سناٹے کا راج تھا۔ ہو کا یہ عالم تھا کہ اگر سوئی بھی گرا دی جاتی تو اس کی بھی گونج سنائی دیتی۔

مہ پارہ کو اب کچھ ڈر سا محسوس ہونے لگا۔ وہ جذبات کی رو میں بہہ کر اوپر چلی تو آئی تھی، لیکن اب رات اور تنہائی کے خوف نے اس کے حواس پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا تھا۔ وہ ادھر ادھر دیکھے جا رہی تھی۔ دور دور تک آسمان صاف اور بیکراں دکھائی دے رہا تھا۔

"کیا وہ نہیں آئے گا......؟" مہ پارہ کے دل نے خدشہ ظاہر کیا۔ عین اسی وقت بادلوں کی سی گھن گرج ہوئی، اور دوسرے ہی لمحے بوقاف اس طرح چھت پر ظاہر ہوا کہ وہ مالوط کے کندھے پر سوار تھا۔ بوقاف کے ہونٹوں پر ایک دلکش سی مسکراہٹ تھی، جو ستاروں کی نرم روشنی میں اور بھی زیادہ دلکش معلوم ہو رہی تھی۔ مہ پارہ اور بوقاف مبہوت ہو کر ایک دوسرے کو تک رہے تھے، نہ جانے کتنی دیر اسی طرح ہو گئی۔

آخر مالوط کی جھنجھلائی ہوئی آواز نے اس سکوت کو توڑا۔ "میری جان تو بخش دو...... کیا تم نے واقعی مجھے گدھا ہی سمجھ لیا ہے۔" مالوط کی آواز گونجی تھی۔

بوقاف ہڑ بڑا کر اس کے کندھے سے نیچے اتر آیا۔ مہ پارہ بھی نہ جانے کیوں جھینپ گئی۔ اس کے اترتے ہی مالوط نے ایک طویل سانس لی۔

"اب تم دونوں خوب دل کھول کر باتیں کرو...... میں ادھر کونے میں کھڑا ہوں۔" یہ کہہ کر مالوط وہاں سے ہٹ گیا۔

"یہ...... یہ کون ہیں......؟" مالوط کے دور ہوتے ہی مہ پارہ نے پوچھا۔

"میرا بہترین دوست مالوط۔ اپنی مثال آپ ہے...... اسی نے کبوتر بن کر تم تک میرا پیغام پہنچایا تھا اور اب مجھے لاد کر بھی یہاں تک لایا ہے، بالکل گدھے کی طرح......" بوقاف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

مہ پارہ بھی ہنس دی۔ بوقاف اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ''تم ہنستی ہوئی اور بھی حسین لگتی ہو۔'' بوقاف نے کہا۔

مہ پارہ کے چہرے پر رنگین کہکشائیں بکھر گئیں۔ ''شکریہ......'' وہ مسکرا کر بولی، ساتھ ساتھ شرما بھی رہی تھی۔

''مجھے تم سے کتنی باتیں کرنی تھیں، لیکن اس وقت ایسا لگ رہا ہے کہ میں ساری باتیں کر چکا ہوں...... پتا نہیں کیوں......؟'' بوقاف آپ ہی آپ بڑبڑایا۔

دونوں ایک بار پھر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ پھر ہمت کر کے مہ پارہ بولی۔ ''آپ بالکل ٹھیک وقت پر آئے ہیں۔''

''بھئی...... آنا ہی تھا، تم سے وعدہ جو کیا تھا۔''

''آپ غلط سمجھے...... میرا کہنے کا مطلب ہے کہ آج جمعہ تھا اور پرسوں یعنی اتوار والے دن کچھ لوگ مجھے دیکھنے کے لئے آرہے ہیں۔''

''کیا مطلب......؟ کیا تم پر اب ٹکٹ لگ جائے گا؟'' بوقاف نے حیرت سے پوچھا۔

''ارے نہیں...... شادی کے لئے...... میرے گھر والے میری شادی کر رہے ہیں۔ لڑکے والے مجھے دیکھنے کے لئے آرہے ہیں۔'' مہ پارہ نے سمجھایا۔

''شادی......!!'' بوقاف بھونچکا رہ گیا۔ ''تمہاری شادی......! مگر کیوں!''

''ان کی مرضی......'' مہ پارہ نے اداس انداز میں کندھے اچکائے۔

''میں یہ شادی ہرگز نہیں ہونے دوں گا ہاں......'' بوقاف نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''آپ کیا کریں گے......؟'' مہ پارہ نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

''میں جن ہوں...... کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ پر کٹے ہیں، گردن تو نہیں کٹی۔ یہ بتاؤ کہ کیا تم شادی کے لئے راضی ہو؟''

''نہیں......'' مہ پارہ نے جواب دیا۔

''کیوں......!'' بوقاف کا سوال تھا۔

''میرے دل میں کسی اور کے لئے خانہ خالی ہے۔'' مہ پارہ نے بتایا۔

''کون ہے وہ خوش قسمت؟'' بوقاف نے مسکرا کر پوچھا۔ جواباً مہ پارہ نے شرما کر سر جھکا لیا۔

''مجھے جواب مل گیا۔ میرے دل کا بھی یہی عالم ہے۔ ہر پل تمہاری یاد ستاتی ہے۔ میری زندگی کا لمحہ لمحہ تمہارے نام ہو چکا ہے۔ اے جان بوقاف! اپنا نام تو بتا دو۔''

''مہ پارہ...... میرا نام مہ پارہ ہے۔''

''واقعی تمہاری طرح تمہارا نام بھی بہت خوب صورت ہے۔ اور ہاں...... یہ بتاؤ کہ وہ لوگ کس وقت آئیں گے۔ میرا مطلب ہے کہ لڑکے والے......''

''اتوار کی شام کو......'' مہ پارہ نے بتایا۔

''ہوں......''بوقاف نے کچھ سوچ کر سر ہلایا۔''کچھ کرنا پڑے گا...... بلکہ کچھ نہیں بہت کچھ کرنا پڑے گا۔ خیر......''

''پھر......کیا ہوگا......؟'' مہ پارہ نے پوچھا۔

''تم صرف تماشہ دیکھنا......صرف تماشہ......میرا نام بوقاف ہے۔''بوقاف نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

اسی وقت نیچے سے کھٹ پٹ کی آواز آئی۔ مہ پارہ گھبرا گئی۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ جلدی سے بولی۔''اب......اب آپ جایئے......شاید کوئی جاگ گیا ہے۔''

چند لمحوں کے لئے تو بوقاف بھی گھبرا گیا۔ ظاہر ہے کہ وہ خود بھی اپنے ماں باپ سے ڈرتا تھا، اور اگر اس وقت مہ پارہ کے گھر والوں میں سے کوئی فرد اوپر آ جاتا تو...... یہ لمحہ فکر یہ ہوتا۔

''مالوط......! چلو......جلدی کرو۔''بوقاف نے ایک تیز قسم کی سرگوشی کی۔ مالوط تیز قدم اٹھاتا ہوا ان کے قریب آ پہنچا۔

''کیا ہوا......؟ اتنی جلدی......؟''

''گھر والوں میں سے کوئی جاگ گیا ہے۔''بوقاف نے بتایا۔''چلو......جلدی سے مجھے کندھے پر سوار کرو......جلدی......''

مالوط بھی گھبرا گیا۔ اس نے بوکھلاہٹ میں مہ پارہ کو اٹھالیا۔''ارے......ارے......'' مہ پارہ چیخی۔

''ابے......اسے کہاں اٹھالیا......؟ مجھے اٹھاؤ۔''بوقاف جھنجھلایا۔

''اوہ......ہاں......سوری۔'' مالوط نے چونک کر مہ پارہ کو چھوڑا اور پھر بوقاف کی طرف لپکا۔

دوسرے ہی لمحے بوقاف اس کے کندھے پر سوار تھا۔ پھر دونوں نے ہاتھ ہلائے۔ مہ پارہ سیڑھیوں کی طرف دیکھ رہی تھی، وہ فوراً ہی ان کی طرف متوجہ ہوئی اور جواباً ہاتھ ہلایا۔

''میں بہت جلد ملوں گا......خدا حافظ۔''بوقاف نے کہا۔

''اچھا بھابھی......خدا حافظ۔'' مالوط بھی کیوں خاموش رہتا۔ لفظ ''بھابھی'' پر مہ پارہ گلنار سی ہوگئی۔ بوقاف نے مالوط کی کمر پر ایک زوردار دھپ رسید کی۔

''اف......مار ڈالا۔'' مالوط نے کراہ کر کہا۔ پھر وہ اوپر اٹھنے لگا۔ چند ہی لمحوں بعد وہ دونوں مہ پارہ کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔
اب مہ پارہ وہاں تنہا تھی۔ وہ فوراً ہی زینے کی طرف لپکی۔ نیچے اب بھی اندھیرا تھا۔ پھر وہ کھٹ پٹ کی آواز کیوں آئی تھی؟

مہ پارہ نے سوچا۔ عین اسی وقت ایک بلی کی آواز سنائی دی۔''میاؤں......میاؤں۔''

مہ پارہ کے گلے سے ایک طویل سانس نکل گئی۔''اوہ! تو یہ کم بخت بلی ہے......'' مہ پارہ کے منہ سے نکلا۔

☆......☆......☆

بوقاف اور مالوط پرواز کرتے ہوئے آگے بڑھے، مالوط کی رفتار کافی سست تھی، شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے کندھے پر بوقاف بھی سوار تھا۔ وہ دونوں اس وقت زیادہ بلندی پر نہیں تھے۔

’’تمہیں کیسی لگی؟‘‘ بوقاف نے پوچھا۔

’’کون......؟‘‘

’’جس کے پاس سے ہم ہو کر جا رہے ہیں......اور کون......!‘‘

’’اوہ......وہ‘‘ مالوط چونکا۔ ’’بس ٹھیک ہی ہے، اس سے لاکھ درجے اچھی تو ہماری گل جبیں ہے۔‘‘

بوقاف سناٹے میں آ گیا۔ اسے خاموش ہوتا دیکھ کر مالوط جلدی سے بولا۔ ’’ارے......تم تو برا مان گئے...... میں تو مذاق کر رہا تھا...... میرے دوست......تمہاری پسند لاجواب ہے۔ واقعی تمہاری نظر کا جواب نہیں۔‘‘

بوقاف کے چہرے پر رونق بحال ہو گئی۔ ’’تم نے تو میرا دل ہی توڑ ڈالا تھا......‘‘ بوقاف نے شکایت کی۔

مالوط ہنس دیا۔ عین اسی وقت وہ چونکا۔ ’’ارے......یہ کیا......؟‘‘

’’کیا ہوا......؟‘‘ بوقاف نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اس وقت وہ گھروں کی چھتوں پر سے گزر رہے تھے۔ مالوط کی نظر ایک چھت پر ہی ٹھہر گئی تھی۔ ’’وہ......دیکھو......ادھر......‘‘ مالوط نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ’’ایک آدمی کسی کو الٹا لٹکا کر مار رہا ہے۔‘‘

بوقاف نے اب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر دیکھا۔ چھت پر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا، جس کی بیرونی دیوار پر ایک بلب روشن تھا، اسی کی روشنی میں بوقاف نے دیکھا کہ اسی دیوار کی کھونٹی سے کوئی چیز الٹی لٹکی ہوئی ہے جو کہ جسامت میں چھوٹی ہے، ایک آدمی اس کے قریب ہی کھڑا ہوا اس پر جوتے برسا رہا تھا۔ ’’چلو یار......اس کی جان بچاتے ہیں۔ نہ جانے یہ کون مظلوم ہے اور وہ کون ظالم ہے۔ کیا خیال ہے......؟‘‘ مالوط نے پوچھا۔

’’ہاں......ہاں۔ اسی چھت پر لینڈ کرو۔‘‘ بوقاف نے کہا۔ مالوط نے اپنا رخ ادھر ہی گھما لیا۔ جلد ہی وہ اسی چھت پر آ موجود ہوا۔ بوقاف نے اس کے کندھے سے چھلانگ ماری اور نیچے اتر آیا۔

اب جو منظر انہیں دکھائی دیا وہ کافی حیرت انگیز تھا۔ مار کھانے والا ایک مرغا تھا، اس کے منہ سے صرف ’’غوں غوں‘‘ کی آوازیں نکل رہی تھیں۔

اور اسے مارنے والا ان دونوں کی آمد سے بے خبر ہو کر اپنے ’’کام‘‘ میں مصروف تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک جوتا تھا، جو ہر تین سیکنڈ بعد مرغے کا مزاج پوچھ رہا تھا۔

’’ارے......ارے......یہ کیا کر رہے ہو؟‘‘ مالوط اور بوقاف نے مداخلت کی۔

وہ آدمی چونک کر مڑا۔ انداز ایسا تھا، جیسے یہ مداخلت اسے انتہائی گراں گزری ہو۔ ’’تمہیں نظر نہیں آ رہا......؟‘‘ اس آدمی نے الٹا سوال کیا۔ لہجہ بھی ٹھیک نہیں تھا۔

’’ہمارا مطلب ہے کہ تم کیوں اس بے چارے کی جان کے درپے ہو؟ اس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟‘‘ بوقاف نے پوچھا۔ وہ ترحم آمیز

نگاہوں سے مرغے کو دیکھ رہا تھا، جس کے صرف پر پھڑ پھڑا رہے تھے۔

''تم دونوں کون ہو؟'' اس آدمی نے شاید پہلی بار دونوں کے حلیوں پر نظر ڈالی۔ خاص طور سے سینگوں پر......!

''ہم......جن...... ہیں۔'' مالوط نے ڈرامائی انداز میں ایک ایک لفظ توڑا۔

''ڈرائی جن......؟'' اس آدمی کا سوال تھا۔

بوقاف کی ہنسی نکل گئی۔ البتہ مالوط جھنجھلا گیا۔ ''یہ کم بخت کس مٹی کا بنا ہے......؟ ڈرا ہی نہیں......'' اس نے سوچا۔

''ہم سچ مچ کے جن ہیں اور اڑ کر تمہاری چھت پر آئے ہیں، تا کہ اس بے چارے کی جان بچا سکیں۔'' بوقاف کا اشارہ مرغے کی طرف تھا۔

''اڑ کر آئے ہو تو کون سا تیر مارا ہے۔'' اس نے برا سا منہ بنایا۔ ''مکھی بھی اڑتی ہے۔''

''ہمارے سر پر سینگ بھی ہیں۔'' مالوط نے سر کی طرف اشارہ کیا۔

''جاؤ......جاؤ......اپنا کام کرو۔'' اس نے ہاتھ ہلایا۔ ''گائے بھینسوں کے سینگ بہت دیکھے ہی...... ہونہہ......''

''اماں جاؤ یار......'' مالوط برا مان گیا۔ ''تم تو ہماری بے عزتی کیئے دے رہے ہو۔''

''تم خود ٹپکے ہو اپنی بے عزتی کروانے کے لئے۔ میں نے تمہیں بلایا تھوڑی ہے۔'' اس نے ٹکا سا جواب دیا اور دوبارہ مرغے کی طرف متوجہ ہو کر جوتا سنبھال لیا۔

''ارے......ارے۔ اسے کیوں مار رہے ہو بھئی؟'' مالوط نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ روک لیا۔

اس آدمی نے غصے سے مالوط کو گھورا۔ ''تم اس کے سسرال والے ہو......؟'' اس نے پوچھا۔

مالوط بھنا گیا۔ فوراً بولا۔ ''میں تو اس کا سسرال والا نہیں ہوں، البتہ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ تمہاری اور اس کی کوئی خاندانی دشمنی ہے! بہر حال اس کی جان چھوڑ دو۔''

پھر وہ بوقاف کی طرف مڑا۔ ''اسے کھول دو بوقاف! میں اس کی جگہ اس آدمی کو باندھوں گا، وہ بھی الٹا۔ ہاں......''

''ارے جاؤ......جاؤ......مر گئے مجھے الٹا باندھنے والے......'' اس آدمی نے مالوط کو جھڑکا۔

''مر گئے......؟'' بوقاف نے حیرت سے پوچھا۔ ''بڑے اچھے آدمی ہوں گے وہ تو......!! چہ......چہ......چہ۔'' ساتھ ہی اس نے افسوس کا اظہار کیا۔

پھر وہ آگے بڑھا اور مرغے کو آزاد کر دیا۔ مرغے کی چونچ بھی تار سے بندھی ہوئی تھی، بوقاف نے اسے بھی کھولا۔

مرغا کافی بدحواس ہو رہا تھا، وہ فوراً ہی تڑپ کر بوقاف کے ہاتھوں سے نکلا اور ''جان بچی سو لاکھوں پائے'' کے اصول پر عمل کرتے ہوئے اس نے چھت پر سے ہی چھلانگ لگائی اور یہ جا وہ جا......!

''بیڑہ غرق......ساری محنت ضائع کروا دی۔'' وہ آدمی غرایا۔ ''بڑی مشکل سے ہاتھ لگا تھا۔''

''آخر بات کیا ہے......؟ اور یہ کون سا وقت ہے مرغے کو باندھ کر کوٹنے کا......؟'' بوقاف نے الجھ کر پوچھا۔

''میں نہیں بتاؤں گا......؟'' وہ آدمی ٹھٹکا اور جھٹکا مار کر اپنا ہاتھ مالوط سے چھڑوا لیا۔ وہ ابھی تک مالوط کی گرفت میں تھا۔

''بتاؤ......؟'' مالوط نے آنکھیں نکالیں۔

''نہیں بتاؤں گا۔'' وہ اڑ گیا۔

''بتا دو پیارے بھائی......'' بوقاف نے پچکارا۔

''نہیں......نہیں......کبھی نہیں۔'' اس نے پاؤں پٹخے۔

''یہ ایسے نہیں بتائے گا......میں ابھی اسے الٹا لٹکاتا ہوں۔'' مالوط نے دانت پیس کر کہا۔

''لٹکا دو......'' وہ لاپروائی سے بولا۔ ''الٹا لٹک کر تو مجھے اور بھی اچھی نیند آتی ہے۔''

مالوط نے اس کی طرف توجہ دیئے بغیر رسی کے بل کھولے اور اس آدمی کے پاؤں باندھ کر اسے کھونٹی سے الٹا لٹکا دیا۔ اس آدمی نے قطعی مزاحمت نہ کی۔ بوقاف خاموشی سے یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔

''اب بتاؤ......تم مرغے کو کیوں مار رہے تھے؟'' مالوط نے پوچھا۔

لیکن دوسرا لمحہ حیرت انگیز تھا۔ کیونکہ جواب کی صورت میں اس آدمی کے خراٹے گونجنے لگے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی شکل ہی دیکھتے رہ گئے۔

''اماں......نکلو یہاں سے استاد......'' مالوط نے بوقاف کے کان میں سرگوشی کی۔ ''یہ انسان نہیں ہے، کوئی آسیب ہے۔''

بوقاف نے ہونقوں کی طرح گردن ہلا دی۔ اب اس آدمی کے خراٹوں میں شدت آگئی تھی۔ دونوں کان دبا کر وہاں سے نکل بھاگے۔ اب انہیں کیا معلوم کہ ان کا واسطہ آسیبوں کے آسیب چچا تندوری سے پڑا تھا۔ اب چھت پر صرف چچا تندوری ''خواب مرغ'' کے مزے لے رہے تھے۔

☆......☆......☆

پُکار

رُخِ قبولیت پر پڑے اس حجاب کا قصہ جس کے اٹھنے سے پہلے ہر نادان اپنی دُعا کی نامقبولیت کے گمان کا شکار ہو کر بغاوت اور من مانی پر اتر آتا ہے۔ ناول ''پکار'' سرفراز احمد راہی کی ایک خوبصورت تخلیق ہے جس میں دُعا کی قبولیت میں دیر ہونے پر انسان کے ناشکرے بلکہ اللہ سے ناراض ہونے کو بہت دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔

یہ ناول کتاب گھر پر دستیاب ہے، اور اسے **ناول** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

تھپڑ کی گونج دار اور زناٹے دار آواز ایسی تھی کہ برکت صاحب کے گھر کے درو دیوار ہل گئے۔ اور پھر جو پپو کی ''بھیں...... بھیں'' اسٹارٹ ہوئی ہے تو خدا کی پناہ......!

گل بانو کلثوم پر چڑھ دوڑیں۔ ''غضب خدا کا...... اتنی زور کا تھپڑ مارا ہے تم نے اسے......! کیسے بلبلا گیا ہے بے چارہ...... اف کلثوم......''

''اپنے گھر میں اس سے بھی زیادہ زور سے مارتی ہوں۔'' کلثوم لاپرواہی سے بولی۔ ''ہاں نہیں تو...... ضد کئے جا رہا ہے خواہ مخواہ......''

اب پپو ایک طرف بیٹھ کر ہچکیاں لے رہا تھا۔ ''کیسی ظالم ہو تم......'' گل بانو نے پپو کا سر بڑے پیار سے سہلا کر کہا۔

''ہٹلر میری پسندیدہ شخصیت ہے۔'' کلثوم نے فخر سے کہا۔

''اچھا......'' گل بانو نے حیرت ظاہر کی۔ ''تو پھر جلدی سے اپنے آباؤ اجداد کا پتا لگاؤ...... ہو سکتا ہے کہ تمہارا شجرہ نسب بھی اسی سے جا ملے۔ میرا تو یہی خیال ہے کہ کڑی مل ہی جائے گی۔''

کلثوم اس وقت ان ہی کے گھر میں تھی، کیونکہ آج اتوار کا دن تھا اور تھوڑی ہی دیر بعد مہ پارہ کو دیکھنے کے لئے سلیم اور اس کے گھر والے آنے والے تھے۔ تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ اب صرف پھلوں اور مٹھائی کی کمی تھی اور برکت صاحب اسی سلسلے میں بازار گئے ہوئے تھے۔

صبح سے شنو چچی اور صغراں خالہ بھی آ دھمکی تھیں۔ وہ بھی کام کاج میں ان لوگوں کا ہاتھ بٹا کر ابھی ابھی اپنے گھروں کو گئی تھیں۔

کلثوم بھی کافی کام کر چکی تھی، لیکن اس کے بچے اسے چین نہیں لینے دے رہے تھے۔ آخر کار اس کا ہاتھ پپو پر اٹھ ہی گیا تھا۔ مہ پارہ اس وقت باورچی خانے میں تھی اور وہاں سے اس وقت اشتہا انگیز خوشبوئیں اٹھ کر پورے گھر کو مہکا رہی تھیں۔ ڈائننگ روم میں دسترخوان بہت سلیقے سے بچھا دیا گیا تھا۔ کمرہ بھی نفاست کا اعلیٰ نمونہ دکھائی دے رہا تھا۔

گل بانو باورچی خانے کی طرف جانے کا ارادہ کر ہی رہی تھیں کہ برکت صاحب لدے پھندے گھر میں داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں پھلوں اور مٹھائیوں کے شاپر تھے۔

''لو بھئی بیگم......! یہ معاملہ بھی طے ہوا۔'' انہوں نے سامان ایک جانب رکھ دیا۔ فوراً ہی کلثوم نے سامان اٹھایا اور باورچی خانے کی طرف چل دی۔

''کیا لم سم میں سودا طے کیا تھا؟'' گل بانو نے جھٹ سے پوچھا۔

''تم بھی حد کرتی ہو...... اری نیک بخت...... میرا کہنے کا یہ مطلب تھا کہ مہمان داری کا یہ حصہ بھی پورا ہو گیا۔ اور ہاں...... دیکھ لو...... کوئی بھی، کسی بھی قسم کی کمی تو نہیں رہ گئی۔'' برکت صاحب نے کہا۔

''صرف دو چیزوں کی کمی ہے۔'' وہ سر ہلا کر بولیں۔

''کون سی چیزیں......؟'' وہ چونکے۔

''لڑکے اور قاضی کی۔'' وہ مسکرا کر بولیں۔

"یہ قاضی کون ہے؟" برکت صاحب چونکے۔

"جو نکاح پڑھاتا ہے۔" گل بانو نے کہا اور برکت صاحب کو گھورنے لگیں۔

"ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟"

"مرد حضرات اتنے شکی کیوں ہوتے ہیں؟"

"کیوں......؟ تم نے یہ کیوں کہا؟"

"جب میں نے قاضی کہا، تو کیا آپ قاضی واجد سمجھے تھے؟"

جواباً برکت صاحب جھینپ گئے۔ عین اسی وقت دروازے پر کوئی گاڑی آ کر رکی۔ "لو بھئی......" برکت صاحب چونکے۔ "آ گئے وہ لوگ......!"

☆......☆......☆

سلیم احمد نے خود پر ایک تنقیدی نظر ڈالی اور مطمئن ہو کر اپنے کمرے سے نکل آیا۔ وہ اب بالکل تیار تھا۔ آج اس کا "بردکھوا" تھا......! اشرف الدین ابھی تک غسل خانے میں تھے، جبکہ بیگم اشرف بناؤ سنگھار کر رہی تھیں۔

سلیم ان دونوں کا انتظار کرنے کے لئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا ہی تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ سلیم نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھالیا۔ "سلیم احمد بول رہا ہوں۔ آپ کون صاحب......؟"

"صاحب نہیں صاحبہ......" دوسری طرف سے کھنکھناتی ہوئی نسوانی آواز آئی۔ "بولو...... سلیم احمد پہچانا؟"

"نن...... نہیں۔ کون ہیں آپ؟"

"تمہاری بیوی ہوں...... اور کون ہوگا۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"بی...... وی......!!" سلیم بوکھلا گیا۔

"ہاں ہاں...... تمہاری بیوی مالوطن......"

"مالوطن......!!"

"ہاں...... مالوطن...... یاد آیا......؟"

"نن...... نہیں۔" سلیم کے منہ سے نکلا۔

"لو...... اتنی پرانی بات بھی نہیں ہے۔ صرف ایک ہزار سال پہلے تو ہماری شادی ہوئی تھی۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"ایک ہزار سال پہلے......!" سلیم نے آنکھیں پھاڑیں۔ "لیکن میری عمر تو صرف 27 سال ہے۔"

"یہ تو اوور ٹائم چل رہا ہے۔" آواز آئی۔ "تم اتنا بھی نہیں سمجھے۔"

''میرا خیال ہے کہ آپ کو کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے۔ آپ نے رانگ نمبر ڈائل کیا ہے۔ یا پھر آپ مذاق کر رہی ہیں۔''

''نمبر بالکل رائٹ ہے تین منوں کے ابا...... اور میں بھی سیریس ہوں۔''

''تین منے......؟''

''ہاں...... تین منے...... ہمارے تمہارے...... جواب میرے پاس ہیں، اور دن رات تمہارا پوچھتے ہیں۔ وہ تو لاکھ شکر ہے کہ تم مل گئے اور ہاں...... مجھے ایک اطلاع اور بھی ملی ہے، خبردار......! اگر تم نے دوسری شادی کی تو...... ہاں......''

''تم...... تم...... آ...... آپ یہ بھی جانتی ہیں؟'' سلیم کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

''میں بہت کچھ جانتی ہوں۔ فکر مت کرو...... بس...... دوسری شادی سے پرہیز کرو۔ ورنہ اچھا نہ ہوگا۔''

''دوسری نہیں...... پہلی۔'' سلیم نے تصحیح کی۔

''بکواس مت کرو...... تم دوسری شادی کا ڈھونگ ہرگز نہیں رچا سکتے۔ تمہارے بچے تمہارا نو سو سال سے انتظار کر رہے ہیں۔ ان کا کیا ہوگا؟''

''نو سو سال میں وہ بچے کہاں رہے ہوں گے۔'' سلیم نے اعتراض کیا۔

''ابھی تک بچے ہی ہیں۔'' دوسری طرف سے گویا اطلاع دی گئی۔ ''تم تو ان کی پیدائش سے پہلے ہی بھاگ لئے تھے، جب تک تم ان پر بیٹھ کر ان کی سکائی نہیں کرو گے، وہ قد نہیں نکالیں گے۔''

''آپ مذاق اچھا کر لیتی ہیں۔'' سلیم ہنسا۔

''مذاق......! یہ تمہیں مذاق لگ رہا ہے؟ ذرا ٹھہر جاؤ...... میں وہیں پہنچ رہی ہوں، جہاں تم بن ٹھن کر جا رہے ہو، اور ہاں...... تمہارے بچوں کو بھی ساتھ لاؤں گی۔'' یہ کہہ کر دوسری طرف سے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا گیا۔ سلیم اپنے ریسیور کو گھورتا ہی رہ گیا۔

☆......☆......☆

اور پھر بالآخر، مہمان آ ہی پہنچے۔ اشرف الدین، ان کی بیگم اور سلیم احمد۔ پہلے تو ان کی خوب آؤ بھگت ہوئی، پھر مشروب کا دور چلا، جس کے بہانے سے مہ پارہ کا بھی دیدار ہو گیا۔

بیگم اشرف نے اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا، اور معنی خیز انداز میں اشرف الدین کی طرف متوجہ ہو کر گردن ہلا دی، جیسے کہہ رہی ہوں۔

''بھئی......! میں نے تو اسے بہو کا سرٹیفکیٹ دے دیا۔''

اشرف الدین بھی آمادہ دکھائی دے رہے تھے۔ سلیم تو پہلی نظر میں ہی مہ پارہ کی زلف کا اسیر ہو گیا تھا، البتہ اس نے محسوس کیا کہ مہ پارہ کچھ اکھڑی اکھڑی سی ہے۔

اور پھر دور چلا خاطر تواضع کا جس میں برکت صاحب وغیرہ نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ اشرف الدین وغیرہ بار بار یہی کہہ رہے تھے۔

"اتنا سب کچھ کرنے کی کیا ضرورت تھی......؟"

اب سب چیزوں سے فارغ ہو کر وہ لوگ اصل موضوع کی طرف آنے ہی والے تھے کہ یکا یک ایک انہونی نازل ہو گئی۔

یہ انہونی ایک برقعہ پوش عورت کے روپ میں تھی۔ اس کی صرف آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں، اس نے اپنا سر بھی اچھی طرح اسکارف سے لپیٹ رکھا تھا۔ وہ درانہ چلتی ہوئی دروازے سے اندر داخل ہوئی تھی اور سیدھی اس کمرے میں آ پہنچی، جہاں یہ "میٹنگ" ہو رہی تھی۔

وہ اندر آتے ہی بلند آواز سے بولی "سلیم......تم ایک نمبر کے دھوکے باز اور فراڈی ہو......میرے ہوتے ہوئے تم دوسری شادی ہرگز نہیں کر سکتے۔"

یہ الفاظ کسی بم دھماکے سے ہرگز کم نہیں تھے، سب ہی ہکا بکا رہ گئے۔ خاص طور پر سلیم احمد کا منہ تو مگرمچھ کے منہ سے بھی زیادہ کھل گیا۔ مہ پارہ بھی دروازے کی آڑ سے سب کچھ دیکھ رہی تھی اور خود بھی متحیر تھی۔ پھر اس سکوت کا سناٹا اسی عورت کی آواز نے توڑا۔

"بولو......تمہیں سانپ کیوں سونگھ گیا......؟"

"تم کون ہو بی بی......؟ اور کس سے مخاطب ہو؟" برکت صاحب نے دخل دیا۔

"شادی آپ کی ہو رہی ہے؟" وہ ان پر الٹ پڑی۔

"نن......نہیں......" برکت صاحب کے منہ سے نکلا۔

"تو پھر......میں اپنے شوہر سے مخاطب ہوں......جو دوسری شادی کی تیاریاں کر رہا ہے۔ بولو نا سلیم......!"

"یہ کیا بکواس ہے......؟ کون ہو تم......؟" اشرف الدین کو غصہ آ گیا۔

"میں مالوطن ہوں سسر صاحب......آپ کی بہو......لیں......آپ بھی پوچھ رہے ہیں۔" اس نے پرسکون انداز میں کہا۔

"اے لڑکی......اپنی زبان کو لگام دے......تو ہماری بہو بن کر کہاں سے پیدا ہو گئی......؟" بیگم اشرف بھی چپ نہ رہ سکیں۔

"کہاں سے پیدا ہو گئی......؟" اس عورت نے حیرت سے دہرایا۔ "اس کا جواب تو کتابت کے سنسر کی زد میں آ جائے گا۔"

مہ پارہ کے لئے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ پھر فوراً ہی ایک خیال اس کے ذہن میں آیا۔ اس عورت نے اپنا نام مالوطن بتایا تھا، اور بوقاف کے دوست کا نام مالوط تھا۔ تو کیا......یہ مالوط ہی ہے......؟ جو عورت کا بھیس بدل کر آیا ہے......؟ ایک سنسنی سی اس کے جسم میں دوڑ گئی۔ اگر یہ بوقاف کا دوست مالوط ہی ہے تو پھر آ گئی شامت لڑکے والوں کی......!

ادھر برکت صاحب اور گل بانو کو اس معاملے نے عجیب قسم کے وسوسے میں ڈال دیا تھا، وہ ہونقوں کی طرح ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ رہے تھے۔

"یہ کیا گھن چکر ہے سلیم؟ کون ہے یہ عورت......؟" اشرف الدین اب سلیم کی طرف مڑے۔

"مجھے کیا معلوم ابا جان......؟" وہ مسمسی صورت بنا کر بولا اور پھر مختصراً فون والی صورت حال بتا دی۔

سب غور سے سن رہے تھے۔ پھر اس کے خاموش ہوتے ہی اشرف الدین غصے سے گرجے۔ ’’یہ عورت کوئی بہت بڑی ڈرامے باز ہے۔ میں ابھی اسے دھکے دے کر باہر نکالتا ہوں۔‘‘

’’ڈرامے بازی تو آپ لوگ مجھ سے کر رہے ہیں۔ سلیم میرا شوہر ہے۔ میرے پاس نکاح نامہ بھی موجود ہے اور بچے بھی۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے برقعے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور چند کاغذات نکال کر برکت صاحب کی طرف بڑھا دیئے۔

برکت صاحب نے کاغذ کھولے اور ان کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ ان کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر اشرف الدین نے کاغذ ان کے ہاتھ سے جھپٹ لئے اور جلدی سے انہیں پڑھا۔

’’اور...... بچے کہاں ہیں......؟‘‘ برکت صاحب نے مالوطن سے پوچھا۔

’’میری جیب میں......‘‘ وہ ٹھنک کر بولی اور پھر واقعی اس نے جیب میں دوبارہ ہاتھ ڈال دیا۔

اور پھر سب نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا، جب اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ اس نے بچے کو زمین پر چھوڑ دیا۔

اب اس نے دوبارہ وہی حرکت کی، اور پھر اسی طرح اب وہاں تین عدد بچے موجود تھے، اور وہ خود فخریہ انداز میں سب کو دیکھ رہی تھی۔ یہ منظر سب کے لئے ناقابل یقین تھا کہ جیب میں بچے لیکن یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا تھا کہ کسی کا ذہن کام نہیں کر رہا تھا۔ تینوں بچے گنجے تھے اور ایک ہی جگہ ساکت کھڑے ہوئے سب لوگوں کو ٹکر ٹکر دیکھ رہے تھے۔

’’جاؤ بچو......! اپنے ابا جان سے تو مل لو۔‘‘ مالوطن کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ بچے ’’ابا جان...... ابا جان‘‘ کرتے ہوئے سلیم سے لپٹ گئے۔

سلیم کی حالت قابل دید تھی۔ بچے اس سے بری طرح چمٹ گئے تھے۔ وہ بھڑک کر اپنی جگہ سے ہٹا، لیکن بچے کہاں چھوڑنے والے تھے۔ گل بانو نہ جانے کیا کیا بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے نکل آئیں۔ برکت صاحب تو جیسے پتھر کا بت بن گئے تھے۔ اشرف الدین اور بیگم اشرف سر پکڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ بچوں نے واویلا مچا رکھا تھا۔ سلیم ان سے جان چھڑانے کے چکر میں خود گھن چکر بنا ہوا تھا۔

’’تم ضرور کوئی مداری ہو...... میں سے تم سمجھ لوں گا۔‘‘ دفعتاً اشرف الدین سر اٹھا کر مالوطن پر گرجے۔

’’مداری تو پچھلے سال چلی تھی، یہ بوقاف ہے۔‘‘ مالوطن نے فوراً کہا۔

’’اب یہاں سے دفع ہو جاؤ...... ورنہ......‘‘ اشرف الدین نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے دہاڑ کر کہا۔

’’آپ اپنی بہو کو ایسے کہہ رہے ہیں......؟‘‘

’’بھاڑ میں گئی بہو...... تم سے جو ہو کر لینا۔‘‘

’’اچھا......! یہ بات ہے۔ بس تو پھر اب عدالت میں ہی ملاقات ہوگی۔ میں اپنے حق کے لئے آواز ضرور اٹھاؤں گی۔‘‘

”وہ تو تم اٹھاتی رہنا، فی الحال اپنے اودھ بلاؤ بچوں کو اٹھاؤ اور یہاں سے نکلو۔“

”ہاں...... ہاں...... جا رہی ہوں۔ لیکن...... اگر یہ لوگ عقل مند ہوں گے تو تم جیسے فراڈیوں کو اپنی بیٹی ہرگز نہیں دیں گے، باقی ان کی مرضی۔ چلو بچو......“

آخری الفاظ اس نے بچوں سے کہے تھے۔ بچے فوراً ہی سلیم کی جان چھوڑ کر مشینی انداز میں اس کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ مالوطن نے اطمینان سے بچوں کو جیب میں ڈالا اور سب پر الوداعی نظر ڈال کر مڑی اور کمرے سے نکل آئی۔

یہاں اس کا ٹکراؤ مہ پارہ سے ہوا، اس کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ آہستہ سے بولی۔ ”آداب عرض ہے بھابھی جان۔ پرسوں رات دو بجے، انتظار کرنا۔“

مہ پارہ چونک اٹھی۔ وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی لیکن مالوطن تو آگے بڑھ چکی تھی۔

☆......☆......☆

کمرے میں تھوڑی دیر تک موت کی سی خاموشی طاری رہی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے مالوطن کوئی سحر پھونک کر چلی گئی ہو۔ اسی وقت گل بانو منہ ٹیڑھا کر کے کمرے میں داخل ہوئیں اور برکت صاحب سے مخاطب ہو کر بولیں۔

”آپ ذرا مہمانوں کو فارغ کر کے کمرے میں آئیے گا۔ ضروری بات کرنی ہے۔“

یہ کہہ کر وہ گھومی ہی تھیں کہ بیگم اشرف نے ہانک لگائی۔ ”ارے...... سنیئے تو بہن جی...... آپ تو......“

”کیا سنوں......؟ اب تو میرے لئے صرف یہ بات قابل سماعت ہوگی کہ سلمہا سلیم احمد کی یہ شادی دوسری نہیں بلکہ تیسری ہے۔“ انہوں نے منہ بنا کر کہا۔

”دیکھئے بھابھی جان......“ اشرف الدین نے پہلو بدلا۔ ”یہ کسی قسم کی سازش ہے، کوئی چاہتا ہے کہ یہ شادی نہ ہو...... اسی لئے یہ من گھڑت واقعہ پھیلایا گیا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں......! اس خبیث نے بچے کہاں سے برآمد کئے تھے؟“

”میں نے سب کچھ دیکھا ہے۔ بس...... فی الحال میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔“ گل بانو نے نظر گھمائی۔

برکت صاحب خاموش تھے۔ سلیم بھی سب کو ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔ ”چلئے......“ اشرف الدین نے گہری سانس لی۔ ”آپ کی یہ غلط فہمی بہت جلد دور ہو جائے گی۔ ہم جو امید لگا کر بیٹھے تھے اور ہم نے جو اپنے دلوں میں مہ پارہ بیٹی کو اپنی بہو مان لیا تھا۔ ہم اپنے اس احساس اور اس جذبے کو عملی جامہ ضرور پہنائیں گے۔ مہ پارہ بیٹی...... ہماری بہو ضرور بنے گی...... ضرور بنے گی۔“

وہ جذباتی انداز میں کہتے چلے گئے۔ پھر وہ سلیم اور اپنی بیگم کی طرف مڑے۔ ”چلو بھئی...... ابھی تو ہمیں خالی ہاتھ ہی جانا پڑے گا۔ چلو......“

وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ دونوں مردوں نے برکت صاحب سے ہاتھ ملایا اور بیگم اشرف نے گل بانو سے۔ برکت صاحب کھوئے

کھوئے انداز میں ملے تھے اور گل بانو سرد مہری سے۔

بہر حال یہ قافلہ دروازے کی طرف چلا۔ یہاں مہ پارہ بھی موجود تھی اور سب کے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس نے جلدی سے الوداعی سلام کیا تھا۔ یہ سلام بہت شفقت سے قبول کیا گیا۔ بیگم اشرف نے مہ پارہ کے سر پر ہاتھ بھی پھیرا تھا۔

اور پھر دروازے تک پہنچ کر سلیم یکا یک مڑا اور مہ پارہ سے مخاطب ہو کر بولا۔

''قسم لے لیجئے...... ہم نے پہلے کبھی کوئی شادی نہیں کی......'' اور یہ کہہ کر وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔ اس جملے میں نہ جانے کیا تھا کہ لمحہ بھر کے لئے مہ پارہ بھونچکی سی رہ گئی۔

اس نے جلدی سے سر اٹھایا، لیکن سلیم تو جا چکا تھا۔

☆......☆......☆

''بیڑا غرق...... یہ تم نے کیا کیا......؟'' بوقاف نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹ لیا۔

''کیوں......؟؟'' مالوط نے اسے گھورا۔

''تم سے بہت بڑی غلطی ہوئی ہے۔ ویسے تو تم بہت انساں شناس بنتے ہو...... لیکن تم نے یہ حرکت کیا کی ہے...... تم نے برقعے کی جیب سے بچے کیوں نکالے......؟'' بوقاف بھنایا ہوا تھا۔

''پھر کہاں سے نکالتا؟'' مالوط نے حیرت ظاہر کی۔

بوقاف پہلے تو منہ ہی منہ میں کچھ بدبدایا اور پھر جھنجھلا کر بولا ''مجھے کیا معلوم...... ارے بھئی...... بچوں کی بخ ڈالنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔''

''یونہی...... مجھے مذاق سوجھ گیا تھا۔'' مالوط نے دانت نکالے۔

''چوپٹ کر دیا...... سب کچھ چوپٹ کر دیا۔ تمہارا یہ مذاق۔ دو محبت کرنے والے دلوں کو ضرور مہنگا پڑے گا۔ خیر...... دیکھا جائے گا۔''

بوقاف نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''ارے میرے طالوت......! تم فکر مت کرو۔ اگر اس اسکیم کا کوئی خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا تو تمہارا یہ دوست کوئی اور گھن چکر چلا دے گا اور ہاں...... کل رات بھابھی سے ملنے جانا ہے۔'' مالوط نے بتایا۔

''کیوں......؟'' وہ چونکا۔

''ارے بھئی اس کارروائی کے نتیجے کی معلومات حاصل کرنی ہیں۔ آخر معلوم تو ہو کہ بعد میں کیا ہوا۔

''تم نے مہ پارہ سے بات بھی کر لی؟'' بوقاف نے حیرت سے پوچھا۔ مالوط نے فخریہ انداز میں گردن ہلا دی۔

''بہت فاسٹ جا رہے ہو۔'' بوقاف نے اعتراف کیا۔

''دیکھ لو...... کتنی جلدی تمہارے رقیب کا شجرہ نسب معلوم کیا اور خود اس کی بیوی بن بیٹھا۔'' مالوط ہنسا۔

"یہ رقیب کیا ہوتا ہے؟" بوقاف نے پوچھا۔

"انسانوں کی جو اردو کلاسک شاعری ہے...... اسی کا ایک بدکردار انسان ہے، جو رقیب کہلاتا ہے۔ وہ اتنا برا ہوتا ہے کہ ہر شاعر اسے اپنی غزلیات میں برا بھلا کہتا ہوا دکھائی دے گا۔ کوئی بھی اسے اچھے الفاظ سے مخاطب نہیں کرتا۔" مالوط نے بتایا۔

بوقاف نے سر ہلایا اور کسی سوچ میں ڈوب گیا۔

☆......☆......☆

برکت صاحب گو کہ گزرے ہوئے دن کے پیش آنے والے واقعے سے کافی دل گرفتہ تھے، لیکن اس کے باوجود حکیم طولانی کی دعوت رد نہ کر سکے۔

حکیم صاحب صبح ہی صبح نازل ہوئے تھے، انہیں اپنے دروازے پر دیکھ کر برکت صاحب کو شدید حیرت ہوئی۔ "حکیم صاحب آپ......؟ خیریت......؟" انہوں نے پوچھا۔

"بالکل...... بالکل......" حکیم طولانی نے سر ہلایا۔ "خیریت کو کیا ہوا ہے، جو نہ ہوگی۔ بالکل ہے......"

"آیئے گھر میں تشریف لایئے۔" برکت صاحب نے کہا۔

"نہیں بھئی...... ابھی قطعی وقت نہیں ہے۔ تشریف تو آج رات کو آپ میرے یہاں رکھیں گے۔ دراصل آج رات کا اچانک ہی مشاعرے کا پروگرام بن گیا ہے۔ آپ اور آپ کے گاگے شاہ میرے مہمان خصوصی ہوں گے۔" انہوں نے بتایا۔

"اوہ...... آپ شاہ صاحب کو بھی مدعو کر رہے ہیں؟" وہ چونکے۔

"ان کے بغیر تو میرا مشاعرہ ہی ادھورا ہوگا۔" وہ سر ہلا کر بولے۔ "میری خاص نظم تو ان ہی سے منصوب ہے۔ ان کے بغیر کیا خاک مشاعرہ ہوگا۔"

"کہاں ہوگا یہ مشاعرہ......؟" برکت صاحب نے پوچھا۔

"میرے گھر کی چھت پر...... رات گیارہ بجے مشاعرے کا آغاز ہوگا اور صبح کے تڑکے تک جاری رہے گا۔ درمیان میں کام و دہن کا بھی دور چلے گا۔" حکیم صاحب نے بتایا۔

"کیا صرف آپ ہی اپنا کلام سنائیں گے......؟" برکت صاحب کے لہجے میں تشویش تھی۔

"نہیں بھئی۔ تین اور بھی شعراء ہوں گے، نامور شعراء...... جناب بال دھنکوی صاحب، جناب پھوڑا دہلوی صاحب اور ایک اور معروف شاعر جناب بکواس پوری صاحب تشریف لائیں گے۔ خوب محفل جمے گی۔ مجھے زیادہ بھیڑ بھاڑ پسند نہیں ہے۔ صرف آپ ہوں گے اور ہم چار شاعر...... محفل پوری ہوجائے گی۔"

"ہوں...... بہت بہت شکریہ آپ کی عزت افزائی کا...... میں ضرور حاضر ہوں گا۔" برکت صاحب کافی متاثر دکھائی دے رہے تھے۔ حکیم

صاحب نے نام ہی ایسے شاعروں کے گنوائے تھے کہ اب تو مشاعرے میں شرکت لازمی تھی۔

''شکریہ تو مجھے ادا کرنا چاہئے، اور ہاں...... اب میں گاگے شاہ صاحب کی طرف جاؤں گا، اس لئے اب اجازت دیجئے۔ رات کو میرے گھر پر ہی ملاقات ہوگی۔'' یہ کہہ کر حکیم صاحب نے دروازے کو طبلہ بنایا اور بڑے سر میں گویا ہوئے۔

ہم سے آیا نہ گیا، تم سے بلایا نہ گیا
فاصلہ پیار میں دونوں سے مٹایا نہ گیا

☆......☆......☆

گل بانو کا موڈ ابھی تک بحال نہیں ہوا تھا۔ وہ اس گھڑی کو کوس رہی تھیں...... جو سامنے دیوار میں لگی ہوئی تھی، کیونکہ اسی گھڑی کو دیکھ دیکھ کر انہوں نے مہمانوں کا انتظار کیا تھا۔

مہمان آئے بھی تو کیسے......! اف خدا...... وہ سوچ سوچ کر لرز رہی تھیں، اگر مہ پارہ کی شادی سلیم سے ہو جاتی تو مہ پارہ کا حال کیا ہوتا......؟ وہ تو جیتے جی زندہ درگور ہو جاتی۔

کتنا بڑا ظلم ہونے والا تھا۔ ہم لوگوں کے ساتھ...... وہ تو خدا بھلا کرے اس عورت مالوطن کا...... ارے...... مگر یہ مالوطن کیا نام ہوا......؟ سوچتے سوچتے گل بانو اس کے نام پر آ کر اٹک گئیں۔ ''ارے ہوگا یہی نام...... مجھے کیا......؟ بس یہی کافی ہے کہ میری بچی کی زندگی بچ گئی۔'' وہ خود سے بڑبڑائیں۔

قریب ہی مہ پارہ موجود تھی، ان کی بڑبڑاہٹ سن کر بولی۔ ''مجھ سے کچھ کہہ رہی ہیں امی جان؟''

''ہیں......!'' انہوں نے چونک کر مہ پارہ کی طرف دیکھا اور پھر جلدی سے بولیں۔ ''ارے نہیں بیٹی...... میں نے چلہ کھینچ کر موکل قابو میں کئے ہیں، ان سے ہی باتیں کر رہی ہوں۔''

''اچھا......'' مہ پارہ نے لاپروائی سے کہا۔ وہ بھی شاید اس وقت اپنی سوچوں میں گم تھی۔ گل بانو اس جواب پر اسے گھور کر رہ گئیں۔

☆......☆......☆

سلیم دکان پر جانے کی تیاری کر رہا تھا، اس کا موڈ قطعی ٹھیک نہیں تھا، اس وقت وہ شکلی طور سے ابلیس کا شناسا لگ رہا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم سے نکل ہی رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے خوں خوار نظروں سے اسے گھورا۔

''کس کم بخت کا فون ہے......'' وہ بڑبڑایا اور پھر آگے بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا۔ اگلے ہی لمحے اس کی طبیعت مزید صاف ہوگئی۔

''ہیلو سلیم ڈارلنگ......'' دوسری طرف سے اسی منحوس عورت کی آواز سنائی دی یعنی مالوطن کی۔ غصے کے مارے سلیم کا برا حال ہوگیا، اسے ایک بھی گالی یاد نہ آ سکی۔ اس کے صرف ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔

''کیا ہوا......؟ کیوں چپ ہو......؟ زبان کا بخار ہوگیا ہے کیا......؟ کسی ڈاکٹر کو دکھایا......؟'' مالوطن نے ہمدردانہ انداز میں پوچھا۔

”بکواس بند کرو......تم کوئی خبیث روح ہو......جو میرے پیچھے لگ گئی ہے۔“ سلیم کی آواز غصے سے بلند ہوگئی۔

”لینگویج پلیز......“ مالوطن نے ٹوکا۔ ”میں تمہاری بیوی ہوں......ویسے تو اکثر بیویاں بھی خبیث روحیں ثابت ہوتی ہیں......کسی حد تک تمہارا کہنا ٹھیک ہی ہے۔“

”اوہ......یو......شٹ اپ۔“ سلیم نے پاؤں پٹخ کر کہا۔

”اوہو......اتنے ناراض ہو......مگر میں کیا کرتی......؟ اگر وہاں نہیں آتی تو وہ ڈائن تمہیں مجھ سے چھین لیتی۔ ہے نا سلیم ڈارلنگ......؟“

”چھین تو تم نے لیا ہے میرا سکھ چین......تم آخر کیوں میری دشمن بنی ہوئی ہو......؟ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟“ سلیم نے بھنا کر کہا۔

”یہ تمہارا وہم ہے۔“ لاپروائی سے کہا گیا۔ پھر مالوطن بولی۔ ”سنو......تینوں منے تمہیں یاد کر رہے ہیں۔“

”انہیں گولی مار دو۔“

”ہائے......ہائے......بڑے ظالم باپ ہو۔ اپنے بچوں کے لئے ایسا کہہ رہے ہو......؟“ مالوطن کی آواز میں شکایت تھی۔

”بھاڑ میں گئے بچے اور جہنم میں گئیں تم......سمجھیں......؟“ سلیم گرجا۔

”میں تمہاری بیوی ہوں، سلیم......“

”کیسی بیوی؟ کہاں کی بیوی؟ آخر تم ہو کون......؟“

”صرف اور صرف تمہاری بیوی ہوں......کیسی بیوی ہرگز نہیں ہوں۔“ مالوطن کی اٹھلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔

”ٹھیک ہے۔“ سلیم نے دانت پیسے۔ ”تم میری بیوی ہونا......تو جاؤ......میں نے تمہیں طلاق دی......طلاق دی......طلاق دی۔“

یہ کہہ کر سلیم نے کریڈل پر ریسیور پٹخا اور غصے کے عالم میں مڑا۔ لیکن پھر وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ سامنے بیگم اشرف کھڑی ہوئی اسے خوں خوار نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

☆......☆......☆

پیر گاگے شاہ صاحب، اس وقت بڑی عجلت اور چابک دستی سے اپنی دکان کے مخصوص کمرے میں بیٹھے ہوئے مٹھائی تیار کر رہے تھے۔ ان کی مدد کے لئے چنگا اور منگا بھی وہاں موجود تھے۔ ان کے سامنے بڑی سی کڑاہی، چولہے پر رکھی ہوئی تھی، جس میں گلاب جامن تیار ہو رہے تھے، چنگا اور منگا گلاب جامن کے پیڑھے بنا رہے تھے اور گاگے شاہ نے کڑائی سنبھال رکھی تھی۔ ان کے ہاتھ میں موجود کڑچھا بڑی فنکاری سے کڑاہی میں گھوم رہا تھا۔

”اف......“ گاگے شاہ نے گردن ایک طرف جھکا کر پیشانی کا پسینہ پونچھا۔ ”اتنا بڑا آرڈر ہے......اور ٹائم کم ہے......کیسے پورا ہو گا آرڈر......؟“

”مولیٰ پورا کرے گا، شاہ صاحب......مولیٰ پورا کرے گا۔“ منگا نے درویشانہ انداز میں ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"بے شک......" گاگے شاہ نے گردن ہلائی۔ "مولی سے یہ بھی دعا ہے کہ وہ تمہاری کام چوری بھی دور کردے۔"

چنگا ہنس پڑا۔ منگا نے اسے گھورا اور پھر گاگے شاہ سے مخاطب ہوا۔ "آپ تو مجھے کام چور ہی کہتے رہتے ہیں، جبکہ میں چنگا سے زیادہ کام کرتا ہوں......سچ ہی کہا ہے کسی نے......جو جتنا دبتا ہے، اسے اتنا ہی دبایا جاتا ہے......ہاں......"

"ابے ہوش کی دوا کر......" چنگا پھر ہنسا۔ "ابے......ڈیل ڈول دیکھ رہا ہے، شاہ صاحب کا......اگر تجھے انہوں نے دبا دیا نا، تو ہڈیاں بھی سرمہ بن جائیں گی۔"

"میرا مذاق اڑا رہے ہو؟" گاگے شاہ کرچھا چھوڑ کر اس پر چڑھ دوڑے۔

"نن......نہیں شاہ صاحب جی......" چنگا کا رنگ اڑ گیا۔ "میرا مطلب آپ کا مذاق اڑانا نہیں تھا۔"

"مذاق نہیں اڑا رہے تھے، تو کیا مکھیاں اڑا رہے تھے؟" گاگے شاہ نے بھنا کر کہا۔

"مکھی تو یہاں ایک بھی نہیں ہے شاہ صاحب......" منگا بڑے فخر سے بولا۔

"بکواس بند کرو۔" گاگے شاہ اس کی بات کاٹ کر دہاڑے۔ "دو گھنٹے بعد مٹھائی کی ڈیلیوری دینی ہے۔"

"کس کو......؟" منگا حیران تھا۔

"مجھ کو......" گاگے شاہ نے جواب دیا۔

"لیکن آپ تو مرد ہیں؟" منگا نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"ابے......گلاب جامن کی ڈیلیوری دینی ہے۔" گاگے شاہ اتنی زور سے چلائے کہ در و دیوار لرز اٹھے۔ دونوں اپنی اپنی جگہوں پر دبک کر رہ گئے۔

"اب اگر تم دونوں میں سے کوئی بولا تو......" وہ وارننگ دے ہی رہے تھے کہ گلی میں سے قوالی نما گانے کی آواز آئی۔

تجھے دیکھا، سانسیں مجھے آتی اب کم
دھڑکنیں رک گئیں نکلے نہ دم

میوزک کا شور بھی ساتھ شامل تھا۔ گاگے شاہ نے کرچھا ہاتھ سے چھوڑا اور گانے کی پر بدمست ہو کر جھومنے لگے۔

"لے بھئی منگے......یہ تو گئے کام سے۔ پورا ہو چکا آرڈر......" چنگا نے گاگے شاہ کا حال دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھری۔

"وہی ہو گا سلو بریانی والا۔ وہی بجاتا ہے اپنے ٹھیلے پر ٹیپ ریکارڈ......" منگا نے منہ بنا کر خیال ظاہر کیا۔

"اسے بھی سکون نہیں ہے۔ اب شاہ صاحب اسی طرح جھومتے رہیں گے اور کام رکا رہے گا۔ بعد میں ہمیں ہی جھاڑ پڑے گی۔" چنگا کے انداز میں تشویش تھی۔

"میں کرچھا سنبھالتا ہوں۔ تم جا کر ٹیپ ریکارڈ بند کرواؤ۔ جلدی کرو......" منگا نے یہ کہہ کر کرچھا سنبھال لیا۔

گاگے شاہ اب بھی جھوم رہے تھے۔ ان کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ گانا چل رہا تھا۔ چنگا اٹھا اور کمرے سے نکل گیا۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ گانے کا شور تھم گیا۔ فوراً ہی گاگے شاہ چونک کر اپنے ہوش میں آ گئے۔

"چنگا کہاں ہے؟" انہوں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی آ رہا ہے جی......"

"گیا کہاں ہے؟"

"ب...... باتھ روم......" منگا ہکلایا۔

اتنی دیر میں چنگا واپس آ گیا۔ "تم باتھ روم گئے تھے......؟" گاگے شاہ نے پوچھا۔

"نن...... نہیں...... جج...... جی ہاں۔" اس کا دہرا جواب تھا۔

"ہائیں...... نہیں بھی اور ہاں بھی...... کیا قبض کی کیفیت ہے؟" گاگے شاہ نے حیرت سے پوچھا۔

چنگا نے اپنی صورت مسمسی بنالی۔ منگا نے بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کی۔ "تم یہاں کھڑے ہوئے کیا کر رہے ہو؟ چلو پیڑے بناؤ......"

گاگے شاہ نے اب منگا کی خبر لی اور کرچھا سنبھال لیا۔

ایک بار پھر تینوں مٹھائی تیار کرنے میں جت گئے۔ گاگے شاہ بڑی برق رفتاری سے گلاب جامن سینک سینک کر کڑاہی میں ڈال رہے تھے۔

عین اسی وقت ایک دبلا پتلا اور طویل قامت شخص ان کے قریب آ کھڑا ہوا۔

☆......☆

اس کے جسم پر شیروانی اور پاجامہ زیب تن تھا۔ وہ ایک ہی جگہ خاموش کھڑا ہوا گاگے شاہ وغیرہ کو کام کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ دبلے پتلے جسم پر شیروانی اور پاجامہ کچھ عجیب سا تاثر دے رہے تھے۔ گاگے شاہ نے ایک نظر اس پر ڈالی اور چنگا سے مخاطب ہو کر بولے۔

"یہ بانس یہاں کس نے گاڑا ہے؟ میں نے تم سے بانس اس لئے منگایا تھا......؟"

"وہ بانس تو اندر کمرے میں رکھا ہے شاہ صاحب...... آپ نے پرسوں منگوایا تھا، وہ ابھی تک ادھر ہی ہے...... میں نے خود دیکھا ہے۔" چنگا نے وضاحت کی۔

"میں بانس نہیں ہوں۔ ایک شاعر ہوں...... حکیم طولانی نام ہے میرا......" اس نے منہ کھولا۔

"اوہو...... آدمی تو پھر بھی نہ ہوئے نا...... شاعر...... ہونہہ......" منگا نے برا سا منہ بنایا۔

"اوئے...... تم چپ کرو......" گاگے شاہ نے اسے ڈانٹا اور پھر حکیم طولانی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ "فرمایئے جناب...... میں کیا خدمت کروں آپ کی......؟ مٹھائی چاہیئے......؟"

"جی نہیں......" انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

”شکل سے ہی دق کا مریض لگ رہا ہے۔“ چنگا نے منگا کے کان میں سرگوشی کی، پھر بلند آواز سے بولا۔ ”یہاں دوا و وا نہیں ملتی بھائی ......دواخانہ آگے ہے۔“

”میں خود حکیم ہوں۔“ وہ تلملا اٹھے۔ ”میرے پاس خود دواؤں کا خزانہ موجود ہے۔“

”تو پھر......آپ کی آمد کا کوئی تو مقصد ہوگا۔“ گاگے شاہ نے پوچھا۔ پھر وہ چونکے۔ ”ارے......آپ کھڑے کیوں ہیں......؟ تشریف رکھیں۔“

”کہاں رکھوں تشریف......؟“ حکیم طولانی چونکے۔

”ارے ہاں......میں تو بھول ہی گیا......لاؤ بھئی منگے......ذرا بھاگ کر اسٹول تو لے آؤ......“

تھوڑی دیر بعد اسٹول آگیا۔ حکیم طولانی اطمینان سے بیٹھے اور پھر اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔ تینوں غور سے سن رہے تھے۔ ان کے خاموش ہونے پر گاگے شاہ نے معذرت بھرے لہجے میں کہا۔

”آپ پہلے ہی اپنا تعارف کروا دیتے......خواہ مخواہ آپ کو......“

”ارے کوئی بات نہیں۔ میں نے قطعی برا نہیں مانا۔“ حکیم صاحب نے دانتوں کی نمائش کی۔

”مجھے بھی معاف کرنا حکیم صاحب۔“ چنگا بھی بول اٹھا۔ ”میں نے آپ کو تپ دق کا کوئی مریض سمجھا تھا۔“

گاگے شاہ نے اسے گھورا اور جلدی سے حکیم صاحب سے بولے۔ ”ہم لوگ ضرور آئیں گے۔ آپ کا مشاعرہ ہو اور ہم نہ آئیں......ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ جاؤ بھئی منگے......! حکیم صاحب کے لئے کچھ ٹھنڈا ونڈا لاؤ......ابے اٹھو بھی۔“

☆......☆......☆

چچی نے ایک فلک شگاف چیخ ماری اور الٹے قدموں چھت سے واپس بھاگیں۔ زینے بھی انہوں نے نہ جانے کس طرح طے کئے تھے۔ بہرحال آڑھے ترچھے ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے وہ گھر سے نکل آئیں۔

سامنے والے گھر کے چبوترے پر کلو چرسی اور اس کا دوست ملو استاد بیٹھے ہوئے گپیں مار رہے تھے۔ جیسے ہی ان کی نظر چچی پر پڑی، وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ چچی کے چہرے کے سارے فیوز اڑے ہوئے تھے۔

وہ ان دونوں کے قریب آ کر رونے لگیں۔ ”ہائے میں بیوہ ہوگئی......ہائے میں جیتے جی مرگئی۔“

”اللہ نہ کرے چچی......کیا ہوا......؟“ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ گلی میں اس وقت یہی دونوں موجود تھے۔

”تمہارے چچا نے......خودکشی کرلی۔“ انہوں نے بہ مشکل کہا۔

”جان چھوٹی مرغوں کی......“ ملو استاد آہستہ سے بڑبڑایا۔

”کیا......؟“ چچی نے چونک کر پوچھا۔ وہ سن نہیں سکی تھیں۔

’’کک……کچھ نہیں چچی……ہاں تو……یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ چچا نے خودکشی کر لی……؟ کب، کیسے……کہاں؟‘‘ ملو استاد نے بات بنائی۔

’’گھر کی چھت پر……انہوں نے پھندا ڈال کر خودکشی کر لی۔ ان کی لاش الٹی لٹکی ہوئی ہے۔‘‘ چچی نے پھر رونا شروع کر دیا۔

’’چلو……چل کر دیکھتے ہیں……‘‘ کلو چرسی نے ملو استاد سے کہا۔

’’ہاں……ہاں چلو۔ اتنے سیدھے چچا تھے، الٹے ہو کر کیوں مرے……؟‘‘ ملو استاد کے لہجے میں الجھن تھی۔

’’اماں استاد……بندے کی کایا پلٹ ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔ کم بختی بھی تو کبھی نہ کبھی آ ہی جاتی ہے۔ لگ گئی ہو گی کسی مرغے کی بددعا…… چچا ہو گئے انا غفیل۔‘‘ کلو نے اپنا خیال پیش کیا۔

چچی ان دونوں سے بے خبر تھیں، اس وقت تو انہیں اپنا ہی ہوش نہیں تھا۔ ان کی باتیں کیا سنتیں۔ پھر وہ لوگ گھر میں داخل ہو گئے۔ چھت پر پہنچ کر ایک بار پھر چچی نے اپنا کلیجہ تھام لیا۔

چچا تندوری کا جسم دیوار کے سہارے الٹا لٹکا ہوا تھا، اور بالکل ساکت تھا۔ ان کے پیروں سے رسی بھی بندھی ہوئی تھی۔ کلو چرسی اور ملو استاد نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر یہ منظر دیکھا۔

’’چچا کو یہ سوجھی کیا……؟‘‘ کلو چرسی کے منہ سے نکلا۔ ’’خودکشی تو بڑی گندی کی ہے انہوں نے……رسی گلے کے بجائے پیروں میں باندھ لی۔‘‘

’’نیا نیا تجربہ تھا نا بے چاروں کا۔‘‘ ملو استاد نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔ ’’پہلی دفعہ تو خودکشی کی ہے۔‘‘

’’ارے تم لوگ کچھ کرو……یہ کیا لے کر بیٹھ گئے۔‘‘ چچی نے احتجاجاً چیخ کر کہا۔

’’ہاں چچی……کرتے ہیں……کرتے ہیں۔‘‘ ملو استاد نے تسلی دی۔ پھر وہ کلو چرسی کی طرف مڑا۔

’’چل بھئی کلو……! ہاتھ اٹھا……فاتحہ پڑھتے ہیں۔‘‘

جواباً کلو چرسی نے اس کے کان میں کچھ کہا۔ ’’ابے……بڑا ہی گندہ ہے تو……ملیچھ کہیں کا……‘‘ ملو استاد نے برا سا منہ بنا کر اسے پرے دھکیل دیا۔ اتفاقاً یہ دھکا زوردار تھا، یا پھر کلو چرسی کا وزن بہت ہلکا تھا کہ وہ اپنی ہی جھونک میں سیدھا چچا تندوری کے اوپر جا کر گرا۔ چچا تندوری کے مردہ جسم میں فوراً ہی حرکت ہوئی اور انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔

’’ابے……کون ہے؟ کیا ہے……؟‘‘ چچا تندوری کے منہ سے آواز نکلی۔

کلو چرسی بھڑک کر پیچھے ہٹا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اب تینوں ہی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چچا تندوری کو دیکھ رہے تھے۔

’’ابے……کھڑے کھڑے منہ کیا تک رہے ہو……اور وہ بھی الٹا منہ……کھولو مجھے……جلدی کرو۔‘‘

’’تم……تم تو مر گئے تھے چچا……پھر زندہ کیسے ہو گئے……؟‘‘ کلو چرسی نے حیرت سے پوچھا۔

’’ابے یہ مذاق کر رہے ہیں……زندہ وندہ نہیں ہیں۔‘‘ ملو استاد ہنسا۔ لیکن اس ہنسی میں خوف شامل تھا۔

’’پاگل ہو گئے ہو تم لوگ...... میں زندہ ہوں۔‘‘ وہ چیخے۔

’’نہیں چچا...... تم ہمیں بے وقوف بنا رہے ہو...... تم مر گئے ہو، تم نے خودکشی کی ہے۔ دیکھ لو...... تمہاری ٹانگیں رسی سے بندھی ہوئی ہیں۔‘‘ ملو استاد نے رسی کی طرف اشارہ کیا۔

’’ابے...... تو...... میں اگر خودکشی کروں گا، تو رسی ٹانگوں میں ڈالوں گا یا گلے میں......؟‘‘ چچا تندوری نے بھنا کر پوچھا۔

’’ٹھیک تو کہہ رہے ہیں یہ۔‘‘ چچی نے فوراً ان کی سائیڈ لی۔ اب ان کے چہرے کی کچھ رونق بحال ہو چکی تھی۔

’’اماں ہاں یار......‘‘ ملو استاد نے سر کھجایا، پھر وہ کلو چرسی سے مخاطب ہوا۔ ’’تم بھی گدھے کے گدھے ہی رہے۔ سامنے کی تو بات ہے۔‘‘

’’تم بھی تو گدھے ہو...... تم نے کیوں یہ بات نہیں سوچی......‘‘ وہ ملو استاد پر چڑھ دوڑا۔

’’نہیں۔ تم گدھے ہو۔‘‘ ملو استاد نے پھر کہا۔

’’نہیں...... گدھے تم ہو۔‘‘

’’گدھے تم ہو......‘‘

’’گدھے تم ہو......‘‘

’’میں گدھا ہوں۔‘‘ چچا تندوری تنگ آ کر چیخے۔ ’’بند کرو یہ گدھیات کا چیپٹر، اور کھولو مجھے......‘‘

دونوں چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر وہ جلدی سے آگے بڑھے اور رسی کھول ڈالی۔ دوسرے لمحے چچا تندوری دھڑام سے منہ کے بل فرش پر آ رہے اور ایک بار پھر بے حس و حرکت ہو گئے۔

’’ابے...... کیا مر گئے چچا......؟‘‘ ملو استاد کے منہ سے نکلا۔

بڑی مشکل سے کلو چرسی اور ملو استاد، ان کو اٹھا کر نیچے کمرے تک لائے تھے۔ پھر چچا تندوری کو بستر پر ڈال دیا گیا تھا۔ وہ اب بھی بے سدھ تھے۔ چچی ان کے منہ کے پاس پنکھا جھلنے لگیں۔

’’چچی...... ان کے منہ پر گٹر کا پانی ڈالو...... ابھی ہوش میں آ جائیں گے۔ ہاں......‘‘ ملو استاد نے مشورہ دیا۔ وہ بڑے غور سے چچا تندوری کی طرف دیکھ رہا تھا۔

’’تم ان کے سر کے قریب کھڑے ہو کر منہ دھو لو...... گٹر کے پانی کی کیا ضرورت ہے۔‘‘ چچی نے جل بھن کر کہا۔

ملو استاد کھسیا کر رہ گیا۔

’’چچی نبض دیکھ لو...... کہیں ایسا نہ ہو کہ چپکے سے نکل لیں۔ ویسے بھی چچا کی پرانی عادت ہے کہ کہیں بتا کر نہیں جاتے۔‘‘ اب کے کلو چرسی بولا تھا۔

یہ سن کر چچی نے بے ساختہ چچا تندوری کی نبض ٹٹول ڈالی اور پھر مڑ کر کلو چرسی کو گھورنے لگیں۔

’’کیا ہوا چچی......؟ ایسے کیوں دیکھ رہی ہو......؟‘‘ وہ گھبرا گیا۔

’’ابے بے وقوف ......! اتنا بھی نہیں سمجھتا ......‘‘ ملواستاد نے کہا۔ ’’نبض رک گئی ہوگی اور اب چچی سوچ رہی ہوں گی کہ چنے کتنے منگواؤں۔‘‘

’’بے وقوف تو تم دونوں ہی ہو۔‘‘ چچی نے تیز لہجے میں کہا۔ ’’یہ صرف بے ہوش ہوئے ہیں۔ تم دونوں نے ان کی ٹانگیں کھول کر انہیں چھوڑ دیا تھا...... اگر پکڑ لیتے تو یہ بے ہوش نہ ہوتے۔ چرس پی پی کر تم دونوں بالکل خشک ہو گئے ہو۔‘‘

دونوں سر کھجانے لگے اور آئیں بائیں شائیں کرنے لگے۔ عین اسی وقت چچا تندوری کے جسم میں حرکت ہوئی۔ وہ ہوش میں آ رہے تھے۔ چچی نے فوراً ہی شکر ادا کیا۔ ان کے ہوش میں آتے ہی ملواستاد نے سوال کیا۔

’’چچا...... تمہیں باندھا کس نے تھا......؟

☆......☆......☆

اُردو ٹائپنگ سروس

اگر آپ اپنی کہانی، مضمون، مقالہ یا کالم وغیرہ کسی رسالے یا ویب سائٹ پر شائع کروانا چاہتے ہیں لیکن اُردو ٹائپنگ میں دشواری آپ کی راہ میں حائل ہے تو ہماری خدمات حاصل کیجئے۔

☆ ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریر سکین کیجئے اور ہمیں بھیج دیجئے یا
☆ اپنی تحریر رومن اردو میں ٹائپ کر کے ہمیں بھیج دیجئے یا
☆ اپنا مواد اپنی آواز میں ریکارڈ کر کے ہمیں ارسال کر دیجئے یا
☆ مواد زیادہ ہونے کی صورت میں بذریعہ ڈاک بھی بھیجا جا سکتا ہے

اردو میں ٹائپ شدہ مواد آپ کو ای میل کر دیا جائے گا۔ آپ دنیا میں کہیں بھی ہوں، ہماری اس سروس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ادائیگی کے طریقہ کار اور مزید تفصیلات کے لئے رابطہ کریں۔

فون نمبر 0092-331-4262015, 0300-4054540

ای میل: harfcomposers@yahoo.com

ویب سائٹ: http://pktypist.com

سلیم ان کے تیور دیکھ کر بوکھلا اٹھا تھا۔ بیگم اشرف چلا کر بولیں۔ ”میں تمہیں ایسا نہیں سمجھتی تھی، تم نے خاندان بھر کی ناک کٹوا دی۔“

”مم..... مم..... میں نے کیا کیا ہے امی جان.....؟“ سلیم ہکلایا۔

”تم نے کسر کون سی چھوڑی ہے.....؟ اب تو بس..... یہ باقی رہ گیا ہے کہ ہماری عزت نیلام عام ہو جائے۔ لوگ ہم پر تھو تھو کریں۔“

شور سن کر اشرف الدین بھی وہاں چلے آئے اور ہکا بکا ہو کر دونوں کی شکل دیکھنے لگے۔ ”لیجئے..... آپ بھی دیکھ لیں..... اپنے چہیتے کے کرتوت.....“ وہ ان کی طرف مڑیں۔

”کیوں..... کیا ہوا بھئی.....؟“ وہ بولے۔

”اس نے واقعی شادی کی تھی..... ابھی ابھی اس نے فون پر اپنی بیوی کو طلاق دی ہے۔“ انہوں نے اطلاع دی۔

”اوہو.....“ وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ پھر سلیم کی طرف مڑے۔ ”کیوں بھئی..... کیا یہ سچ ہے؟“

”کیا میں آپ سے جھوٹ بولوں گی۔ تم خود بتاؤ سلیم..... کیا تم نے فون پر کسی کو طلاق نہیں دی تھی؟“

”امی..... امی.....! آپ بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔“ سلیم نے بے چین ہو کر کہا۔

”کیا سمجھنے کی کوشش کروں.....؟ کہ تم نے طلاق کس چکر میں دی ہے؟ ہیں.....“ وہ اس پر چڑھ دوڑیں۔

”افوہ.....“ سلیم نے سر پکڑ لیا۔ ”میں نے اسے طلاق دی ہے، لیکن وہ میری بیوی ہرگز نہیں ہے۔“

”یہ تو اور بھی بری بات ہے بھئی۔“ اشرف الدین سر ہلا کر بولے۔ ”کہ بیوی بھی نہیں ہو اور طلاق بھی دے دی جائے۔ طلاق تو پھر ناجائز ہو گئی نا.....؟“

”چھوڑیئے جائز اور ناجائز کو.....“ بیگم اشرف بولیں۔ ”پہلے اس سے یہ پوچھیں کہ اس نے ہم لوگوں سے اپنی شادی کیوں چھپائی؟“

”ہاں..... یہ تو غلط ہے۔ بتاؤ بھئی تم نے کیوں ہمیں بے خبر رکھا؟“ وہ سلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔

”آپ لوگ مجھے پاگل کر دیں گے۔“ اس نے مٹھیوں میں اپنے بال جکڑ لئے۔ ”میں نے کوئی شادی وادی نہیں کی ہے، اور نہ کسی کو طلاق دی ہے۔“

”ہائے..... ہائے..... جھوٹ بھی بول رہے ہو؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے سلیم؟“ بیگم اشرف تعجب سے بولیں۔

”ارے امی جان..... امی جان..... مجھے کچھ نہیں ہوا۔ بات دراصل یہ ہے کہ.....“

”اوہو..... تو اصل میں بھی کوئی بات اور ہے.....؟ کس قدر گھنے ہو تم بیٹا سلیم.....؟“ اشرف الدین حیرت سے بولے۔

سلیم کا دل چاہ رہا تھا کہ اپنی بوٹیاں نوچ لے۔ عجیب صورت حال سے دوچار تھا۔ اس کم بخت مالوطن نے تو کہیں کا بھی نہیں چھوڑا تھا۔ پہلے لڑکی والوں کے سامنے ذلیل کروایا اور اب اپنے ہی ماں باپ کے درمیان میں پھنسا ہوا تھا۔ ستم یہ کہ بے قصور بھی تھا۔

”ابا جان..... کم از کم آپ تو میری بات سن لیں.....“ اس نے استدعا کی۔

’’اچھا......سناؤ۔‘‘ وہ ہمہ تن گوش ہوگئے۔ بیگم اشرف اسے گھور رہی تھیں۔

’’بات یہ ہے کہ میں نے جسے طلاق دی ہے، وہ میری بیوی ہرگز نہیں ہے۔‘‘

’’تو پھر......کس کی بیوی ہے وہ......؟‘‘ اشرف الدین نے ہونقوں کی طرح پوچھا۔

’’ہوگی کسی کی......مجھے کیا معلوم......‘‘ اس نے کندھے اچکائے۔

’’تم نے اسے طلاق کیوں دی......؟‘‘

’’تو اور کیا کرتا......؟ وہ زبردستی میری بیوی بن رہی تھی۔ وہی تھی......منحوس ماالوطن......‘‘

’’اوہ......اوہ......وہ بدروح......؟‘‘

’’جی اباجان......!‘‘ وہ مسمسی صورت بنا کر بولا۔

’’وہ بولتی کہاں سے ہے......؟‘‘ انہوں نے پوچھا۔

’’میرے خیال میں تو وہ انسان ہی ہے۔‘‘ سلیم نے پرخیال انداز میں کہا۔ ’’اس لئے منہ سے ہی بولتی ہوگی۔‘‘

’’نرے گاؤدی ہو......میرا مطلب تھا کہ وہ رہتی کہاں ہے؟‘‘

’’مجھے کیا معلوم اباجان......دوسری مرتبہ تو اس کا فون آیا ہے۔‘‘

’’ہوں......‘‘ اشرف الدین کسی سوچ میں ڈوب گئے۔ ’’اب اس کا فون آئے تو کسی طرح یہ معلوم کرو کہ وہ رہتی کہاں ہے۔ بلکہ......میں آج ہی فون میں (C.L.I) لگوا لیتا ہوں۔‘‘

پھر وہ اپنی بیگم کی طرف گھومے اور نرم گرم انداز میں بولے۔ ’’تم پہلے بات کو سمجھا تو کرو......خواہ مخواہ بتنگڑ بنا لیتی ہو......!‘‘

☆......☆......☆

ریل کے کمپارٹمنٹ میں اس وقت صرف چار افراد موجود تھے۔ ایک تو مشہور شاعر بال دھنکوی تھے جو کہ کافی تنومند اور صحت مند جسم کے مالک تھے، لیکن ان کے سر پر بال بہت ہی کم تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی ہر اچھی غزل پر بال دھنا کرتے تھے۔

دوسرے صاحب تھے، پھوڑا دہلوی......یہ درمیانے قد کے دبلے پتلے اور منحنی سے آدمی تھے، کسی زمانے میں غزلیں لکھ لکھ کر ان کے ہاتھ میں پھوڑا نکل آیا تھا۔ جب سے ہی انہوں نے اپنا تخلص پھوڑا رکھ لیا تھا۔

تیسرے صاحب بھی شاعر ہی تھے، ان کا نام تھا بکواس پوری۔ یہ دراصل حقیقت پسند اور سچے شاعر تھے، فرماتے تھے کہ شاعری، فضول قسم کی بکواس کے علاوہ اور کچھ نہیں، میں بھی صرف بکواس ہی کرتا ہوں، اسی لئے ان کا تخلص بکواس پوری تھا۔

البتہ کمپارٹمنٹ کا چوتھا شخص ان کا قطعی واقف کار نہیں تھا۔ عام سا حلیہ تھا اس کا، اور وہ گم صم سا اپنی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی شیو کافی حد تک بڑھی ہوئی تھی، اور بال بھی کھچڑی تھے۔ اس کی آنکھیں کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

شاعروں کا یہ قافلہ اس وقت حکیم طولانی کے گھر کی طرف سفر کر رہا تھا۔ یہ تینوں شاعر ایک ہی شہر میں رہتے تھے، جبکہ حکیم طولانی کا قصبہ، ان کے شہر سے کافی دور تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حکیم طولانی کی طرف سے مشاعرے کی دعوت ملتے ہی تینوں شاعروں نے سیٹیں بک کروالی تھیں۔

اور اب ریل گاہے بگاہے، چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر رکتی ہوئی، منزل کی طرف گامزن تھی۔ یہ تینوں شاعر کافی دیر سے اپنے آپ میں گم تھے۔ آخرکار پھوڑا دہلوی اس خاموشی سے تنگ آ گئے۔

''اب کوئی کچھ تو بولے، خاموشی کا پردہ چاک تو کرے۔'' وہ گویا ہوئے۔

''کیا کہیں...... کیا بولیں......؟'' بکواس پوری نے سرد آہ بھری۔ ''ہم تو شاعر لوگ ہیں...... ہماری بکواس سنتا کون ہے......''

''واہ...... سبحان اللہ...... جملے میں اپنا تخلص کتنی خوب صورتی سے پرویا ہے، آپ نے...... واہ واہ''۔ بال دھنکوی جھوم اٹھے۔ بے ساختہ ان کے ہاتھ اپنے بالوں کی طرف گئے۔ لیکن پھوڑا دہلوی نے فوراً ہی انہیں روکا۔

''رہنے دیجئے...... آپ کے سر پر ویسے ہی بہت کم بال رہ گئے ہیں۔'' پھوڑا دہلوی نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

بال دھنکوی فوراً ہی اپنی حرکت سے تائب ہو گئے۔ ورنہ ان کا ارادہ بال دھننے کا تھا۔

اسی وقت چوتھا آدمی ان کے قریب کھسک آیا۔ اور کافی جوش سے بولا۔ ''کیا آپ لوگ شاعر ہیں......؟''

''ہاں بھئی...... ہم شاعر ہیں۔'' پھوڑا دہلوی نے جواب دیا۔

''اوہ......'' اس آدمی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''میں کتنا خوش قسمت ہوں...... میرے دل کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ کسی شاعر سے ملوں...... لیکن آج اکٹھے تین شاعروں سے ملاقات نصیب ہو گئی۔''

یہ کہہ کر وہ اٹھا، اور باری باری تینوں سے مصافحہ بھی کیا اور عقیدت سے ان کے ہاتھ بھی چومے۔ تینوں شاعروں کی مسرت کا کیا پوچھنا......؟ اتنی عزت تو کبھی ان کی گھر میں نہیں ہوئی تھی۔ گھر والے بھی ان کی شاعرانہ بک بک سے بیزار رہتے تھے۔ اتنی عزت اور تعظیم ملنے پر وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔

''اور میں آپ لوگوں کا کلام بھی سنوں گا۔'' اس نے ایک اور دھماکہ کیا۔

تینوں کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ان کا کلام سنتا کون تھا......؟ شاعروں سے تو ویسے بھی لوگ دور ہی بھاگتے ہیں۔

''آپ تو واقعی اہل ذوق ہیں۔'' پھوڑا دہلوی خوش ہو کر بولے۔ ''آپ کا نام گرامی کیا ہے......؟''

''میرا نام منصور ہے۔'' اس نے بتایا۔

''کہاں رہتے ہیں آپ......؟'' بال دھنکوی نے پوچھا۔

''سولی پر۔'' اس کا جواب تھا۔

''بھئی واہ...... کیا جواب دیا ہے...... بھئی واہ......'' بال دھنکوی کے دونوں ہاتھ بے ساختہ اپنے بالوں کی طرف گئے، لیکن پھوڑا دہلوی

نے پھر انہیں روکا۔

بال دھنکوی نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ اور دوبارہ اس آدمی کی طرف متوجہ ہوئے، جس نے اپنا نام منصور بتایا تھا۔ ”واہ میاں...... آپ تو بذلہ سنج بھی ہیں۔“

”بذلہ سنج تو خیر کیا ہوں......“ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ ”یہ حقیقت ہے کہ میں واقعی سولی پر ہوں۔“

”اوہو...... ایسا کیا ہوا بھئی......“ بال دھنکوی نے چونک کر پوچھا۔

”چھوڑیے...... خاک ڈالیے...... یہ بتایئے کہ آپ لوگوں کے کلام کہاں کہاں شائع ہوئے ہیں......؟“ اس نے موضوع بدلا۔

”تمام مشہور ڈائجسٹوں اور رسالوں میں......“ بکواس پوری فوراً بولے۔

”بھئی...... ہمارے بغیر تو ہر ڈائجسٹ کی بزم پھیکی ہے۔“ پھوڑا دہلوی فخریہ انداز میں مسکرائے۔

”ہوں......“ اس نے پرخیال انداز میں سر ہلایا۔ ”اس کا مطلب یہ ہے کہ ”ماہنامہ بلبل“ میں بھی آپ کی غزلیں چھپی ہوں گی......؟“

”بالکل...... بالکل...... بہت سی غزلیں شائع ہوئی ہیں۔“ بال دھنکوی نے فوراً کہا۔

”آپ لوگوں کا کلام ”روزنامہ دم دار“ میں بھی شائع ہوتا ہوگا؟“ منصور نے پھر پوچھا۔

”ہاں بھئی...... اس میں بھی ہم لوگوں نے خوب لکھا ہے...... بھئی وہ تو ادبی پرچہ ہے۔“ بال دھنکوی نے وضاحت کی۔

”اور ”لشکاراں“ میں بھی آپ لوگوں کا کلام آتا ہوگا؟“ منصور نے پھر پوچھا۔

”وہ تو ہمارے بغیر ادھورا ہے۔“ بکواس پوری نے سینہ ٹھوکا۔ عین اسی وقت ٹرین کی رفتار سست ہونے لگی۔ شاید کوئی اسٹیشن آنے والا تھا۔

☆......☆......☆

ٹرین اب رک چکی تھی۔ منصور خاموشی سے شاعروں کو دیکھتا رہا۔ وہ تینوں بھی ”اک ادا“ سے اس پر نگاہ التفات ڈالے رہے۔

”میں نے ماہنامہ ”کھوٹا لوٹا“ میں ایک قطعہ پڑھا تھا۔“ منصور نے تھوڑی دیر بعد کہنا شروع کیا۔ ”وہ قطعہ پڑھے ہوئے مجھے پانچ سال کا عرصہ گزر چکا ہے، لیکن میں اب تک اسے بھول نہیں سکا۔“

”اوہ...... ”کھوٹا لوٹا“ میں تو میری غزلیں بہت شائع ہوئی ہیں۔“ پھوڑا دہلوی چونکے۔

”بھئی...... ہماری بھی غزلیں اس میں کم تھوڑی لگی ہیں۔“ بکواس پوری بھی بولے۔

”میرے پاس تو ان کے دفتر سے فون آتے تھے......“ بال دھنکوی کیوں چپ رہتے۔ ”ایک دفعہ میری غزل ان کے پاس دیر سے پہنچی تھی، آپ لوگ یقین کریں کہ انہوں نے اس ماہ کا پرچہ بھی لیٹ کر دیا تھا۔“

”اس کا مطلب یہ ہے۔“ منصور نے سر ہلایا۔ ”کہ وہ قطعہ آپ تینوں میں سے کسی کا ہوگا۔“

”کون سا قطعہ ہے وہ......؟“ بال دھنکوی نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

”بتاتا ہوں۔ اور مجھے اس کی تشریح بھی چاہیئے۔“ منصور نے کہا۔

”ارشاد...... ارشاد“ بکواس پوری سر ہلا کر بولے۔ منصور نے تینوں پر ایک گہری نظر ڈالی اور قطعہ پڑھا۔

تک ڈم تک ڈم
اک ہو گئے تم اور ہم
چیتھڑے اڑ گئے دل کے
الفت کا پھٹ گیا بم

یہ سنا کر منصور خاموش ہو گیا۔

”یہ کیسا قطعہ ہے......؟“ بال دھنکوی کے منہ سے نکلا۔

”یہ ماہنامہ ”کھوٹا لوٹا“ میں ہی شائع ہوا تھا۔“ یہ کہہ کر منصور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اس کے چہرے کے تاثرات بدل چکے تھے۔ چہرے پر غصہ نمودار ہو چکا تھا۔ آنکھیں بھی آہستہ آہستہ سرخ ہو رہی تھیں۔ تینوں حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔ اچانک ہی منصور دھاڑا۔ ”اب تم لوگ مجھے اس قطعہ کا مطلب بتاؤ......“

”مم...... مطلب...... ہم...... ہم کیا بتائیں......؟“ بال دھنکوی کی زبان لڑکھڑا گئی۔

”بتاؤ......“ وہ پھر بلند آواز سے چیخا۔ ”جلدی بتاؤ...... تم لوگ ہی لکھتے ہو ”کھوٹا لوٹا“ میں...... اب بتاؤ......“

”بھئی...... یہ ہمارا قطعہ ہے ہی نہیں۔ ہم کیا بتائیں؟“ چھوڑا دہلوی بے چارگی سے بولے۔

”ٹھہرو......“ منصور آگے بڑھا۔ ”تم لوگ ایسے نہیں بتاؤ گے۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک ہاتھ سے بال دھنکوی کا سر تھاما اور دوسرے ہاتھ سے چھوڑا دہلوی کا، درمیان میں بکواس پوری موجود تھے۔

اب منصور نے ان تینوں کے سر آپس میں ٹکرا دیئے۔ ”اب بتاؤ قطعہ کا مطلب...... جلدی سے بتاؤ“ شاعر چلانے لگے۔ منصور نے انہیں چھوڑا نہیں تھا۔ اس نے پھر وہی حرکت کی۔ اب وہ کوئی وحشی درندہ لگ رہا تھا۔

”ارے...... ارے...... ارے بھئی۔“ شاعروں نے اب شور بھی مچانا شروع کر دیا۔ اس ناگہانی افتاد نے انہیں بوکھلا دیا تھا۔ تینوں کے چہرے فق ہو رہے تھے، سٹی کہیں گم تھی۔

”ارے بچاؤ...... ارے کوئی ہے......؟“

اور پھر وہ ان تینوں پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور اطمینان سے بولا۔ ”اب بتاؤ......؟ اس قطعہ کا آخر مطلب کیا ہے؟“

☆......☆......☆

سلیم اس وقت خوش گوار موڈ میں اپنی دکان پر موجود تھا۔ اس ''خوش گواری'' کی وجہ وہ عورتیں تھیں، جو ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کی دکان سے ٹھیک ٹھاک قسم کی خریداری کر کے گئی تھیں۔

اب اسے پورے دن کی سیل کی قطعی پرواہ نہیں تھی۔ وہ ایسے تو لاکھ چغد سہی، لیکن دکان داری کے معاملے میں بڑا گھاگھ تھا۔ گاہکوں کو عموماً چہرہ شناسی کے ذریعے ''کاٹتا'' تھا۔

اس کی دکان میں دو سیلز مین بھی تھے، جو اس وقت بکھرے ہوئے تھانوں کو سمیٹ کر ان کی مخصوص جگہوں پر رکھنے میں مصروف تھے۔

سلیم نے گلے سے پیسے نکال کر گنے، پھر واپس رکھے اور اپنے نوکروں کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''اشرف......! جاؤ یار...... دو چائے تو لے آؤ...... تھوڑی سستی سی ہو رہی ہے۔''

''واہ سلیم بھائی......!'' اشرف نامی سیلز مین خوش ہو کر بولا۔ ''بالکل دل کی بات کہی ہے آپ نے۔'' یہ کہہ کر اس نے چھلانگ ماری اور دکان سے باہر نکل گیا۔

''یہ تو چرسی ہے چائے کا۔'' دوسرا سیلز مین ہنسا۔

سلیم بھی خواہ مخواہ ہنس دیا۔ عین اسی وقت ایک برقعہ پوش عورت اندر داخل ہوئی۔ اس نے اپنے سر پر اچھی طرح اسکارف باندھا ہوا تھا، اور صرف آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ سلیم کی نظر اس پر پڑی، اور اسے ایسا لگا جیسے وہ عورت جانی پہچانی ہو، لیکن ذہن پر زور دینے کے باوجود اسے یاد نہ آ سکا کہ عورت کو کب اور کہاں دیکھا تھا۔

اتنی دیر میں وہ عورت اس کے سامنے والے اسٹول پر آ کر دھم سے بیٹھ گئی۔ ''اف...... کتنی گرمی ہے۔'' عورت نے اپنا دایاں ہاتھ چہرے کے سامنے جھلاتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی اس نے چھت کی طرف دیکھا، جہاں پنکھا چل رہا تھا۔

''نہیں...... بی بی...... گرمی تو آج بالکل نہیں ہے۔'' سلیم نے نفی میں سر ہلایا۔

''مجھے تو لگ رہی ہے۔'' وہ عورت گویا پھٹ پڑی۔ ''کیسے دکان دار ہو......؟ تمہیں یہی نہیں پتا کہ جو بات گاہک کہے، وہ درست ہوتی ہے۔''

''اوہ...... ہاں۔'' سلیم شرمندہ سا ہو گیا۔ ''واقعی...... آج بہت گرمی ہے۔''

''یہ ہوئی نا بات......'' عورت خوش ہو گئی۔

''اب بتائیے...... میں آپ کی کیا خدمت کروں......؟'' سلیم نے اکتا کر پوچھا۔ ایسے گاہکوں سے اس کا واسطہ پڑتا رہتا تھا۔

''مجھے...... دو گز لٹھا چاہیے......'' اس نے بتایا۔

''لٹھا......؟ دو گز......؟'' سلیم چونکا۔

''ہاں......'' وہ اطمینان سے بولی۔ ''آپ نے وہ شعر تو سنا ہو گا......

جائے گا جب یہاں سے کوئی نہ پاس ہوگا
دو گز کفن کا ٹکڑا تیرا لباس ہوگا

''ہاں ...... سنا ہے۔'' سلیم کے منہ سے نکلا۔

''بس تو پھر ...... مجھے ایک انسان کے لئے وہی چاہئے۔'' عورت ٹھنک کر بولی۔

''کک ...... کس کے لئے ......؟'' سلیم نے پوچھا۔

''اپنے سابقہ شوہر کے لئے۔ اس نے مجھے طلاق دے دی ہے۔'' عورت نے بتایا۔

سلیم نہ جانے کیوں چونک سا گیا۔ پھر اس نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ''کیا انہوں نے انتقال کے وقت آپ کو طلاق دی تھی؟''

''نہیں طلاق کے بعد وہ قابل انتقال ہوگیا ہے۔'' عورت کے لہجے میں نفرت سی عود کر آئی۔

''کیا مطلب ......؟'' سلیم کے لہجے میں الجھن تھی۔

''مجھ جیسی بیوی کو طلاق دے کر اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔'' عورت کا لہجہ سخت تھا۔

''بالکل ...... بالکل۔'' سلیم نے فوراً سر ہلایا۔ ''آپ تو کافی سگھڑ اور نفیس خاتون دکھائی دے رہی ہیں۔ کوئی بدھو یا احمق ہی ہوگا، جو آپ کو طلاق دے گا۔''

''ہے نا ......!'' عورت خوش ہو کر چہکی۔ ''ہوگا نا ...... وہ احمق ...... پاگل ......؟''

''سو فی صد ہوگا۔'' سلیم نے جوش میں آ کر گلے پر مکا بنا کر ہاتھ مارا۔ یہ اور بات ہے کہ بعد میں اسے اپنا ہاتھ سہلانا پڑا۔

''خود ہی مان لیا۔'' عورت آہستہ سے بڑبڑائی۔

''کیا کہہ رہی ہیں آپ ......؟'' سلیم سن نہیں سکا تھا۔

''میں یہ کہہ رہی تھی کہ آپ نے مان لیا، لیکن وہ کم بخت نہیں مانا، اور اس خبیث نے مجھے طلاق دے دی۔'' عورت نے بتایا۔

''بہت گھٹیا انسان ہے وہ۔'' سلیم مسلسل اسے مکھن لگا رہا تھا، اس کی کسٹومر جو تھی، پھر وہ چونکا۔ ''لیکن ...... اس نے آپ کو طلاق کیوں دی؟''

''میرے سر پر سینگ ہیں نا ...... اس لئے ......'' اس عورت نے دردناک آواز میں بتایا۔

لمحہ بھر کے لئے سلیم خجل سا ہو گیا۔ سیلز مین بھی منہ چھپا کر ہنسنے لگا۔ ورنہ وہ بھی تھان چھوڑ چھاڑ کر ان دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔

''شاید آپ بتانا نہیں چاہتیں ...... خیر چھوڑیں ......'' سلیم نے اپنی شرمندگی مٹانے کے لئے خواہ مخواہ بات بنائی۔

''میں غلط نہیں کہہ رہی۔ آپ کو یقین نہیں آ رہا ......؟ یہ دیکھیں۔'' اتنا کہہ کر اس عورت نے اسکارف ہٹا دیا۔

اسکارف ہٹتے ہی اس کا صرف سر نمایاں ہوا، اور ان دونوں کے لئے یہ بھی بہت تھا۔ ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ کیونکہ اس عورت

کے سر پر واقعی دو سینگ موجود تھے۔

سیلز مین نے اسی وقت خوف زدہ ہو کر ''بھوت...... بھوت'' کا نعرہ لگایا، دکان کے تخت کے اوپر سے چھلانگ ماری اور یہ جا وہ جا۔ رہا بے چارہ سلیم...... تو وہ...... سینگوں کو دیکھ کر اپنے حواسوں میں کب رہا تھا۔ وہ اسی وقت دھڑام سے گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ اسے پھر اتنا بھی ہوش نہ رہا تھا کہ وہ یہی دیکھ لیتا کہ اس عورت کے کدھر سینگ سمائے اور وہ کدھر گئی۔

☆......☆......☆

پھوڑا دہلوی نے اس کے نیچے سے نکلنے کے لئے زور لگایا اور دو چار انچ آگے سرکے بھی، لیکن منصور نے مزید زور دے کر ان کی کوشش ناکام بنا دی۔

''ابے...... بھاگ کہاں رہا ہے؟'' وہ گستاخی پر اتر آیا۔ ''مطلب سنے بغیر میں تم تینوں کی جان نہیں چھوڑوں گا۔ بتاؤ...... مطلب...... اور اس قطعہ کا مقصد بھی بتاؤ...... جلدی کرو......''

''ارے...... کوئی ہے؟ بچاؤ...... ہمیں بچاؤ۔'' بکواس پوری نے پوری قوت سے چلا کر کہا۔ ہڈیاں سرمہ ہوئی جا رہی تھیں۔

''کسے بلا رہا ہے......؟'' منصور خونخوار لہجے میں بولا۔ ''ان ڈائجسٹوں کے ایڈیٹروں کو...... ہاہاہا...... ابے...... یہ ایڈیٹر لوگ نہ سنتے ہیں اور نہ پڑھتے ہیں۔ اگر یہی لوگ سن لیں، دیکھ لیں اور پڑھ لیں تو تم جیسے لوگوں کی غزلیں کیوں شائع ہوں......؟ بتا...... بتا...... مجھے اس قطعہ کا مطلب بتا......''

اب اس نے دونوں ہاتھ آگے بڑھائے اور بکواس پوری کے ساتھ ساتھ پھوڑا دہلوی کی گردن بھی ناپ لی، گرفت خاصی مضبوط تھی۔

عین اسی وقت کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا اور ایک لمبے قد کا تندرست سا جوان آدمی اندر داخل ہوا۔ اس کے عقب میں چار آدمی اور بھی تھے۔

لمبے آدمی نے کمپارٹمنٹ کا منظر دیکھا اور فوراً ہی اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔ ''جلدی کرو...... پکڑو...... منصور کو...... جلدی۔''

چاروں جلدی سے آگے بڑھے اور شاعروں پر لدے ہوئے منصور کو پکڑ لیا۔ منصور چونکا اور پھر ان لوگوں پر نظر پڑتے ہی یکا یک خوف زدہ دکھائی دینے لگا۔ اس نے فوراً ہی شاعروں کی جان چھوڑ دی۔

پھوڑا دہلوی وغیرہ کی جان میں جان آئی۔ وہ اپنی گردنیں مسلتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے، اور اپنے محسنوں کی طرف دیکھا۔

''کون ہیں آپ...... اگر آپ لوگ نہیں آتے تو ہم تینوں ملک عدم روانہ ہو جاتے۔'' پھوڑا دہلوی نے طویل سانس لے کر کہا۔

''میں پاگل خانے کا انچارج ہوں۔'' لمبے قد والے نے بتایا۔ ''اسی کو پکڑنے کے لئے ہم نے ٹرین رکوائی ہے۔ دراصل...... یہ شخص پاگل ہے۔''

''پپ...... پاگل ہے......؟'' بال دھنکوی کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

''ہاں...... پاگل ہے......؟ اور پاگل بھی بہت خطرناک قسم کا ہے۔ یہ صبح پاگل خانے سے فرار ہوا تھا...... اور اب ہمارے ہاتھ لگا ہے۔ یہ آپ لوگوں سے یقیناً ٹک دَم والے قطعہ کا مطلب پوچھ رہا ہوگا؟'' انچارج نے دریافت کیا۔

''ہاں...... ہاں...... وہی پوچھ رہا تھا۔'' بکواس پوری جلدی سے بولے۔

منصور اب چاروں آدمیوں کی گرفت میں تھا، اور خالی خالی آنکھوں سے سب کو گھور رہا تھا۔

''یہ بے چارہ...... '' انچارج نے منصور کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''اچھا خاصا نارمل انسان تھا، شاعری سے اسے دلی لگاؤ تھا، لیکن موجودہ دور کی شاعری نے اسے دلی صدمہ پہنچایا ہے۔ نئی شاعری نے اس کے دل و دماغ پر اتنا اثر کیا کہ بے چارہ پاگل خانے جا پہنچا۔''

یہ سن کر تینوں شاعر چور نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ''چلو بھئی ...... لے چلو اسے۔'' انچارج نے اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہاں صرف تینوں شاعر موجود تھے۔ منصور جا چکا تھا۔ تینوں اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے، پھر بکواس پوری نے کھوئے کھوئے سے انداز میں کہا۔

''کیا ہم لوگ واقعی بکواس کرتے ہیں......؟''

☆......☆......☆

دجّال (شیطان کا بیٹا)

انگریزی ادب سے درآمد ایک خوفناک ناول۔ علیم الحق حقی کا شاندار اندازِ بیاں۔ شیطان کے پجاریوں اور پیروکاروں کا نجات دہندہ شیطان کا بیٹا۔ جسے بائبل اور قدیم صحیفوں میں بیسٹ (جانور) کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ انسانوں کی دُنیا میں پیدا ہو چکا ہے۔ ہمارے درمیان پرورش پا رہا ہے۔ شیطانی طاقتیں قدم قدم پہ اسکی حفاظت کر رہی ہیں۔ اسے دُنیا کا طاقتور ترین شخص بنانے کے لیے مکروہ سازشوں کا جال بنا جا رہا ہے۔ معصوم بے گناہ انسان، دانستہ یا نادانستہ جو بھی شیطان کے بیٹے کی راہ میں آتا ہے، اسے فوراً موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔

دجال...... یہودیوں کی آنکھ کا تارہ جسے عیسائیوں اور مسلمانوں کو تباہ و برباد اور نیست و نابود کرنے کا مشن سونپا جائے گا۔ یہودی کس طرح اس دُنیا کا ماحول دجال کی آمد کے لیے سازگار بنا رہے ہیں؟ دجالیت کی کس طرح تبلیغ اور اشاعت کا کام ہو رہا ہے؟ دجال کس طرح اس دُنیا کے تمام انسانون پر حکمرانی کرے گا؟ 666 کیا ہے؟ ان تمام سوالوں کے جواب آپ کو یہ ناول پڑھ کے ہی ملیں گے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ آپ اس ناول کو شروع کرنے کے بعد ختم کر کے ہی دم لیں گے۔ دجال ناول کے تینوں حصے کتاب گھر پر دستیاب ہیں۔

مالوط کے لئے اپنی ہنسی پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے بہ مشکل تمام، بوقاف کو اپنی کارگزاری سے آگاہ کیا۔

بوقاف نے سلیم کی درگت کا دل ہی دل میں تصور کیا اور جھلا کر بولا۔ ”تم آخر کیوں اس شریف آدمی کے پیچھے سینگ دھو کر پڑ گئے ہو؟“

”تم بھول گئے...... وہ تمہارا رقیب ہے۔“

”ہونے دو...... رحم کرو اس کے حال پر۔“

”بات دراصل یہ ہے بوقاف کہ...... مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے۔“ مالوط نے سر جھکا کر کہا۔

بوقاف نے گھور کر اسے دیکھا۔ ”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے......؟ کیا فرانس کی شہریت لینے کا ارادہ ہے؟“

”ارے نہیں......“ مالوط ہنسا۔ ”اسے تنگ کرنے میں مجھے نہ جانے کیوں بہت مزا آتا ہے۔ بڑا بھولا بھالا سا انسان ہے۔“

”گویا بھولا بھالا ہونا کوئی جرم ہے۔“ بوقاف نے اسے گھورا۔ ”ہمارے تمام معصوم انسان پکڑ لیں، اور ان کے معصوموں پر ہم قبضہ کر لیں۔ کیوں......؟“

یہ سن کر مالوط سر کھجانے لگا۔

”اسے خواہ مخواہ تنگ مت کرو۔“ بوقاف نے پھر کہا۔ ”ہاں...... اگر وہ دوبارہ مہ پارہ کی طرف بڑھے تو پھر کچھ کرنا، لیکن وہ بھی دائرے میں رہ کر۔“

”اچھا دوست...... اب یہی ہوگا۔“ مالوط دھیرے سے مسکرایا۔

☆......☆......☆

چچا تندوری جواب دینے کے بجائے ملو استاد کو گھورنے لگے۔ ملو استاد گھبرا گیا۔ فوراً بولا۔ ”کیا ہوا چچا......؟ ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟ کیا میں نے تمہیں باندھا تھا؟“

”تمہاری کمر پہ پر ہیں؟“ چچا نے منہ ٹیڑھا کر کے پوچھا۔

ملو استاد نے فوراً اپنی کمر ٹٹولی۔ ”نہیں۔“

”تمہارے سر پر سینگ ہیں؟“

”نہیں......“ ملو استاد نے اب کے سر ٹٹولا۔

”تو پھر...... تم مجھے کیسے باندھ سکتے ہو؟“ چچا تندوری نے برا سا منہ بنایا۔

”ایسا منہ مت بنایا کرو چچا......“ کلو چرسی نے ٹوکا۔ ”ویسے ہی کیا کم بگڑا ہوا ہے تمہارا تھوبڑا......؟“

”تو نے اپنی شکل دیکھی ہے آئینے میں......؟“ چچا کے چہرے کا زاویہ اور بگڑ گیا۔

”روز دیکھتا ہوں......“ وہ بولا۔

''ڈر نہیں لگتا؟'' چچا بولا۔ ''چرس پی پی کر بالکل دھوتر مچھلی جیسی شکل ہوگئی ہے۔''

''اسے کچھ مت کہو چچا......'' کلو چرسی نے وارننگ دی۔

''کسے......دھوتر مچھلی کو؟'' انہوں نے پوچھا۔

''نہیں......میری شکل کو......میں روزانہ مہنگی والی کریم چہرے پر لگاتا ہوں۔''

''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے چچا......'' ملو استاد نے بھی دخل دیا۔

''اچھا استاد......! اب ایسی باتیں ہوں گی؟'' کلو چرسی نے شکوہ کیا۔

''ایسی بھی......اور بالکل بے تکی بھی......'' چچی بولیں، جو بڑی دیر سے خاموش تھیں۔ ''تم لوگ الٹی سیدھی باتیں کیے جا رہے ہو......ارے ان سے یہ تو معلوم کرلو کہ کس نے انہیں باندھا تھا۔''

''ان کو باندھنا کسی انسان کے بس کی بات تو نہیں ہے۔'' ملو استاد نے نفی میں سر ہلایا۔ ''چچا نے ابھی بتایا تو تھا کہ اس کے پر بھی تھے اور سینگ بھی۔''

''ایسا کوئی جانور میں نے تو کبھی نہیں دیکھا۔'' کلو چرسی کے لہجے میں حیرت تھی۔

''خود تمہارے بارے میں بھی پورے محلے کا یہی خیال ہے۔'' چچا تندوری نے سر ہلا کر کہا۔

کلو چرسی پہلے تو خوش ہوا، لیکن جب بات اس کی سمجھ میں آئی تو وہ ایک طرف دبک گیا۔

''ہاں چچا......! اب بتاؤ......تمہیں جس نے باندھا تھا، اس کے واقعی سینگ اور پر تھے؟'' ملو استاد نے پوچھا۔

''نہیں......'' چچا جھنجھلائے۔ ''میں نے خود لگائے تھے۔''

''بتاؤ نا چچا......؟''

''بتا تو دیا کہ اس کے سینگ اور پر تھے، بلکہ وہ ایک نہیں دو تھے۔''

''افوہ......دو تھے......؟''

''دو ہزار بھی ہوتے تو کیا ہوا......؟''

''تمہیں ڈر نہیں لگا چچا......؟'' کلو چرسی سے رہا نہ گیا، وہ پوچھ بیٹھا۔

''روز تمہاری شکل دیکھتا ہوں۔ تم سے نہیں ڈرا، تو ان سے کیا ڈرنا؟'' چچا نے مسکرا کر کہا۔

ایک بار پھر کلو چرسی کا منہ لٹک گیا۔ عین اسی وقت دور کسی مرغے کی بانگ سنائی دی۔ چچا ایک جھٹکے سے کھڑے ہوگئے۔

''ٹھہر جا کم بخت......'' انہوں نے نتھنے پھلا کر کہا اور دروازے کی طرف لپکے۔

تینوں انہیں روکتے ہی رہ گئے، لیکن وہ کہاں رکنے والے تھے۔ پھر ان کے باہر نکل جانے کے بعد کلو چرسی، چچی کی طرف مڑا۔

”یہ بتاؤ چچی کہ دنیا میں چچا پہلے آئے تھے یا مرغا......؟“

☆......☆......☆

رات کے گیارہ بج چکے تھے، اور حکیم طولانی کے گھر کی چھت پر رونق میلہ لگا ہوا تھا۔ گاگے شاہ، چنگا اور منگا، برکت صاحب، حکیم طولانی، پھوڑا دہلوی، بکواس پوری اور بال دھنکوی کے علاوہ چچا تندوری بھی کلو چرسی اور ملو استاد کے ساتھ یہاں موجود تھے۔

گو کہ ان تینوں کو مشاعرے کی دعوت نہیں ملی تھی، لیکن اس کے باجود یہ تینوں آدھمکے تھے۔ اب چچا تندوری کو وہاں سے کون نکالتا......؟ انہوں نے جب سے خونی بلا شمولا کی درگت بنائی تھی، پورے محلے پر ان کی دھاک بیٹھ چکی تھی۔

خیر......چھت پر ایک جانب مہمان خصوصی یعنی گاگے شاہ کے لئے دو عدد گاؤ تکئے رکھ دیئے گئے تھے۔ ان کے برابر میں ہی کلام سنانے کے لئے شاعر کی جگہ بنا دی گئی تھی، جہاں بکواس پوری جیسے لوگ آ کر اپنی بکواس سے لوگوں کو بور کر سکتے تھے۔ دری پر سب سے پیچھے چچا تندوری، ملو استاد اور کلو چرسی تشریف فرماتے۔

مشاعرہ شروع ہونے ہی والا تھا، شاعروں کی قطار الگ ہی تھی۔

”دیکھو تو چچا......“ ملو استاد نے چچا تندوری کے کان میں سرگوشی کی۔ ”ان شاعروں کو غور سے دیکھ لو......تم کبھی شاعری مت کرنا، ورنہ ایسے ہی ہو جاؤ گے......دیکھو تو......کیسے الو لگ رہے ہیں۔“

”ابے چپ کر......“ چچا تندوری نے اسے جھڑکا۔

”جاہل کے بچے......! یہ لوگ تو ہمارے ملک کا سرمایہ ہیں۔ تمہیں کیا معلوم......!“

”سرمایہ کسے کہتے ہیں چچا؟“ کلو چرسی نے الجھ کر پوچھا۔ ”تل کر کھانے کو یا ابال کر پینے کو......؟“

”تمہارے سر کو اور غریب کی جیب کو کہتے ہیں۔“ وہ جل کر بولے۔ ”کیونکہ دونوں ہی خالی پائے جاتے ہیں......بے وقوف......!“

ملو استاد ہنس پڑا۔ کلو چرسی نے برا سا منہ بنا لیا تھا۔

اتنی دیر میں حکیم طولانی اٹھ کھڑے ہوئے اور ”سامعین“ پر نظر ڈال کر گویا ہوئے۔ ”خواتین تو یہاں ہیں نہیں، اس لئے حضرات ہی حضرات......! آداب عرض ہے۔“

ان کی بات پر ایک شور سا اٹھا۔

”ان کو بھی بلا لیتے......اس قابل نہیں ہو کیا......؟“ ملو استاد نے ہانک لگائی۔

جب شور ختم ہوا تو حکیم طولانی دوبارہ بولے۔

”ہمارے اس مشاعرے کے مہمان خصوصی پیر گاگے شاہ صاحب ہیں، جن کی بدولت ہمارے قصبے کو ان سے نجات ملی......مم......میرا مطلب ہے۔“ وہ گڑبڑا گئے۔

سامعین نے تالیاں بجادیں۔ فوراً ہی حکیم طولانی نے دوبارہ گفتگو کا سلسلہ جوڑا۔ ”میرا مطلب ہے کہ ان کی بدولت ہمارے قصبے کو جن سے نجات ملی۔ تو...... سامعین...... آج کی محفل گاگے شاہ صاحب کے نام ہے۔“

سب نے دوبارہ تالیاں بجائیں۔ گاگے شاہ نے ہاتھ اٹھا کر تالیوں کا خیر مقدم کیا۔

”حالانکہ اصولاً مجھے اپنا کلام پہلے سنانا چاہئے۔“ حکیم طولانی نے پھر کہنا شروع کیا۔ ”لیکن میں دعوت دے رہا ہوں، جناب پھوڑا دہلوی کو، کہ...... وہ آئیں اور اپنے کلام سے ہمیں نوازیں۔ جناب پھوڑا دہلوی صاحب......“

یہ کہہ کر وہ بیٹھ گئے اور تالیوں کی گونج میں پھوڑا دہلوی مخصوص نشست پر آگئے۔

”تو سامعین! عرض کیا ہے کہ......“ یہ کہہ کر پھوڑا دہلوی نے کھنکھار کر پہلے گلہ صاف کیا اور پھر مترنم آواز میں گویا ہوئے۔

کیسے تو نے میرا دل توڑا ہے
کیا تیرے ہاتھ میں ہتھوڑا ہے

”واہ...... واہ۔ بہت خوب......“ گاگے شاہ جھوم اٹھے۔ ”کیا استعمال کیا ہے، ہتھوڑے کا جواب نہیں۔ مکرر مکرر۔“

”آداب عرض ہے......“ پھوڑا دہلوی مسکرائے اور دوبارہ غزل شروع کی۔

کیسے تو نے میرا دل توڑا ہے
کیا تیرے ہاتھ میں ہتھوڑا ہے

اور

میں بنا ڈالوں اک اور صنم
تو نے اس قابل کہاں چھوڑا ہے

اور عرض کیا ہے کہ

ابھی تک درد ہے میری گردن میں
اس نے مارا ہے ، پھر نچوڑا ہے
سوار ہو کر میرے حواسوں پر
کہا اس نے یہ میرا گھوڑا ہے

”ابے گدھے......! بند کر یہ بکواس۔“ ملو استاد نے ہانک لگائی۔ لیکن پھوڑا دہلوی کا ”بیان“ جاری رہا۔

خواب میں آکے اس نے ماری لات
اس طرح نیند سے جھنجھوڑا ہے

فرش پر بن گیا میں اسٹیکر
اوپر ہی اوپر وہ میرے دوڑا ہے

''واہ بھئی......واہ......'' گاگے شاہ پھر جھوم اٹھے۔ ''بے کسی کی کیا عمدہ تصویر کشی کی ہے۔ واہ......''

پھوڑا دہلوی مسکرائے اور آگے بڑھے۔

ان کی زلفوں سے ہی کھیلیں گے
کہ ان کی ناک تو پکوڑا ہے
تھاما اس نے جو ملانے کے لئے
کیسے ظالم نے ہاتھ موڑا ہے

اور آخری شعر عرض ہے کہ

آپ کی پیٹھ پر ہوں گے دانے
آپ کے سامنے تو پھوڑا ہے

''واہ......واہ......'' سامعین نے ایک شور سا مچا دیا۔ پھوڑا دہلوی نے خوب داد وصول کی۔

''ابھی غزل کہاں ختم کر دی......'' کلوچری نے ہانک لگائی۔ ''ابھی ایک قافیہ تو باقی ہے......''

''کون سا قافیہ......!'' چچا تندوری نے چونک کر پوچھا۔ پھر کچھ سوچ کر کلوچری کی کمر پہ ایک زوردار مکا جڑ دیا۔

کلوچری کے دانت نکل پڑے۔ ملو استاد نے بھی اس کے گال پر چٹکی بھری تھی۔

اب باری تھی بکواس پوری کی، انہیں بلایا گیا، انہوں نے نشست سنبھالی، اور پھر سامعین پر ایک نظر ڈال کر گویا ہوئے۔ ''میں نے موجودہ دور کی شاعری کے بارے میں ابھی ابھی ایک غزل لکھی ہے، وہی آپ لوگوں کی نظر کر رہا ہوں، عرض کیا ہے......

جیسے کسی بڈھے کو زندگی سے توبہ بھلی
یوں مجھے بھی اب شاعری سے توبہ بھلی

''واہ......واہ......کیا بکواس کی ہے......مم......میرا مطلب یہ ہے کہ یہ غزل آپ کی ہے؟'' گاگے شاہ پہلے تو جھونک میں بولے اور پھر بکواس پوری سے پوچھا۔

چھت قہقہوں سے گونج اٹھی۔ بکواس پوری جھینپ سے گئے۔ پھر انہوں نے دوبارہ غزل کا سلسلہ جوڑا۔

تم سے کرتے ہیں کلام، تم سمجھتے ہو غلام
تم ہو آدمی تو ہمیں آدمی سے توبہ بھلی

قافئے مل جائیں بس، حاصل ہے یہ غزل کا
ایسے کسی شاعر کی ہم کو دوستی سے توبہ بھلی

”واہ رے...... تیری...... بکواس پوری نہیں ہوئی......؟“ ملو استاد نے پھر ہانک لگائی۔

”ابے...... نام ہی اس کا بکواس پوری ہے۔ تو پھر پوری پوری بکواس کر کے ہی ٹلے گا۔“ کلو چرسی بھی بور ہو رہا تھا۔

گاگے شاہ غور سے کلام سن رہے تھے۔ اچانک انہیں ایک عجیب سا احساس ہوا۔ انہوں نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر بے ساختہ ان کی نظریں آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ فوراً ہی چونکے اور ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

بکواس پوری کی بکواس جاری تھی۔ گاگے شاہ کا ذہن اب ان کی طرف سے ہٹ چکا تھا۔

پھر گاگے شاہ سرک کر برکت صاحب کی طرف آئے۔ گاگے شاہ نے ان کے کان میں سرسراتی ہوئی سرگوشی کی۔ ”یہاں سے نکلو...... ابھی میں نے بوقاف کو دیکھا ہے۔“

یہ سنتے ہی برکت صاحب کی ”شاعرانہ گردن“ ساکت ہو گئی۔ انہوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گاگے شاہ کی طرف دیکھا۔

☆......☆......☆

مہ پارہ چھت پر چلی آئی تھی، آج اسے کافی حد تک اطمینان تھا۔ کیونکہ گل بانو کے خراٹے نیچے گونج رہے تھے اور برکت صاحب مشاعرے میں شریک تھے، ان کی واپسی بھی صبح سے پہلے متوقع نہیں تھی۔ دو بجنے میں کچھ ہی دیر باقی تھی۔ وہ چھت پر ٹہلنے لگی۔ آج پھر بوقاف سے ملاقات تھی۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ بادلوں کی گڑگڑاہٹ ہوئی اور ایک بار پھر بوقاف اور مالوط، چھت پر نمودار ہو گئے۔

مہ پارہ کے دل کی دھڑکنیں ایک بار پھر بے ترتیب ہو گئیں۔ محبوب کو سامنے دیکھ کر خود پر قابو کہاں رہتا ہے۔ بوقاف آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے دل میں سمو لینا چاہتا تھا، مہ پارہ نے نظر جھکالی۔ مالوط نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ ”میں بھی آج کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں بھابھی جان......!“

مہ پارہ اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔ ”پہلے آپ یہ بتائیں کہ آپ نے پرسوں کیا ڈرامہ کیا تھا......؟“

”اوہ...... وہ......“ مالوط ہنسا۔ ”فوری طور پر جو کچھ سوجھا وہ کر ڈالا۔“

”ایسا فوری...... کہ مالوط سے یہ مالوطن ہو گئی۔“ بوقاف نے سر ہلا کر کہا۔ ”چلو...... مالوطن تو تسلیم، لیکن ساتھ میں تین عدد منے بھی۔“

وہ دونوں ہنس پڑے۔ بوقاف بھی اس ہنسی میں شامل ہو گیا۔ پھر مالوط نے کہا۔ ”اب میں درمیان سے ہٹتا ہوں...... آپ لوگ اپنی باتیں کریں۔“

وہ ایک طرف جا کر بیٹھ گیا۔ پھر بوقاف نے مہ پارہ پر ایک گہری نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”مالوط کی شرارت کا کیا اثر ہوا تھا......؟“

”وہ شرارت کافی سودمند ثابت ہوئی۔ میری امی تو اسی وقت کمرے سے باہر نکل آئی تھیں۔ اور پھر وہ لوگ...... یونہی چلے گئے۔“

”یونہی......؟ تمہارا مطلب یہ کہ وہ تمہیں اپنے ساتھ ہی لے جاتے؟“ بوقاف چونکا۔

”نہیں بھئی...... آپ تو بالکل ہی بدھو ہیں۔“ وہ چڑ گئی۔ ”میرا مطلب ہے کہ انہوں نے میرے متعلق بات چیت نہیں کی۔“

”اوہ...... اچھا۔“ بوقاف نے سر ہلایا۔ پھر محتاط انداز میں بولا۔ ”یہ بدھو کیا ہوتا ہے؟“

”یہ اصطلاح شوہر کے لئے استعمال ہوتی ہے۔“ مہ پارہ شرما کر بولی۔

بوقاف خوش ہو گیا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تم نے مجھے اپنا بدھو تسلیم کر لیا ہے؟“ بوقاف نے پر مسرت لہجے میں پوچھا۔

مہ پارہ نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روکی، اس کوشش میں اسے دوپٹہ منہ میں ٹھونسنا پڑا تھا۔

”یہ کیا کر رہی ہو......؟ کیا تمہیں بھوک لگ رہی ہے؟“ بوقاف نے چونک کر پوچھا۔

مہ پارہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اچانک زینے پر کچھ آہٹیں گونجیں۔ مہ پارہ اچھل پڑی، بوقاف نے چونک کر دیکھا اور مالوط بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

اور پھر اگلا لمحہ ایسا تھا کہ ان تینوں کے قدموں تلے سے چھت نکل گئی۔ زینے پر گاگے شاہ اور برکت صاحب کھڑے ہوئے خونخوار نظروں سے انہیں گھور رہے تھے۔

☆......☆......☆

محفل ادھوری ہو گئی تھی، کیونکہ گاگے شاہ اور برکت صاحب کسی کام سے اٹھ کر چل دیئے تھے۔ حکیم طولانی کا ارادہ تھا کہ تھوڑی دیر کے لئے مشاعرہ برخاست کر دیا جائے، لیکن چنگا اور منگا کے اصرار پر مشاعرہ جاری رکھا گیا۔

”ہم شاہ صاحب کو خود ہی غزلیں سنا دیں گے۔“ چنگا نے مونچھوں کو تاؤ دے کر کہا۔ ”ہمارا مزہ تو کر کرامت کرو حکیم فلاں نی......!“

”حکیم فلاں نی نہیں، طولانی......“ انہوں نے تصحیح کی۔

”یاد نہیں تھا......“ چنگا لاپروائی سے بولا۔ ”اسی لئے فلاں لگایا تھا۔“

”بلکہ ہم تو ڈھماکہ بھی لگا سکتے ہیں۔ آخر...... گاگے شاہ صاحب کے چیلے ہیں۔“ منگا نے فخریہ لہجے میں کہا۔

”بالکل ...... بالکل ......“ حکیم طولانی نے سر ہلایا۔ ”اور اگر میں نے ان سے شکایت کر دی تو وہ آپ دونوں کے جھانپڑ بھی لگا سکتے ہیں۔“

چنگا اور منگا کا منہ پھول گیا۔ بہر حال، مشاعرہ رکا نہیں تھا، بکواس پوری اپنا کلام سنا کر جا چکے تھے، اب باری تھی، بال دھنکوی کی، چنانچہ وہ نشست پر تشریف لے آئے۔ عرض کیا ہے

کسی دن تم کو آزمائیں گے
کسی دن حال دل سنائیں گے
کسی دن تم کو یاد رکھیں گے
کسی دن خود کو بھول جائیں گے

''واہ......مکرر......مکرر......'' حکیم طولانی نے تعریف کی۔ اس شعر کا نتیجہ یہ نکلا کہ بال دھنکوی نے اپنے بال دھننے شروع کر دیئے۔

''اماں......سنبھالو اسے......'' کلو چرسی چیخا۔ ''بڈھا پاگل ہو گیا ہے۔''

فوراً ہی چنگا اور منگا نے اٹھ کر بال دھنکوی کے دو ہاتھ جھاڑے تو وہ ہوش میں آئے۔ اور دوبارہ غزل کا سلسلہ جوڑا۔

کسی دن تم کو یاد رکھیں گے
کسی دن خود کو بھول جائیں گے

اور عرض کیا ہے

نہ زلف ہے، نہ کمر پتلی سی
کیسے ہم تیرا دل لبھائیں گے

اور اب آخری شعر عرض کیا ہے

کسی دن تو ملو گے ہم سے تم
کسی دن تم کو بال دکھائیں گے

یہ کہہ کر بال دھنکوی نشست سے اٹھ گئے۔ آخری شعر نے سب لوگوں پر سناٹا طاری کر دیا تھا۔

پھر کافی دیر بعد کسی کو خیال آیا اور اس نے تالی بجائی، پھر تو چھت تالیوں سے گونج اٹھی۔

☆......☆......☆

کریک ڈاؤن

طارق اسماعیل ساگرؔ کا ایک بہترین ولولہ انگیز، خون گرما دینے والا ناول۔ کشمیر حریت پسندوں اور سیاچن گلیشئرز پر لڑی جانے والی جنگوں کے پس منظر میں لکھا گیا بہترین ناول۔ جلد کتاب گھر پر آ رہا ہے، جسے **ناول** سیکشن میں دیکھا جا سکے گا۔

مہ پارہ کا تو یہ عالم تھا کہ کاٹو تو بدن میں خون نہیں، بوقاف کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ البتہ مالوط حیرت سے ”دونوں پارٹیوں“ کو تک رہا تھا۔ کبھی وہ بوقاف اور مہ پارہ کو دیکھتا اور کبھی برکت صاحب اور گاگے شاہ کو۔ البتہ اسے اتنا اندازہ ضرور تھا کہ بہت برے پھنسے ہیں۔

”تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے......“ گاگے شاہ بوقاف کی طرف دیکھ کر غرائے۔ ”تم انتہائی بے شرم اور ڈھیٹ ہو۔“

”مہ پارہ......!“ برکت صاحب نے درد بھرے لہجے میں مہ پارہ کو مخاطب کیا۔

”مجھے تم سے ایسی امید نہیں تھی۔ تم نے میرے دل کو شدید ٹھیس پہنچائی ہے۔ میرے اعتماد کا خون کیا ہے۔“

”مہ پارہ بے قصور ہے برکت......! یہ سب کیا دھرا اسی کم بخت کا ہے۔“

گاگے شاہ نے بوقاف کو غصے سے گھورا۔ ”اس نے مہ پارہ پر سوار ہونے کے بعد اسے اپنے اثر میں لے لیا ہے، یہ لڑکی اپنے حواسوں میں نہیں ہے۔ اسے کچھ مت کہو...... جاؤ مہ پارہ......! تم نیچے جا کر آرام کرو۔ جاؤ......“

مہ پارہ فوراً ہی زینے کی طرف لپکی اور برکت صاحب سے نظر بچاتی ہوئی نیچے اترتی چلی گئی۔

مہ پارے کے جانے کے بعد گاگے شاہ، برکت صاحب سے بولے۔ ”مجھے کیا معلوم تھا کہ نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی، ورنہ میں پہلے ہی اس کا انتظام کر دیتا۔ خیر...... تم فکر مت کرو...... لڑکی کا علاج ہو جائے گا، پہلے میں اس بدبخت کا علاج کر دوں۔“

یہ کہہ کر گاگے شاہ بوقاف اور مالوط کی طرف گھومے۔ ”تمہارے ساتھ نیا چہرہ دکھائی دے رہا ہے...... یہ کون ہے......؟“ ان کا اشارہ مالوط کی طرف تھا۔ پھر وہ خود ہی کندھے اچکا کر بولے۔ ”ہوگا کوئی تمہارا ہی سگا...... مجھے کیا......؟ لیکن اس بے چارے کی بھی تمہارے ساتھ ہی مٹی پلید ہوگی۔“

”ہم مٹی سے نہیں بنے۔“ مالوط بول اٹھا۔

گاگے شاہ نے اسے گھور کر دیکھا، بولے کچھ نہیں۔ ویسے وہ بے حد سنجیدہ دکھائی دے رہے تھے۔

”شاہ صاحب......! اس سے جان کیسے چھوٹے گی......؟“ برکت صاحب نے پوچھا۔

”تم فکر مت کرو برکت...... آج اس کا مکمل انتظام ہو جائے گا۔ سب سے پہلے تو یہ معلوم کرنا ہے کہ مہ پارہ اور ان میں رابطہ کس طرح ہوا......؟“

”جاؤ برکت......! مشاعرے میں سے چنگا اور منگا کو لے آؤ۔ آج پھر سردار کو بلایا جائے گا اور آج فیصلہ کن بات چیت ہوگی۔“

برکت صاحب جلدی سے سر ہلاتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ اب گاگے شاہ دوبارہ ان دونوں کی طرف متوجہ ہوئے۔

”جب تک میرے مرید نہیں آتے...... تم دونوں مرغا بن جاؤ۔“

☆......☆......☆

ادھر حکیم طولانی کو اب گاگے شاہ کی طرف سے تشویش لاحق ہو رہی تھی۔ کیونکہ وہ اور برکت صاحب کافی دیر سے محفل سے غائب تھے اور ابھی تک ان کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔

حکیم طولانی کو اپنا بھی کلام سنانا تھا، لیکن مہمان خصوصی کی غیر موجودگی میں وہ اپنا کلام پیش نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے ایک بار پھر پھوڑا دہلوی کو دعوت کلام دے ڈالی۔ پھوڑا دہلوی ایک بار پھر نشست پر آ گئے اور غزل سرا ہوئے۔

جب بھی تو اپنے گھر گئی بیگم!
میری عزت اتر گئی بیگم!

”واہ......واہ......واہ......“ چچا تندوری یہ شعر سن کر مست ہو گئے، تعریف کرتے ہوئے اٹھے اور جھومنے لگے۔

”پھر سے......پھوڑے......! پھر سے کہ......“ چچا تندوری نے بلند آواز سے فرمائش کی۔

”ذرا تمیز سے......ہاں......“ پھوڑا دہلوی نے ان کے انداز تخاطب پر نتھنے پھلا کر کہا، ساتھ میں چچا تندوری کو گھورا بھی تھا۔

چچا تندوری بھی جھومتے جھومتے رکے اور جواباً پھوڑا دہلوی کو گھورا۔ ”ابے سنا رہا ہے کہ ابھی بتاؤں تجھے ہیں......؟ ابھی تجھے پکڑ کر دبا دیا نا...... تو سارا مواد باہر آ جائے گا......پھوڑا کہیں کا......“ چچا تندوری نے بڑے اسٹائل سے کہا۔

ملو استاد اور کلو چرسی منہ دبا کر ہنسنے لگے۔ پھوڑا دہلوی اور تلملا گئے۔

”ایسے تو نہیں سناؤں گا۔“

”نہیں سنائے گا......“ چچا نے آنکھیں نکالیں۔

”نہیں......“ پھوڑا دہلوی اکڑ گئے۔

”سنا دو پھوڑے بھائی!“ کلو چرسی نے سمجھایا۔ ”تمہارا شعر ان پر بالکل فٹ بیٹھتا ہے......سنا دو۔“

چچا تندوری نے کلو کو گھورا۔ ادھر چنگا اور منگا بھی غور سے چچا تندوری کو دیکھ رہے تھے۔ خود حکیم طوالانی بھی اس صورت حال سے پریشان تھے۔

”قطعی نہیں سناؤں گا۔“ پھوڑا دہلوی کا اصرار تھا۔

”نکالوں کیا......؟“ چچا نے دھمکی دیتے ہوئے شلوار کے نیفے میں ہاتھ ڈالا۔ پھوڑا دہلوی کا رنگ اڑ گیا، جلدی سے بولے۔

”سناتا ہوں......سناتا ہوں......“ چچا نے ایک فاتحانہ قہقہہ لگایا اور بیٹھ گئے۔

”کیا واقعی آج پسٹل لگا کر آئے ہو چچا......؟“ ملو استاد نے ان کے کان میں سرگوشی کی۔

”پسٹل......!“ چچا تندوری نے حیرت سے اس کی شکل دیکھی۔ ”یہ کیا ہوتا ہے؟“

ملو استاد نے منہ پیٹ کر اپنی ہنسی روکی تھی۔ ادھر پھوڑا دہلوی نے غزل کا دوبارہ آغاز کیا۔

جب بھی تو اپنے گھر گئی بیگم !
میری عزت اتر گئی بیگم !
پڑ گئے پیچھے میرے سسرالی
جانے کیا جادو کر گئی بیگم
جو گہری نیند میں بستر سے گری
میں تو سمجھا کہ مر گئی بیگم
ایسی قسمت کہاں پھوڑا اپنی
اٹھ کے بستر پہ دھر گئی بیگم

☆.....☆.....☆

برکت صاحب کے ساتھ گل بانو بھی نیچے چلی آئی تھیں۔ برکت صاحب نے بیرونی دروازے کا رخ کیا تھا، اور گل بانو نے مہ پارہ کے کمرے کا۔ کیونکہ انہیں مہ پارہ کی خیریت بھی معلوم کرنی تھی۔

اس کم بخت جن کے متعلق جو کچھ گاگے شاہ نے بتایا تھا، اس کی رو سے اس تمام معاملے میں ان کی بیٹی مہ پارہ بالکل بے قصور اور مظلوم تھی۔ چنانچہ اب گل بانو نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی دل جوئی کریں گی، جب تک کہ گاگے شاہ اس کے اوپر سے اثرات ختم نہیں کر دیتے، وہ اسے خوب پیار دیں گی، تسلیاں دیں گی اور توجہ کا مرکز بنائے رکھیں گی۔

یہی سوچ کر وہ مہ پارہ کے کمرے میں داخل ہو گئیں۔ وہ جاگ رہی تھی۔ ماں کو دیکھتے ہی اس کی رنگت بدل گئی۔ اس نے خیال کیا کہ اب اس کی خوب کھنچائی ہوگی۔

لیکن خلاف توقع گل بانو مسکرا کر اس کے قریب آ بیٹھیں۔ ''کیسی ہے میری بچی......؟ ٹھیک تو ہے؟'' انہوں نے بڑے پیار سے پوچھا۔

''جج......جی......'' مہ پارہ بوکھلا سی گئی۔ یہ رویہ اس کے لئے نا قابل یقین تھا۔

''کیا تمہیں بوقاف پسند ہے؟'' گل بانو نے پھر سوال کیا۔ مہ پارہ نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔

''یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔'' گل بانو نے کہا۔ ''جب میں تمہاری عمر کی تھی تو مجھے بھی ایک خرگوش کے بچے سے محبت ہوئی تھی۔''

''جی......!!'' مہ پارہ نے چونک کر انہیں دیکھا۔ مہ پارہ نے اس طرح انہیں دیکھا جیسے ان کی ذہنی حالت پر شبہ ہو۔ وہ بدستور مسکرا رہی تھیں۔

''تمہاری شادی اگر بوقاف سے کر دی جائے تو......؟'' گل بانو نے پھر پوچھا۔ مہ پارہ کے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔

''یہ تو میرا ارمان ہے امی جان۔'' وہ شرما کر بولی۔

''تمہارا تو ارمان ہے۔ لیکن پکوان کا کیا ہوگا......؟ بارات میں سارے کے سارے جن ہی ہوں گے، ان کے کھانے کے لئے تو کوئلے کی

پوری کان ہی خریدنی پڑے گی۔ بلکہ ہوسکتا ہے کہ کئی من ہڈیاں بھی لینی پڑیں گی۔ میرا تو خیال ہے کہ ون ڈش میں کوئلے ہی مناسب رہیں گے۔‘‘ خیر......دیکھا جائے گا......‘‘

وہ بڑبڑا کر خاموش ہوگئیں۔ مہ پارہ اب تک ان کی شکل تک رہی تھی۔ گل بانو کی باتیں اس کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔ ویسے وہ ان کی آمادگی پر خوش تو ضرور تھی۔ لیکن ون ڈش میں کوئلے......!

☆......☆......☆

برکت صاحب کو حکیم طولانی کے مکان کی چھت پر دوبارہ پہنچنے میں کسی قسم کی دشواری پیش نہیں آئی، کیونکہ زینہ بھی مین گیٹ کے ساتھ ہی موجود تھا، اور اس کا دروازہ اس وقت کھلا ہوا تھا۔

وہ بے دھڑک اوپر آگئے، لیکن بلب کی روشنی میں یہاں کا منظر دیکھ کر ان کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ وہ اور گاگے شاہ جس وقت یہاں سے اٹھ کر گئے تھے تو مشاعرے کی گرما گرم محفل اپنے عروج پر تھی، لیکن اب......!

کہاں کا مشاعرہ اور کون سا ادب......؟ تمام کے تمام اہل سخن اور اہل ذوق اس وقت فرش پر لمبے لمبے ہوکر خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے، یعنی بے سدھ ہوکر گھوڑوں اور گدھوں کی تجارت کے بعد گویا سب کو سکون میسر آگیا تھا۔

تینوں شاعر، چنگا اور منگا اور خود حکیم طولانی...... یہ سب کے سب اس طرح سو رہے تھے کہ سر کہیں تھا اور ٹانگیں کہیں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ کلو چرسی نے شربت میں بھنگ ملادی تھی۔

یہ لوگ عجیب اور بدوضع قسم کے خراٹے بھی لے رہے تھے، جن کی آوازیں آپس میں ٹکرا کر کافی ہیبت ناک صوتی اثرات پیدا کررہی تھیں۔

’’کیا مصیبت ہے......؟‘‘ برکت صاحب بڑبڑائے اور چنگا منگا کی طرف بڑھے۔ تاکہ انہیں جگا سکیں......!

☆......☆......☆

برکت صاحب، جب گھر واپس پہنچے تو ان کے ساتھ چنگا اور منگا کے علاوہ ایک اور شخصیت بھی تھی، اور وہ تھے چچا تندوری۔ چنگا اور منگا اتنی مشکل سے جاگے تھے کہ ان کو اٹھانے کے چکر میں چچا تندوری بھی جاگ پڑے تھے۔

برکت صاحب نے جب مختصراً تفصیل بتائی اور حالات سے آگاہ کیا تو چچا تندوری کی تو آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ وہ بہ ضد ہوگئے کہ میں بھی ساتھ چلوں گا، تاکہ جن اور اس کے سردار سے مل سکوں۔ یہ چاروں گھر میں داخل ہوئے۔ صحن میں پہنچتے ہی انہیں ایک عجیب منظر دکھائی دیا۔ گاگے شاہ تن کر کھڑے ہوئے تھے، جبکہ بوقاف اور مالوط کان پکڑ کر ’’مرغا‘‘ بنے ہوئے تھے۔ ان کی گردنیں بھی جھکی ہوئی تھیں۔

’’یہ کیا ہورہا ہے بھئی......؟‘‘ چچا تندوری نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

’’ککڑوں کوں......‘‘ مالوط نے ہنس کر مرغے کی آواز بھی سنادی۔

ابھی تک چچا تندوری ان دونوں کے چہرے نہیں دیکھ سکے تھے، اور نہ بوقاف اور مالوط نے ہی انہیں دیکھا تھا۔

اس کے باوجود مالوط کو یہ مذاق بہت مہنگا پڑا۔ چچا تندوری نے مرغے کی بانگ پوری بھی نہ ہونے دی اور آگے بڑھ کر مالوط پر چڑھ دوڑے۔ ان کے منہ سے گالیوں کا مغلظات بھی ابل پڑا تھا۔

''ارے......ارے......ارے......'' سب روکتے ہی رہ گئے، لیکن اب چچا تندوری کس کے بس میں تھے......؟ انہوں نے دونوں ہاتھوں اور دونوں پیروں کی مدد سے مالوط کی ٹھکائی لگادی۔ جب تک مالوط اٹھ کر سنبھلتا، چچا تندوری اسے ٹھیک ٹھاک پیٹ چکے تھے، گالیاں اب بھی جاری تھیں۔

مالوط اٹھ کھڑا ہوا، بوقاف بھی اٹھ چکا تھا۔ اور پھر جیسے ہی ان دونوں کی نظر اس ''بلائے ناگہانی'' پر پڑی، ان کا غصہ کافور ہوگیا۔ دونوں ہی ہکا بکا رہ گئے۔

ادھر چچا تندوری بھی بری طرح چونکے۔ ''تم دونوں؟'' ان کے منہ سے نکلا۔

''بھوت......بھوت......ارے بھاگو۔'' مالوط خوف زدہ انداز میں چلایا۔

بوقاف کے چہرے پر بھی گھبراہٹ طاری تھی۔ چچا تندوری کو دیکھ کر دونوں ہی کی ہوا خشک ہوگئی تھی اور پھر جو کچھ ہوا، وہ کسی کے ذہن وگمان میں بھی نہیں تھا۔ بوقاف اور مالوط نے پہلے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر جھکے......اپنی چپلیں اٹھائیں اور سرپٹ بھاگ کھڑے ہوئے۔

''ارے......ارے......رکو......'' گاگے شاہ چلا اٹھے۔

لیکن بوقاف اور مالوط پر تو اس وقت چچا تندوری سوار تھے، جب تک یہ لوگ ان کے پیچھے بھاگتے، دونوں ہی گھر سے نکلے اور یہ جا وہ جا۔ گاگے شاہ وغیرہ جلدی سے گھر سے باہر آئے، لیکن ان دونوں کا دور دور تک نام ونشان تک نہ تھا۔

''یہ......یہ کیا ہوا......؟'' برکت صاحب نے بوکھلا کر پوچھا۔

''یہ تمہارے چچا کے کارنامے ہیں۔'' گاگے شاہ نے چچا تندوری کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''غضب خدا کا......انہوں نے تو اس مخلوق کو بھی نہیں چھوڑا۔''

''بھاگ نکلے کم بخت۔'' چچا تندوری نے منہ بنایا۔ ''ورنہ ابھی تو دوسرے والے کی بھی باری تھی۔ وہ تو رہ ہی گیا۔''

''وہ تم سے ڈر کیوں گئے؟'' برکت صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

''مجھے کیا معلوم......'' چچا تندوری لاپروائی سے بولے۔ ''کم بخت! مجھے الٹا لٹکا گئے تھے، اسی کا بدلہ لینا تھا۔''

''الٹا لٹکا گئے تھے......؟ کب......؟'' چنگا نے پوچھا۔

''کافی دن پہلے......'' چچا تندوری نے گول مول سا جواب دیا اور پھر جلدی سے بولے۔ ''خیر......پھر تو ملیں گے......نمٹ لوں گا۔''

برکت صاحب نے غور سے ان کی طرف دیکھا اور پھر ایک طویل سانس لے کر بولے۔ ''انسان واقعی اشرف المخلوقات ہے......اگر وہ خود سمجھے تو......؟''

☆......☆......☆

چونکہ گاگے شاہ نے فیصلہ کرلیا تھا کہ جنوں کے سردار کو بلوانا ہے، اس لئے چچا تندوری کو وہاں سے کھسکا دیا گیا تھا، وہ اپنے گھر جا چکے تھے۔ اور ان کو گھر پہنچانے کا انتظام گاگے شاہ نے کیا تھا، ان کا خیال تھا کہ اگر چچا تندوری نے سردار کے سامنے بھی کوئی گڑبڑ کردی تو مسئلہ خراب ہوجائے گا۔ کیونکہ اب جنوں کے سردار سے بوقاف کے متعلق فیصلہ کن میٹنگ کرنا تھی۔ ''بوقاف اور اس کا دوست تو بھاگ نکلے...... ان کا کیا ہوگا؟'' برکت صاحب نے پوچھا تھا۔

''ان کی فکر مت کرو......'' گاگے شاہ لاپروائی سے بولے۔ ''سردار انہیں بلوالے گا۔ وہ جائیں گے کہاں؟''

اور پھر...... پرانے والے چلے کا عمل دہرایا گیا، وہی صحن تھا، وہی گاگے شاہ اور ان کے مرید، وہی برکت صاحب اور وہی چند لکڑیوں میں سلگتی ہوئی آگ۔

اب کی بار اس ''عمل'' کا بڑی جلدی ردعمل ہوا، بادلوں جیسی گھن گرج ہوئی تھی اور دوسرے ہی لمحے سردار اپنے سیکریٹری کے ساتھ وہاں حاضر ہوگیا۔

آج نہ معلوم کیوں سردار کچھ خوش گوار موڈ میں تھا۔ البتہ سیکریٹری برے برے منہ بنا رہا تھا۔

''ہاں بھئی...... گاگے شاہ! کہو...... کیوں یاد کیا ہے؟ خیریت تو ہے؟'' سردار نے بڑے میٹھے لہجے میں پوچھا۔

''وہی بوقاف...... ہماری خیریت تو اسی کے ساتھ رخصت ہوجاتی ہے۔'' گاگے شاہ کا لہجہ چبھتا ہوا سا تھا۔

''بوقاف......؟ کیا مطلب......؟'' سردار چونکا۔ ''کیا وہ پھر یہاں آیا تھا؟''

''ہاں...... ہماری لڑکی اب بھی اس کے حصار میں ہے۔ وہ ابھی ابھی اپنے ایک دوست کے ساتھ یہاں سے بھاگا ہے۔'' گاگے شاہ نے بتایا۔

''اوہ...... اوہ......'' سردار نے مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔ فوراً ہی اس کے چہرے پر شدید غصہ عود کر آیا تھا۔ ''میں...... میں ابھی اسے بلا کر اس کا فیصلہ کرتا ہوں...... ابھی......''

''یہ فیصلہ بھی پہلے جیسا ہوگا؟'' گاگے شاہ طنزیہ انداز میں مسکرائے۔

''قطعاً نہیں۔'' سردار کے لہجے میں چٹانوں کی سی مضبوطی تھی۔ ''آج میں جو فیصلہ کروں گا، وہ اس کہانی کا رخ ہی بدل دے گا۔''

''تو کیا اگلی قسط مزاحیہ نہیں ہوگی؟'' برکت صاحب کے لہجے میں تشویش تھی۔

''ہونہہ...... خاک مزاحیہ کہانی ہے یہ......؟'' سردار نے جل کر کہا۔ ''اس میں سوائے اوٹ پٹانگ حرکتوں کے اور ہے کیا......؟''

''آج کل یہی سب کچھ تو کامیڈی ہے۔'' برکت صاحب نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''لعنت ہو...... خواہ مخواہ میری بھی گت بنا کر رکھ دی ہے۔'' سردار نے منہ بنایا۔ ''خیر...... تو...... گاگے شاہ......! ذرا ادھر آؤ...... کونے میں۔''

''کیوں......؟'' وہ چونکے۔

''ارے آؤ تو ادھر......دراصل بوقاف اور اس کے باپ کو بلانے سے پہلے میں تم سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' سردار نے بتایا۔

''اوہ......اچھا۔'' گاگے شاہ آگے بڑھ آئے۔

سردار نے ان کے گلے میں ہاتھ ڈالا اور انہیں کونے میں لے گیا۔ اب دونوں میں خفیہ قسم کی کھسر پھسر ہو رہی تھی اور برکت صاحب کے ساتھ ساتھ چنگا اور منگا بھی ہونقوں کی طرح انہیں دیکھ رہے تھے۔

☆......☆......☆

گاگے شاہ اور سردار، جب کھسر پھسر ختم کر کے واپس پلٹے تو ان کے چہروں پر بہت زیادہ طمانیت دکھائی دے رہی تھی۔ برکت صاحب بے چین ہو گئے۔ وہ جلد سے جلد جان لینا چاہتے تھے کہ آخر اتنی دیر میں دونوں نے کیا ''کھچڑی'' پکائی ہے۔ لیکن دونوں کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کچھ بتانا نہیں چاہتے۔

آخر برکت صاحب پوچھ بیٹھے۔ ''شاہ صاحب......بتائیں تو......آپ دونوں نے کیا معاملہ طے کیا ہے؟''

''بتادوں گا بھئی......بتادوں گا......'' گاگے شاہ سر ہلا کر بولے۔ ''بوقاف کو ایسی سزا ملے گی، کہ اس کی نسلیں بھی یاد رکھیں گی۔'' سردار نے پختہ لہجے میں کہا۔ ''آپ بالکل فکر نہ کریں۔ بس......''

وہ کہتے کہتے رک گیا۔

''بس کیا......؟'' برکت صاحب نے پوچھا۔

''آپ کو تھوڑی سی پریشانی برداشت کرنا ہوگی......بس تھوڑی سی پریشانی۔'' سردار نے جواب دیا۔

''وہ کیا......؟'' برکت صاحب نے پوچھا۔ ''کیسی پریشانی......؟''

''اپنی بیٹی مہ پارہ کی پریشانی۔'' سردار نے کہا۔ ''وہ تھوڑے عرصے کے لئے، آپ کے ساتھ رہ کر بھی آپ کے ساتھ نہیں ہوگی۔ وہ مہ پارہ ہی ہوگی، لیکن مہ پارہ نہیں ہوگی۔'' سردار نے عجیب بات کہی۔

''کیا مطلب......؟'' برکت صاحب کے منہ سے نکلا۔ پھر وہ منہ بنا کر بولے۔ ''اس سے زیادہ بے تکی اور بے ڈھنگی بات تو پوری کہانی میں اب تک کسی نے نہیں کی۔''

''چلو......خوش ہو جاؤ۔ میں نے تو کر دی نا......!'' سردار مسکرایا۔

''میں تمہیں سب کچھ سمجھا دوں گا برکت میاں......'' گاگے شاہ نے دخل دیا۔ ''تم بالکل فکر مت کرو۔ بوقاف کا جوتا اسی کے سر پر مارا جائے گا۔''

یہ کہہ کر وہ سردار کی طرف مڑے۔ وہ اپنے سیکریٹری سے سرگوشیاں کر رہا تھا۔

''سردار......! یہ بتاؤ......آج تمہارا موڈ بہت اچھا لگ رہا ہے......آخر بات کیا ہے......؟''

یہ سن کر سردار کا چہرہ کھل اٹھا۔ جبکہ سیکریٹری کا منہ اور زیادہ بگڑ گیا۔ ’’بات دراصل یہ ہے کہ......‘‘ سردار نے سیکریٹری کی طرف دیکھتے ہوئے کہنا چاہا۔

’’سردار......‘‘ سیکریٹری نے احتجاجاً اس کی بات کاٹ دی۔

’’میں تو بتاؤں گا۔‘‘ سردار تنک کر بولا اور پھر گاگے شاہ کی طرف متوجہ ہوا۔ ’’تمہارا پیغام موصول ہونے کے بعد یہ یہاں آنے پر تیار نہیں تھا۔ دراصل یہ اس وقت گھر میں بیٹھا ہوا ’’شعلے‘‘ فلم دیکھ رہا تھا۔ اس نے انکار کیا، اور نہ جانے کی ضد کی میں نے ہاتھ جھاڑ دیا۔ تب سے ہی اس بے چارے کا موڈ خراب ہے، اور میرا موڈ خوش گوار ہے۔‘‘

’’تمہارا موڈ خوش گوار کیوں ہے؟‘‘ گاگے شاہ نے ایک نظر سیکریٹری پر ڈالی اور پھر سردار کی طرف حیرت سے دیکھ کر پوچھا۔

جواباً سردار نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور پھر بولا۔

’’یہ بہت فرماں بردار سیکریٹری ہے۔ ہر حکم کی تعمیل بغیر کسی چوں و چراں کے فوراً ہی کرتا ہے۔ کبھی کبھار ہی میرے ہاتھوں اس کی درگت بنتی ہے۔ اور جب بھی یہ موقع میرے ہاتھ لگتا ہے، میری طبیعت میں مستی سی آجاتی ہے۔ دراصل...... یہ مجھے موقع ہی نہیں دیتا۔‘‘

’’فلم تھی بھی تو ایسے موڑ پر۔‘‘ سیکریٹری سے رہا نہ گیا، جھلا کر بولا۔

’’کس موڑ پہ تھی؟‘‘ گاگے شاہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

’’ٹھاکر کے ہاتھ کٹ رہے تھے۔‘‘ سیکریٹری نے مسمسی صورت بنا کر کہا۔

سردار نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ پھر جب اس کی ہنسی تھمی تو بولا۔ ’’اگر کسی کے سینگ کٹ رہے ہوتے تو حیرت کی بات بھی تھی۔ ہاتھ...... ہونہہ۔‘‘

’’تم لوگ اگر شعلے جیسی کوئی فلم بناؤ تو اس میں ہاتھوں کے بجائے سینگ کٹوا دینا۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔‘‘ گاگے شاہ نے مشورہ دیا۔

’’معاف کرو بھئی......‘‘ سردار نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ’’ہمارا معاشرہ اس حد تک نہیں بگڑا کہ ہم فلمیں پروڈیوس کرنا شروع کر دیں۔ تم لوگ بنا دیتے ہو، ہم دیکھ لیتے ہیں۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔ ان فلموں اور پرائیویٹ پروڈکشن کے ڈراموں کی بدولت تمہارا معاشرہ کہاں پہنچا ہوا ہے......؟ کیا تم دیکھتے نہیں ہو......؟‘‘

سردار کی اس بات نے گاگے شاہ کو بغلیں جھانکنے پر مجبور کر دیا۔ خود برکت صاحب بھی شرمندہ سے ہو گئے۔ سردار سچ ہی تو کہہ رہا تھا۔

’’آپ لوگوں کے یہاں فلم انڈسٹری نہیں ہے؟‘‘ تھوڑی دیر بعد برکت صاحب نے پوچھا۔

’’ہمارے یہاں گجر قبیلہ ہے ہی نہیں۔‘‘ سردار نے شوخ لہجے میں کہا۔ برکت صاحب پھر شرمندہ ہو گئے، اور کان کھجانے لگے۔

’’اچھا تو پھر سردار......!‘‘ گاگے شاہ نے موضوع بدلا۔ ’’مشن شروع کیا جائے۔‘‘

’’ہاں...... بالکل......‘‘ سردار نے جلدی سے سر ہلایا۔ ’’میں ابھی بوقاف کے باپ کو اور گل چیں کو بلواتا ہوں۔‘‘

''یہ گل چیں کون ہے؟'' برکت صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

''ہے ایک جن زادی۔'' سردار پراسرار انداز میں مسکرایا۔ ''اب اسی کے ہاتھوں بوقاف کی گت بنے گی۔''

''وہ کیسے......؟'' ''بس......تم دیکھتے جاؤ۔ یہ گت بنے گی، مہ پارہ کی شادی کے بعد۔'' سردار کا وہی انداز تھا۔ برکت صاحب ابھی ابھی الجھن کا شکار تھے۔

''مہ پارہ کی شادی......؟ کس سے......؟'' برکت صاحب کی حالت قابل دید تھی۔

''بتادوں گاگے شاہ......؟'' سردار نے مسکراتے ہوئے سوالیہ نظروں سے گاگے شاہ کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اب سردار ڈرامائی انداز میں برکت صاحب کی طرف مڑا اور سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

''بوقاف سے......''

☆......☆......☆

مائنڈ بلاسٹر

مائنڈ بلاسٹر، مظہر کلیم کی عمران سیریز کا ایک اور تیز رفتار اور ایکشن سے بھرپور سائنسی ناول ہے۔ اس ناول میں ایک ایسے ہی سائنسی آلے کا استعمال پاکیشیا کے فوجی کمانڈروں کے خلاف کیا گیا جو ہیئت، ساخت اور کام کے لحاظ سے صرف عام سائنسدانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ عمران کے لئے بھی بالکل نیا تھا۔ پاکیشیا کے ڈیڑھ سو کمانڈوز کو جیتے جاگتے ہلاک کر دیا گیا اور وہ ہاتھ تک نہ ہلا سکے جبکہ انہیں کسی گیس یا ریز سے بے ہوش یا بے حس و حرکت بھی نہ کیا گیا تھا بلکہ ان کو صوتی لہروں کی مدد سے گہری نیند سلایا گیا تھا، ایسی نیند جو ان کے مرنے کے بعد بھی قائم رہی۔ پھر پاکیشیا کے ایٹمی تنصیبات پر ان صوتی لہروں سے حملہ کیا گیا اور پاکیشیا کی ایٹمی تنصیبات کے تمام سائنسدان بہتر گھنٹوں تک باوجود سر توڑ کوششوں کے نیند سے نہ جاگ سکے۔

کیا پاکیشیا کی ایٹمی تنصیبات جن کی حفاظت کے لئے پاکیشیائی حکومت ہر سال کروڑوں ڈالرز خرچ کرتی ہے کا دفاعی نظام اس قدر کمزور تھا؟ اس پورے کھیل میں عمران اور پاکیشیا سیکرٹ سروس صرف ناچتے رہ گئے اور دشمن مسلسل پاکیشیا کو نقصان پہنچاتا رہا۔ پھر جب عمران کو دشمن اور اس آلے مائنڈ بلاسٹر کا پتہ چلا تو عمران اور اس کے ساتھی دیوانہ وار اس آلے کو ختم کرنے اور دشمن ملک سے انتقام لینے کے لئے میدان میں کود پڑے۔ یہ انتقام تھا پاکیشیا کے ڈیڑھ سو کمانڈوز کے خون کا انتقام۔ اور جب عمران انتقام پر آ جائے تو کیا ہوتا ہے اس کے بارے میں جاننے کے لئے پڑھیئے ناول ''مائنڈ بلاسٹر''۔

''مائنڈ بلاسٹر'' کتاب گھر پر دستیاب ہے۔ جسے **ناول** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

سلیم نے تھرمامیٹر میں اپنا ٹمپریچر دیکھا، اس وقت نارمل تھا۔ اس نے ایک طویل سانس لی اور دوبارہ سے سر پر چادر لپیٹ کر لیٹ گیا۔

آج دوسرا دن جا رہا تھا کہ اس کی دکان بند تھی، ورنہ سلیم کی دکان بند ہو......! یہ کسی کرامت سے ہی ہو سکتا تھا۔

جب سے اس ”سینگوں والی پراسرار برقعہ پوش عورت“ سے ملاقات ہوئی تھی، سلیم کی یہی حالت تھی کہ اسے بخار چڑھ رہا تھا اور اتر رہا تھا۔ جب وہ عورت اسے یاد آتی تو بخار چڑھ جاتا، اور جب ذہن سے اس کا خیال محو ہوتا تو بخار اتر جاتا۔ گھر میں والدین کو کیا بتاتا......؟ صرف بیماری کا بہانہ کر کے بستر پر پڑا ہوا تھا۔

اس وقت اس کے والد گھر پر نہیں تھے، والدہ باورچی خانے میں کھانا تیار کر رہی تھیں۔ سلیم نے چادر ہٹائی اور آہستہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسے باتھ روم جانا تھا۔ وہ بستر سے اٹھ کھڑا ہوا اور دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اچانک دروازہ کھلا اور......

سلیم کے منہ سے ایک لرزہ خیز چیخ برآمد ہوئی تھی، کیونکہ وہی برقعہ پوش عورت، چہرے پر نقاب ڈالے ہوئے اندر داخل ہوئی تھی۔

ادھر سلیم چیخا، ادھر وہ عورت بھی اچھل پڑی، پھر جلدی سے اس نے نقاب الٹ دیا۔ ”ائے...... ہائے...... سلیم......!“ وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ”تجھے کیا ہو گیا میرے لال......؟“

اب سلیم نے دیکھا کہ وہ اس کی خالہ تھیں۔ ان کا نام شکیلہ تھا۔ اور وہ سلیم سے بہت محبت کرتی تھیں۔ اب انہیں کیا معلوم کہ سلیم کس نقاب پوش سے کس قدر خوف زدہ ہے۔

انہیں دیکھ کر سلیم کی جان میں جان تو آ گئی، لیکن خود شکیلہ خالہ اس کی جان کو آ گئیں۔ ادھر سلیم کی چیخ سن کر اس کی والدہ یعنی بیگم اشرف بھی دوڑی آئیں۔

”کیا ہوا......؟ کیا ہوا......؟“ انہوں نے گھبرا کر دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہی تو میں بھی پوچھنے آئی ہوں۔“ شکیلہ خالہ ہاتھ نچا کر بولیں۔ ”میں مارکیٹ جا رہی تھی کہ راستے میں اشرف بھائی مل گئے، انہوں نے بتایا کہ سلیم کی طبیعت خراب ہے۔ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہاں دوڑی چلی آئی کہ بچے کو دیکھ لوں۔ ہائے...... ہائے...... اس کا تو بہت برا حال ہے...... یہ تو...... چیخیں مار رہا ہے۔“

”چیخیں......؟“ بیگم اشرف نے سر سے پاؤں تک سلیم کو دیکھا۔ ”نہیں...... ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔“

”ارے تم کیا جانو......!“ شکیلہ خالہ نے منہ بنایا۔ ”تمہیں خیال ہی کہاں ہے بچے کا۔ ابھی مجھے دیکھتے ہی یہ چیخا ہے بے چارہ...... اف...... اس کا رنگ تو دیکھو...... کیسے پیلا زرد ہو رہا ہے......!“

”م...... میں...... ٹھ...... ٹھیک ہوں خالہ۔“ سلیم ہکلایا۔ اب وہ خالہ کو کیا بتاتا......؟

”کیا خاک ٹھیک ہو......“ خالہ نے منہ بنایا۔ ”تمہاری شکل ہی بتا رہی ہے کہ......“

”کیا...... کیا بتا رہی ہے؟“ سلیم نے بوکھلا کر اپنا چہرہ ٹٹولا۔

''تمہیں کیا بتاؤں......!'' وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں۔ ''تم بستر پر لیٹ جاؤ...... آرام سے...... چلو۔''

یہ کہہ کر انہوں نے بڑے پیار سے اس کے کندھے تھامے اور اسے بستر کے قریب لے آئیں۔ اسے آرام سے لٹا کر وہ بیگم اشرف کی طرف مڑیں اور انہیں باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔

جیسے ہی دونوں کمرے سے باہر آئیں، شکیلہ خالہ نے بیگم اشرف کے کان میں سرگوشی کی۔ ''دل کو ذرا مضبوط کر کے میری بات سننا...... ہاں...... سلیم...... آسیب کے جھپیٹے میں آ گیا ہے۔'' تھوڑی ہی دیر بعد شکیلہ خالہ وہاں سے چلی گئی تھیں، لیکن جتنی دیر وہ سلیم کے پاس رہیں، سلیم کو ان کا انداز بہت عجیب سا لگا۔

وہ بہت زیادہ محبت کا اظہار بھی کر رہی تھیں اور خوف زدہ بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ سلیم کی بات بات پر وہ چونک سی جاتیں۔ پھر وہ تھوڑی دیر سلیم کے پاس بیٹھ کر چلی گئیں۔ جاتے جاتے انہوں نے دبے لفظوں میں بیگم اشرف کے کان میں کچھ کہا بھی تھا، جو سلیم سن نہ سکا۔

اس وقت سلیم ایک بار پھر اپنے کمرے میں تنہا تھا۔ اب اسے بوریت سی ہونے لگی تھی۔ اس نے سائیڈ ٹیبل سے ایک کتاب اٹھائی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔

نہ جانے کتنی دیر اسی طرح گزر گئی۔ پھر سلیم نے میز پر دوبارہ کتاب رکھی ہی تھی کہ ایک تنومند سا ادھیڑ عمر کا آدمی جھاڑو ہاتھ میں لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے جسم پر سفید رنگ کا لباس تھا۔ ''یہاں کہاں گھس آئے ہو۔'' سلیم نے اس کے ہاتھ میں جھاڑو دیکھ کر اسے ڈانٹا۔ ''جاؤ...... باہر گلی کی صفائی کرو۔ جاؤ......''

''بے ادب...... گستاخ......'' اس آدمی نے کرخت آواز میں غصے سے لبریز ہو کر کہا۔ ''ہمیں بھنگی سمجھ رہا ہے...... جانتا نہیں ہے......! ہم جھاڑو والے بابا ہیں...... ہاں...... جھاڑو والے بابا۔''

''جھاڑو والے بابا......؟'' سلیم نے حیرت سے دہرایا اور سر سے پاؤں تک بابا کا جائزہ لیا۔

عین اسی وقت شکیلہ خالہ کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کے پیچھے بیگم اشرف بھی تھیں۔

''دیکھیے جھاڑو والے بابا......! ہمارا بچہ نہ جانے کس مصیبت میں گرفتار ہے۔'' شکیلہ خالہ نے بابا سے مخاطب ہو کر کہا۔

''دیکھ رہا ہوں...... دیکھ رہا ہوں۔'' بابا نے بڑی شدت سے سر ہلایا اور تیز نظروں سے سلیم کا جائزہ لیا، جیسے قصائی بکرے کو دیکھتا ہے۔

''میں اسی کی خاطر آپ کو بلا کر لائی ہوں......'' شکیلہ خالہ نے پھر ٹکڑا لگایا۔

''ہوں......'' بابا نے ہنکارا بھرا۔ اور پھر سلیم سے مخاطب ہوئے۔ ''اٹھ کر بیٹھ جا...... بچہ......''

''کیوں......؟'' سلیم نے لیٹے لیٹے پوچھا۔

''ہم تیرا الٹرا جھاڑو ٹیسٹ کریں گے۔'' بابا نے پر وقار لہجے میں کہا۔

''الٹرا جھاڑو ٹیسٹ......؟'' سلیم نے حیرت سے دہرایا۔

’’ہاں...... اب اٹھ جا۔‘‘ بابا نے کہا۔

’’اٹھ جاؤ نا سلیم۔‘‘ بیگم اشرف بول پڑیں۔ ’’بابا کا کہنا مانو۔‘‘

چاروناچار سلیم کو کھڑا ہونا پڑا۔ ویسے اس کے چہرے پر بیزاری کے آثار تھے۔

’’یہ جھاڑو اپنے ہاتھ میں پکڑ لے۔‘‘ بابا نے جھاڑو اس کی طرف بڑھائی۔

’’کیوں......؟‘‘ سلیم جھلا کر بولا۔

’’ارے نادان...... اسی سے تو معلوم ہوگا کہ تجھ پر کون سے اثرات ہیں۔‘‘ بابا نے سمجھایا۔

سلیم نے بے بسی سے شکیلہ خالہ کی طرف دیکھا، وہ جلدی سے بولیں۔ ’’پکڑ لو بیٹا...... جھاڑو پکڑ لو......‘‘

سلیم نے بے دلی سے جھاڑو تھام لی۔ فوراً ہی بابا نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھا۔ فوراً ہی سلیم کا جسم جھٹکے لے لے کر ہلنے لگا۔ ’’کیا جھاڑو میں کرنٹ دوڑ رہا ہے؟‘‘ بیگم اشرف کے منہ سے نکلا۔

بابا اور شکیلہ خالہ اس وقت سلیم کی طرف متوجہ تھے، اس لئے ان کی بات سن نہ سکے۔ پھر بھی شکیلہ خالہ نے بے خیالی میں ان سے پوچھ ہی لیا۔

’’کیا کہہ رہی ہو؟‘‘

’’کک...... کچھ نہیں۔‘‘ وہ گڑبڑا گئیں۔

2 منٹ تک سلیم کی یہی کیفیت رہی، پھر بابا نے اس کے ہاتھ سے جھاڑو چھین لی۔ فوراً ہی سلیم اپنی اصل حالت پر آ گیا۔ اب بابا نے جھاڑو کو سونگھا اور معنی خیز انداز میں سر ہلا کر بولے۔

’’اس پر نہ کوئی جن ہے اور نہ آسیب۔ اس پر صرف خوف سوار ہے، اور کوئی بات نہیں ہے۔‘‘

’’کیسا خوف بابا جی......؟‘‘ شکیلہ خالہ نے پوچھا۔

’’خواہ مخواہ کا...... کبھی کبھی انسان بلاوجہ بھی ڈر جاتا ہے۔‘‘ انہوں نے بتایا۔

’’اوہ......‘‘ بیگم اشرف کے منہ سے نکلا۔ پھر انہوں نے پوچھا۔ ’’اب یہ خوف دور کیسے ہوگا؟‘‘

’’بہت آسانی سے۔‘‘ وہ لاپروائی سے بولے۔ ’’اسے روزانہ ہالی وڈ کی 2 ہارر فلمیں دکھاؤ، ان میں اندی گندی، اوندھی سیدھی اور اوٹ پٹانگ قسم کی تمام بلائیں پائی جاتی ہیں۔ اور فلم کے اینڈ میں جوان کا حشر ہوتا ہے، اسے دیکھ کر اسے دو چار الٹیاں ہوں گی اور پھر خوف سے نفرت ہو جائے گی۔‘‘

’’اور...... اور یہ فلمیں اسے کب تک دکھانی ہیں بابا......؟‘‘ شکیلہ خالہ نے سلیم کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جھاڑو والے بابا سے پوچھا۔

’’ہمارے یہاں ہر کام کو لوگوں نے اکثریت میں چالیس دن کے لئے فکس کر رکھا ہے، سلیم کو بھی چالیس دن تک فلمیں دیکھنا پڑیں گی۔‘‘

''آپ بابا ہیں یا...... کوئی صحافی......؟'' سلیم پوچھ بیٹھا۔

''اس دنیا میں رہ کر بہت کچھ بننا پڑتا ہے۔'' بابا نے طویل سانس لے کر کہا۔ ''آنکھیں کھلی رکھنی پڑتی ہیں اور...... ہر چیز کو اپنے دائرۂ کار میں رکھنا پڑتا ہے کیونکہ...... یہ دنیا ہے۔''

☆......☆......☆

سردار کی بات سن کر لمحہ بھر کے لئے برکت صاحب گنگ ہو کر رہ گئے۔ پھر ان کی کیفیت بدلی، چہرہ لال ہو گیا، ناک کے نتھنوں اور کانوں کے سوراخوں سے دھواں نکلنے لگا۔ آنکھوں میں چنگاریاں رقص کرنے لگیں، دانت بجنے لگے (غصے کے مارے)، جسم کانپنے لگا۔

چونکہ یہ سب کیفیتیں راکٹ سے ملتی جلتی تھیں، اس لئے سب ہی کو یہ گمان ہوا کہ برکت صاحب چھت توڑ کر اڑ جائیں گے۔ اسی لئے گاگے شاہ نے فوراً آگے بڑھ کر ان کی کمر تھام لی۔

''چھوڑ دیجئے مجھے شاہ صاحب......'' وہ سردار کی طرف غصے سے دیکھتے ہوئے مچلے۔ ''چھوڑ دیجئے......''

وہ خونخوار نظروں سے سردار کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سردار بھی کچھ مضطرب دکھائی دے رہا تھا۔ ادھر سیکریٹری اس کوشش میں تھا کہ برکت صاحب اس کی طرف متوجہ نہ ہوں۔ وہ سردار کے عقب میں چھپ رہا تھا۔

چنگا اور منگا کو اب پوری پوری امید ہو چکی تھی کہ سردار کی شامت آئی ہی آئی، دنیا کی کوئی طاقت اب برکت صاحب کے ہاتھوں سے سردار کو نہیں بچا سکتی۔

برکت صاحب نے گاگے شاہ کے ہاتھوں کو جھٹک کر ایک قدم آگے بڑھایا...... سب کے دل دھک سے رہ گئے۔ پھر دوسرا قدم آگے بڑھا...... دل اور بھی زور زور سے دھڑکنے لگے۔ تیسرا قدم...... چوتھا قدم اور پھر پانچواں قدم۔ سردار کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بھی اب خوف زدہ ہو چکا ہے۔

برکت صاحب اسے گھور رہے تھے، نظروں ہی نظروں میں تول رہے تھے۔ پھر اچانک ہی ان کے دونوں ہاتھ اٹھے، اور...... ان ہاتھوں نے خود ان کی اپنی گردن زور سے پکڑ لی۔

''میں...... میں خودکشی کر لوں گا۔'' برکت صاحب زور سے چلائے۔ ''میں...... میں...... اپنا گلا گھونٹ لوں گا۔ میں زندہ نہیں رہوں گا۔''

جیسے غبارے میں سے ہوا نکل جاتی ہے۔ ایسے ہی سب کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ چنگا اور منگا کا تو منہ ہی بن گیا۔ گاگے شاہ جلدی سے آگے بڑھے اور برکت صاحب کو سنبھالا۔ ''یہ کیا کر رہے ہو برکت......؟ ہوش میں آؤ۔'' وہ بولے۔

''ہم تو سمجھ رہے تھے کہ آج سردار کی شامت آ گئی۔ لیکن......'' چنگا نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

''میں کوئی پاگل ہوں......؟'' برکت صاحب تنک کر بولے۔ ''ایک تو پنگا لوں، اور وہ بھی جنوں کے سردار سے۔ واہ...... میرا کوئی دماغ خراب ہے؟ مجھے پاگل کتے نے کاٹا ہے؟''

''کاش......کاٹ لیتا......'' چنگا ٹھنڈی سانس بھر کر بڑبڑایا۔ ''کب سے فری اسٹائل ریسلنگ نہیں دیکھی۔''

بہر حال گاگے شاہ نے بڑی مشکل سے برکت صاحب کو خودکشی جیسے قبیح فعل سے روکا، اور اس چکر میں برکت صاحب کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لئے ان کے منہ پر دو چار ''چماٹ'' بھی رکھ دیئے۔

کافی دیر تک برکت صاحب کا منہ پھولا رہا۔ وہ ترچھی ترچھی نظروں سے سردار کی طرف بھی دیکھ رہے تھے۔ آخر کار ان سے رہا نہ گیا۔ چلا کر بول پڑے۔

''میں کہے دیتا ہوں......مہ پارہ کی شادی ہرگز بوقاف سے نہیں ہونے دوں گا۔ چاہے کچھ ہو جائے......ہاں......''

''تم......بات کو سمجھ نہیں رہے ہو برکت......!'' گاگے شاہ نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم کیوں خواہ مخواہ فلمی باپ بننے کی کوشش کر رہے ہو۔''

''فلمی باپ......؟'' سردار نے حیرت سے دہرایا۔ ''یہ کون سا باپ ہوتا ہے؟''

''ہوتا ہے ایک نامراد قسم کا باپ۔'' گاگے شاہ نے سمجھایا۔ ''دراصل......وہ ہیرو کے گھر میں پیدا ہوا ہوتا ہے......اور یہی اس کا جرم ہے کہ وہ ہیرو کے گھر میں کیوں پیدا ہوا۔ جرم اس لئے کہ جب ہیرو جوان ہوتا ہے تو اسے ناچتی گاتی ہوئی ایک بے ہودہ قسم کی لڑکی سے محبت ہو جاتی ہے۔ ہیرو کا نانجار باپ ہیرو کے راستے میں روڑے اٹکاتا ہے، کیونکہ اتنی بے شرم لڑکی کو وہ اپنی بہو نہیں بنانا چاہتا۔ مگر صاحب......مجال ہے کہ ہیرو اپنے باپ کی بات مان لے......پھر اسے ہیرو کون کہے گا۔ وہ اپنی ماں کو آگے کر دیتا ہے، اور ماں......وہ بھی فلمی......توبہ......''

اتنا کہہ کر گاگے شاہ نے اپنے گال پیٹ لئے۔

''یہ تو بہت خوفناک کہانی ہے۔'' سردار بڑبڑایا۔ پھر جلدی سے بولا۔ ''اور......اور پھر ماں کیا کرتی ہے؟''

''وہ جو کرتی ہے، وہ سب کچھ تو سنسر ہو جاتا ہے، لیکن جو کچھ وہ کہتی ہے، اسے پورا علاقہ سنتا ہے۔ وہ تو آسمان سر پر اٹھا لیتی ہے، اور اس وقت تک اپنے میاں کو برا بھلا کہتی رہتی ہے جب تک ہیرو اور ہیروئین کی شادی نہ ہو جائے۔''

''اور اگر......شادی نہ ہو تو......؟'' سردار نے پوچھا۔

''یہ ہو نہیں سکتا۔'' گاگے شاہ نے منہ بنایا۔ ''فلم پٹ جائے گی۔''

''اوہ......'' سردار کے منہ سے نکلا۔ ''یہ تو بڑا مسئلہ ہے۔''

''سردار......!'' سیکریٹری نے دخل دیا۔ ''جلدی سے معاملات طے کیجئے......دیر ہو رہی ہے۔''

''ہاں......ہاں۔'' سردار نے سر ہلایا۔ پھر وہ گاگے شاہ کی طرف متوجہ ہوا۔

''تم خود ہی ان کو سمجھاؤ......تاکہ پھر ہم اپنی مہم کو آگے بڑھائیں۔ اور اگلے مرحلے میں داخل ہوں۔''

''تم......برکت کی فکر نہ کرو......'' گاگے شاہ نے برکت صاحب پر ایک ترچھی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''میں اسے سمجھا دوں گا۔ تم اب

بوقاف کے باپ اور اس جن زادی کو...... کیا نام بتایا تھا اس کا......؟''

''گل چیں۔'' سردار نے بتایا۔

''ہاں...... گل چیں...... تو تم ان دونوں کو بلواؤ...... تا کہ ان سے معاملہ طے کر کے بعد میں بوقاف کو بلایا جائے۔''

''ٹھیک ہے...... میں انہیں بلواتا ہوں۔'' یہ کہہ کر سردار نے سیکریٹری سے مخاطب ہو کر کہا۔

''جاؤ...... گل چیں اور بوقاف کے باپ روناف کو لے آؤ۔ جاؤ......''

سیکریٹری فوراً ہی غائب ہو گیا

☆......☆......☆

کیا آپ کتاب چھپوانے کے خواہش مند ہیں؟

اگر آپ شاعر/ مصنف/ مولف ہیں اور اپنی کتاب چھپوانے کے خواہش مند ہیں تو مُلک کے معروف پبلشرز ''علم و عرفان پبلشرز'' کی خدمات حاصل کیجئے، جسے بہت سے شہرت یافتہ مصنفین اور شعراء کی کتب چھاپنے کا اعزاز حاصل ہے۔ خوبصورت دیدہ زیب ٹائٹل اور اغلاط سے پاک کمپوزنگ، معیاری کاغذ، اعلیٰ طباعت اور مناسب دام کے ساتھ ساتھ پاکستان بھر میں پھیلا کتب فروشی کا وسیع نیٹ ورک...... کتاب چھاپنے کے تمام مراحل کی مکمل نگرانی ادارے کی ذمہ داری ہے۔ آپ بس میٹر (مواد) دیجئے اور کتاب لیجئے......

خواتین کے لیے سنہری موقع...... سب کام گھر بیٹھے آپ کی مرضی کے عین مطابق......

ادارہ علم و عرفان پبلشرز ایک ایسا پبلشنگ ہاؤس ہے جو آپ کو ایک بہت مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے کیونکہ ادارہ ہذا پاکستان کے کئی ایک معروف شعراء/ مصنفین کی کتب چھاپ رہا ہے جن میں سے چند نام یہ ہیں......

عمیرہ احمد
نازیہ کنول نازی
اقراء صغیر احمد
محی الدّین نواب
ماہا ملک
نگہت عبداللہ
ہاشم ندیم
علیم الحق حقی
فرحت اشتیاق
رفعت سراج
طارق اسماعیل ساگر
امجد جاوید
رخسانہ نگار عدنان
نبیلہ عزیز
ایم۔ اے۔ راحت
جاوید چوہدری
قیصرہ حیات
نگہت سیما
اعتبار ساجد
ایس۔ ایم۔ ظفر
انجم انصار
میمونہ خورشید علی
شیما مجید (تحقیق)

مکمل اعتماد کے ساتھ رابطہ کیجئے۔ علم و عرفان پبلشرز، اُردو بازار لاہور ilmoirfanpublishers@yahoo.com

اور پھر...... بوقاف بھی مالوط کے ساتھ ''عدالت'' میں پیش ہو گیا۔ اس بے چارے کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے آنے سے قبل یہاں ایک زبردست میٹنگ ہو چکی ہے، اور اس میٹنگ میں گل چیں بھی شامل تھی۔

برکت صاحب کے سامنے ہی سردار اور گاگے شاہ نے بوقاف اور گل چیں سے طویل گفتگو کی۔ اس وقت برکت صاحب کی سمجھ میں آسکا کہ سردار اور گاگے شاہ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ اسی وقت انہیں یہ بھی معلوم ہو سکا تھا کہ گل چیں، بوقاف کو پسند کرتی ہے اور اس کی خاطر جان بھی دے سکتی ہے۔ بہر حال، جب بوقاف اور مالوط کو بلایا گیا، تو گل چیں کو واپس بھیج دیا گیا تھا، البتہ بوقاف کا باپ موجود تھا۔

دونوں اس وقت چوروں کی طرح گردن جھکا کر کھڑے ہوئے تھے۔ باقی دیگر اور روناف (بوقاف کا باپ) خونخوار نظروں سے ان دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ پھر روناف گرجا۔

''تو آخر چاہتا کیا ہے......؟ بوقاف......! میں تجھ سے پوچھ رہا ہوں، تو کیوں بار بار مجھے انسانوں کے سامنے ذلیل کروا رہا ہے؟ بتا......''

بوقاف خاموش رہا۔ مالوط کن انکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ''روناف......!'' سردار نے بوقاف کے باپ کو مخاطب کیا۔ ''ہم آج اسے آخری بار سمجھا دیتے ہیں۔ اگر دوبارہ اس نے......''

''کوئی فائدہ نہیں ہے سردار۔'' روناف نے اس کی بات کاٹی۔ ''کوئی بھی فائدہ نہیں ہے۔ یہ کوئی بات نہیں سمجھے گا۔ اس پر بھوت سوار ہے...... عشق کا بھوت۔''

''ہو سکتا ہے سمجھ جائے۔'' سردار نے پھر کہا۔

''میں اس کا باپ ہوں۔ اچھی طرح اسے سمجھتا ہوں۔ اس کی چپ...... اس کی ہٹ دھرمی ظاہر کرتی ہے، ورنہ آپ خود معلوم کر لیں کہ یہ کیا چاہتا ہے۔'' روناف نے جواب دیا۔

یہ سن کر سردار بوقاف کی طرف متوجہ ہوا۔ ''کیوں بوقاف......! تم کیا چاہتے ہو......؟''

حسب عادت بوقاف خاموش رہا۔

''بولو...... جواب دو......'' سردار نے پھر کہا۔

اب بھی بوقاف کا سر جھکا ہوا تھا۔

''ادھر دیکھو...... میں تم سے مخاطب ہوں بوقاف......''

''میں...... میں...... کیا بتاؤں سردار......؟ میں اپنے دل کی بات پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔'' بوقاف نے زبان کھولی۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' سردار یکدم ہی غصے میں گرجا۔ ''وہ ایک آدم زادی ہے اور تم ہم میں سے ہو، جو تم چاہتے ہو، کیسے ممکن ہے؟''

''یہ تو میں نہیں جانتا سردار......'' بوقاف نے جھکی ہوئی گردن اٹھائی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ محبت اندھی ہوتی ہے۔''

"اب اتنی بھی اندھی نہیں ہوتی کہ مخلوقات کا فرق بھی مٹ جائے۔" برکت صاحب حسب عادت بول پڑے۔

مالوط نے انہیں گھور کر دیکھا، بولا کچھ نہیں۔ "یہ بدزبان بھی ہو چکا ہے سردار...... سن رہے ہیں آپ اس کے جواب......؟" روناف نے سردار سے شکایت کی۔

"سن رہا ہوں۔" سردار نے سر ہلایا اور پھر ایک طویل سانس لے کر دوبارہ بوقاف سے مخاطب ہوا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"سردار...... میں اس لڑکی کو پسند کرتا ہوں اور اس سے......" بوقاف کہتے کہتے رک گیا۔

"اور اس سے کیا......؟" گاگے شاہ نے اسے گھورا۔ برکت صاحب بھی ترچھی نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔ مالوط نے ایک کھنکھار ماری، جیسے گلا صاف کر رہا ہو۔

"اس سے...... میرا مطلب ہے کہ میں...... مہ پارہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" بوقاف نے اپنی بات پوری کر دی۔

"کیا اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے؟" برکت صاحب نے جھنجھلا کر گاگے شاہ سے کہا۔

"ایسا ہی لگتا ہے۔" وہ سر ہلا کر بولے۔ "کیونکہ اچھا خاصا آدمی جب شادی کر لیتا ہے تو پھر بعد میں وہ یہی کہتا ہے کہ میرا دماغ خراب ہو گیا تھا، اسی لئے شادی کر لی۔ یہ جن ہے، ہو سکتا ہے جنوں کا دماغ شادی سے پہلے خراب ہوتا ہو۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" بوقاف جل گیا۔ "میں بالکل اپنے ہوش و حواس میں ہوں۔"

"ہو سکتا ہے۔" گاگے شاہ لاپروائی سے کندھے اچکا کر بولے۔ "کسی کی کم بختی آتے، کتنی دیر لگتی ہے۔"

"تو تم...... مہ پارہ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟" سردار نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بوقاف سے پوچھا۔

"جی...... سردار......!" اس نے گردن ہلائی۔

"ہاں بھئی......" اب سردار نے سب لوگوں پر ایک گہری نظر ڈالی۔ "اب میں آپ سب لوگوں سے مخاطب ہوں، یعنی یہاں موجود جنوں سے بھی اور انسانوں سے بھی۔ میں نے ایک فیصلہ کیا ہے......" اتنا کہہ کر سردار خاموش ہو گیا۔

سارے بے چین ہو گئے۔ آخر مالوط بول پڑا۔

"کیسا فیصلہ سردار......؟"

"تم تو چپ ہی رہو تو بہتر ہے۔" سردار نے ناک بھوں چڑھائی۔ "تم بوقاف کے جرم میں برابر کے شریک ہو۔ اپنے کندھے پر سوار کر کے تم نے اس کی "ڈیٹیں" لگوائی ہیں، تم جن ہو کہ مرزا سودا کے کبوتر ہو......؟"

"کک...... کبوتر......؟" مالوط چونکا۔

"ہاں...... کبوتر...... میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم نے فلم "نور جہاں" کے کبوتر سے متاثر ہو کر پیغام رسانی بھی کی ہے۔ میں تمہارا سردار ہوں......

سمجھے......! کسی ریلوے اسٹیشن کا لائن مین نہیں ہوں کہ جسے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کون سی پٹری بدلنی ہے، تب ہی تو ریلوے کے اتنے حادثات ہوتے ہیں۔"

"س......سردار......" مالوط ہکلایا۔

"بس......خاموش......" سردار گرجا۔ "اب تک میں نے بہت کچھ برداشت کیا ہے...... مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم نے سلیم نامی ایک شریف اور نیک انسان کو بہت پریشان کیا ہے، اس بے چارے کا جینا دوبھر کر دیا ہے، اس غریب کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ مہ پارہ سے شادی کرنا چاہتا تھا......کیوں......؟"

اور مالوط کا رنگ اڑ گیا۔ تھوڑی دیر تک صحن میں موت کی سی خاموشی طاری رہی، پھر سردار ہی بولا۔ "تم لوگوں کی ایک ایک حرکت پر میری نظر رہی ہے......سردار ہوں میں......ہاں......اور مالوط......! اسے تو سزا ملے گی ہی، لیکن تم بھی اس کے جرم میں برابر کے شریک ہو، لہٰذا تمہارے لئے بھی میں نے سزا تجویز کی ہے اور وہ سزا ایسی ہے کہ تم نے جتنا سلیم کو پریشان کیا ہے، اس کا ازالہ ہو جائے گا۔ سزا......تمہیں بھی ملے گی......تیار رہو، پہلے میں بوقاف سے نمٹ لوں۔"

یہ کہہ کر سردار بوقاف کی طرف متوجہ ہوا۔

"تمہاری سزا یہ ہے کہ میں تمہیں انسان جیسا بنا دوں گا......پھر ہم لوگوں سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہوگا، نہ اپنے ماں باپ سے، نہ قبیلے سے اور نہ مجھ سے، کیونکہ تم انسانی خوبی کے مالک بن جاؤ گے......تم آدم زادی سے شادی کرنے کے لئے بضد ہو، اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب تم انسان جیسے بنا دیئے جاؤ۔ یہ ہے......تمہاری سزا......"

"بوقاف......انسان بن جائے گا؟" برکت صاحب نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

"ہاں......" سردار نے گردن ہلائی۔ "اور اب......آپ لوگ یہ بتایئے کہ بہ حیثیت انسان کے......بوقاف کو آپ اپنی فرزندی میں قبول کر لیں گے؟"

"مم......میں......میں......میں......" برکت صاحب کی گاڑی اٹک گئی۔

"یہ بکری کہاں سے آگئی؟" چنگا نے ادھر ادھر دیکھا۔

برکت صاحب نے اسے گھورا، پھر سردار کی طرف دیکھ کر بولے۔ "میں......فیصلہ نہیں کر پا رہا۔"

"دیکھ برکت......" گاگے شاہ نے دخل دیا۔ "تمہیں گھر داماد مل رہا ہے۔ تمہاری بیٹی بھی تمہارے گھر میں ہی رہے گی اور سونے پر سہاگہ یہ کہ گھر داماد بھی ہوگا۔"

برکت صاحب سوچ میں ڈوب گئے۔

"واقعی......بوقاف کو تو پھر اسی گھر میں رہنا ہوگا۔" روناف بھی بولا اور ساتھ ہی تیز نظروں سے بوقاف کو گھورا۔ "کیونکہ پھر ہم سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔"

بوقاف کچھ نہ بولا...... برکت صاحب سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے، وہ بار بار کبھی گاگے شاہ کی طرف دیکھتے اور کبھی بوقاف کی طرف۔ پھر گاگے شاہ نے ان کے کہنی ماری، وہ چونکے۔

''ٹھ......ٹھیک ہے۔ مجھے منظور ہے۔'' آخر کار انہوں نے کہا۔ بوقاف اور مالوط نے چونک کر انہیں دیکھا۔

''بہت خوب......'' سردار نے سر ہلایا۔ ''بس......تو پھر ٹھیک ہے۔ جلد ہی بوقاف اور مہ پارہ کا نکاح کر دیا جائے گا۔ ہم لوگ......صرف نکاح میں ضرور شرکت کریں گے۔ اس کے بعد ہمارا اور بوقاف کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ یہ جانے اور اس کا کام جانے۔''

''ٹھیک ہے۔'' گاگے شاہ نے سر ہلایا۔

''تمہیں یہ سب منظور ہے بوقاف......؟'' سردار نے اب بوقاف سے پوچھا۔

''اسے کیوں منظور نہ ہوگا......!'' روناف نے مداخلت کی۔ ''اس کا من پسند کام ہو رہا ہے۔ اسے ہم لوگوں کی کیا پرواہ......''

''میں نے بوقاف سے پوچھا ہے۔'' سردار نے اسے گھورا۔ پھر دوبارہ جواب طلب نظروں سے بوقاف کی طرف دیکھا۔

''مجھے......منظور ہے۔'' بوقاف نے سر جھکا کر کہا۔

چند ثانئے خاموشی رہی۔ پھر روناف بولا تھا۔

''دیکھا سردار......میں نے کہا تھا نا......اسے ہماری قطعی پرواہ نہیں ہے۔''

''جس میں اس کی خوشی......'' سردار نے کندھے اچکا کر کہا۔ پھر وہ بولا۔ ''اب میں بوقاف کو انسان بنا رہا ہوں، تاکہ یہ انسانی جون میں آ کر ابھی سے انسانوں کے طور طریقے سیکھ لے......کیونکہ پھر اس کی شادی ہے۔ لو بوقاف......سنبھالو انسانی جسم کو سنبھالو۔''

یہ کہہ کر سردار نے اپنا سیدھا ہاتھ بوقاف کی طرف کر کے ہاتھ کو زوردار جھٹکا دیا۔ فوراً ہی بوقاف غائب ہوگیا۔

''یہ......یہ کہاں غائب ہوگیا؟'' برکت صاحب نے چونک کر پوچھا۔

''اسی علاقے میں ہے۔'' سردار نے لاپروائی سے کہا۔ ''چونکہ وہ اب اسی گھر میں شادی کرنے والا ہے، اس لئے اس کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ اتنا تو مجھے بھی معلوم ہے۔'' یہ کہہ کر سردار نے مالوط کو گھورا۔ مالوط نظریں چرانے لگا۔

''اور......اب مالوط......! تم اپنی سزا کے لئے تیار ہو جاؤ۔'' سردار نے اسے مخاطب کر ہی لیا۔

مالوط کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

☆......☆......☆

کمر پر پڑنے والی پہلی ہی لات اتنی شاندار تھی کہ اس کے چودہ طبق روشن ہوگئے، وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ''کون ہے بے تو؟ ہیں......؟ کیا کر رہا ہے میرے ہوٹل میں......؟'' ایک غصے سے بھری ہوئی، لیکن باریک سی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''مم......مم......میں......'' وہ ہکلا کر رہ گیا۔ پھر چندھیائی ہوئی سی آنکھوں سے سامنے والے کو دیکھا، اور پھر ادھر ادھر تکنے لگا۔

’’میں پوچھ رہا ہوں تو میرے ہوٹل میں گھسا کیسے؟ ہوٹل بند تھا اور ابھی ابھی آ کر میں نے اسے کھولا ہے...... تو اندر کب آیا اور کیسے آیا......؟‘‘ پھر باریک آواز گونجی اور دوسری لات نے بھی اس کی کمر توڑنے کی کوشش کی۔

اب تو اسے ہوش آ گیا۔ گومگوسی کیفیت کی جگہ، غصے نے لے لی، وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور سامنے والے کو گھورنے لگا۔ اس کے مقابل ایک چھوٹے قد کا گول مٹول سال آدمی کھڑا ہوا تھا۔

’’ابے تو ہے کون......؟ منہ سے تو پھوٹ ...... ہیں بے......‘‘ گول مٹول سا آدمی پھر بولا۔ اس کی باریک سی آواز اس جسم پر عجیب سی محسوس ہوتی تھی۔

’’میں...... میں......‘‘ غصے کے مارے وہ جواب نہ دے پایا۔

’’ابے کیا بکرے کا بچہ ہے جو میں میں کر رہا ہے......؟ شکل سے تو لگ رہا ہے کہ تو اودھ بلاؤ کی نسل سے ہے۔‘‘ وہ آدمی ہنسا۔

’’خاموش ...... بدتمیز......‘‘ وہ بلند آواز سے بولا۔ لہجے سے شدید غصہ ظاہر ہو رہا تھا۔ ویسے اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ عجیب قسم کی بے چینی کا شکار ہے۔

’’چپ کر چھچھوندر...... مجھے رعب نہ دکھا...... ایک تو میرے ہوٹل میں گھسا ہوا ہے اور پھر مجھے ہی آنکھیں دکھا رہا ہے۔ تو ہے کون بد ذات......؟‘‘ گول مٹول جھنجلایا۔

’’میں ایک جن ہوں...... بوقاف نام ہے میرا......‘‘ وہ بول ہی پڑا۔

’’جن......!‘‘ گول مٹول نے حیرت سے دہرایا اور پھر بوقاف کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا۔

پھر جو گول مٹول کی ہنسی چھوٹی ہے تو خدا کی پناہ......! وہ ہنستا ہی چلا گیا۔ اس ہنسنے کے چکر میں کبھی وہ ادھر لڑھکتا اور کبھی ادھر ڈول جاتا۔ بوقاف حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

’’ابے...... تو...... جن...... ہے؟‘‘ گول مٹول نے ہنسی کے درمیان انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ پھر بمشکل اس کی ہنسی رکی تھی۔

’’کیوں......؟‘‘ بوقاف نے حیرت سے پوچھا اور پھر جلدی سے خود کو ٹٹولا۔

اگلے ہی لمحے اس کی طبیعت صاف ہو گئی۔ کمر بالکل صاف تھی اور سر پر سے سینگ بھی غائب تھے۔ سردار کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ ’’انسان بننے کے لئے تیار ہو جاؤ......‘‘

یہ خیال آتے ہی اس کے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ کیا اسے واقعی انسان بنا دیا گیا تھا......؟

لیکن اس وقت وہ تھا کہاں......؟

’’ابے کیا ٹٹول رہا ہے...... کیا کھو گیا......؟‘‘ گول مٹول پھر ہنسا۔

بوقاف پر جھلاہٹ سوار ہو گئی، لیکن وہ ضبط کر گیا۔ ’’اپنے پر اور سینگ دیکھ رہا ہوں۔‘‘ وہ منہ بنا کر بولا۔

''ملے......؟'' گول مٹول کا لہجہ مذاق اڑانے والا تھا۔ ''دم بھی دیکھ لے...... ہے کہ نہیں ہے۔''

''تم سمجھ رہے ہو کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ میں واقعی جن ہوں۔''

''ابے...... آئینے میں اپنی شکل دیکھ...... صائمہ سے بچھڑا ہوا سید نور لگ رہا ہے...... ہونہہ......'' گول مٹول نے برا سا منہ بنایا۔ پھر چہرے کو ذرا ترچھا کر کے اور بھنوئیں چڑھا کر بوقاف سے مخاطب ہوا۔

''اب زیادہ ہوشیاری مت دکھا ہاں...... میرا نام شبن ہے...... شبن خیراتی...... ہاں...... تو میرے ہوٹل پر قبضہ کرنا چاہتا ہے...... بول...... کس نے تجھے بھیجا ہے بول...... لینڈ مافیا نے......؟''

''نہیں...... سردار نے......'' بوقاف جلدی سے بولا۔

''سردار نے بھیجا ہو یا مردار نے...... اب تو یہ بتا کہ تیرے ساتھ کیا سلوک کروں......؟ تجھے پولیس کے حوالے کردوں؟''

''کردو......'' بوقاف نے جلدی سے سر ہلایا۔ ''تم سے تو جان چھوٹے گی۔''

''ابے...... میں یہاں اکیلا ہوں...... تھانے میں بہت سارے ہوں گے۔ چل...... ایک کام کر......'' یکایک شبن کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

''وہ کیا......؟'' بوقاف نے پوچھا۔

''پہلے یہ بتا کہ تو رہتا کہاں ہے؟'' شبن نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''اب تو کہیں بھی نہیں رہتا۔'' بوقاف نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''مجھ سے مت اڑ......'' شبن کے تیور پھر بگڑے، لیکن پھر فوراً ہی وہ خود کو سنبھال کر بڑے پیار سے بولا۔ ''دیکھ بے کوہ قاف......!''

''بوقاف......'' بوقاف نے اس کی بات کاٹ کر تصحیح کی۔

''وہی...... وہی......'' شبن نے جلدی سے سر ہلایا۔ پھر بوقاف کا بازو پکڑ کر اسے سامنے رکھی ہوئی چارپائی پر بٹھا دیا۔

''دیکھ...... غور سے سن۔'' شبن نے خود بھی اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''دیکھ پیارے......! اگر میں نے تجھے جیل بھجوا دیا تو کئی سال تک تو وہاں سڑے گا...... تجھے مارا پیٹا الگ جائے گا...... یعنی پھر چاروں طرف سے تیری مرن ہی مرن ہوگی...... اس سے بہتر یہ ہے کہ تو میرے ہوٹل میں ملازمت کرلے۔'' شبن نے اسے سمجھایا۔

''ملازمت......؟'' بوقاف نے حیرت سے کہا۔

''ہاں...... تو ہوٹل کا تندور سنبھال لے، اور روٹیاں پکا...... تو تو جن ہے نا...... تو سنبھال لے گا...... دراصل...... مصیبت یہ ہے کہ گرمی کی وجہ سے تندور پر کوئی رکتا نہیں ہے۔ میں جسے بھی رکھتا ہوں، وہ مہینے دو مہینے کام کر کے پھوٹ لیتا ہے۔ تم تو جن ہونا......! تمہیں آگ کہاں بھگا سکتی ہے۔ ارے...... تم تو خود اس کو بھگا دو گے...... اللہ قسم......''

وہ اب تو سے تم پر آ گیا تھا۔ بوقاف غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا، شبن کا رویہ یکدم ہی بدلا تھا۔ ''تو میں...... تمہارے تندور میں

روٹیاں لگاؤں......؟'' بوقاف نے پرسکون انداز میں سوال کیا۔

''اگر آپ تندور میں کچھ اور بھی لگانا چاہیں تو لگا سکتے ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔'' وہ اب تم سے بھی آپ پر آ گیا۔ ''لیکن روٹیاں لازمی ہیں۔''

''تمہیں لگا دوں تندور میں......؟'' بوقاف نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

''ارے......ہی ہی ہی......'' وہ ہنسا۔ ''میرا تندور بہت چھوٹا ہے......''

''میں روٹیاں نہیں لگا سکتا، البتہ تمہیں ضرور لگا دوں گا۔'' بوقاف جل کر بولا۔ ''تندور میں......''

''اوئے......'' شبن کا لہجہ اور تیور یکدم بدل گئے۔

''تو نے پھر بکواس شروع کر دی، تو مجھے جانتا نہیں ہے۔ شبن ہوں میں شبن......ہاں......تجھے کام کرنا پڑے گا یہاں۔ ورنہ جیل بھجوا دوں گا......چکی پیسے گا وہاں......اب......تجھے تکلیف کیا ہے آخر یہاں کام کرنے میں......ہیں......؟ یہاں کھا پی......اور آرام سے سو رہ......اور تجھے کیا چاہئے......؟''

بوقاف سوچ میں پڑ گیا۔ شبن ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔ وہ اب کہاں ٹھوکریں کھاتا پھرے گا۔ یہاں کھانے پینے کا انتظام بھی تھا اور رہنے کا ٹھکانہ بھی ہو رہا تھا۔

ویسے شبن تھا عجیب آدمی......گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا تھا کم بخت......پل میں کچھ اور پل میں کچھ......

''ٹھیک ہے......مجھے منظور ہے۔'' بوقاف طویل سانس لے کر بولا۔

''جیو......بادشاہ......'' شبن خوشی سے اچھلا۔ پلنگ چر چرا اٹھا۔ ''ارے......آپ تو بہت اچھے اور نیک جن ہیں......آپ کی تو بات ہی کیا ہے......آپ......''

☆......☆......☆

سلیم......فلمیں دیکھ دیکھ کر مر جانے کی حد تک بور ہو چکا تھا۔ فلمیں دیکھتے ہوئے آج اسے چوتھا دن تھا۔ اب اس کا خوف کافی حد تک زائل ہو چکا تھا کیونکہ وہ بور ہو رہا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ بوریت نے اس کے ذہن پر سوار ہو کر کسی اور احساس کو قریب رہنے ہی نہ دیا۔

اور پھر آج......اسے مہ پارہ بھی شدت سے یاد آ رہی تھی۔ مہ پارہ کا خواب ناک چہرہ بار بار اس کے تصور میں ہلکورے لے رہا تھا، وہی مہ پارہ......جس کے دروازے سے وہ خالی ہاتھ لوٹ آیا تھا۔

پھر ان خیالوں کی ایسی یلغار ہوئی کہ وہ گھر سے نکل بھاگا۔ اس کا رخ دوکان کی طرف تھا، گیدڑ ہوتا تو......بہر حال، اس کا ارادہ دوکان کھولنے کا تھا، کیونکہ دوکان کافی دنوں سے بند ہی پڑی ہوئی تھی۔ وہ اس وقت اسٹاپ پر کھڑا ہوا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا، یہی وجہ تھی کہ یہاں اکا دکا افراد ہی دکھائی دے رہے تھے۔

سلیم بھی اپنی بس کا انتظار کرنے لگا۔ دفعتاً اس کے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا، وہ چونک کر مڑا۔ کیا دیکھتا ہے کہ اس کے سامنے ایک نورانی چہرے والے بزرگ کھڑے ہیں۔ ان کے چہرے پر داڑھی ہے اور وہ سفید رنگ کا صاف ستھرا لباس پہنے ہوئے ہیں۔ سلیم حیرت سے انہیں دیکھنے لگا۔

”پریشان مت ہو سلیم بیٹا۔“ بزرگ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے تسلی دی۔ ”میں روایتی بزرگ ہوں، اور چونکہ گھر سے فالتو ہوں، اس لئے ہر کسی کو مل جاتا ہوں۔“

”اوہو......“ سلیم خوشی سے اچھلا۔ ”آپ وہی ہیں جو ہر کہانی میں موجود ہوتے ہیں اور ہیرو کی مدد کرتے ہیں؟“

”ہاں...... میں وہی ہوں۔“ انہوں نے منہ بنا کر مایوسی سے کہا۔ پھر چونک کر بولے۔ ”لیکن تم ہیرو ہرگز نہیں ہو۔ اس خوش فہمی میں مت رہنا۔ شکل دیکھی ہے کبھی آئینے میں......؟ ہیں......؟“

”جی ہاں...... جی ہاں۔“ سلیم جلدی سے سر ہلا کر بولا۔ ”روز دیکھتا ہوں۔ میری شکل بھی خراب ہے اور قسمت بھی۔“

”فکر مت کر بچہ......!“ بزرگ نے جلال میں آ کر کہا۔ ”تیری شکل تو ایسی ہی فٹے منہ رہے گی، اس کا کچھ نہیں ہو سکتا...... البتہ تیری قسمت ضرور بدل جائے گی۔“

”سچ بابا......؟“ سلیم خوش ہو گیا۔ ”وہ کیسے......؟“

”تو مہ پارہ سے شادی کرنا چاہتا ہے نا؟“ بابا نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

یہ سن کر سلیم بری طرح چونکا۔

☆......☆......☆

کیپٹل ایجنسی

کیپٹل ایجنسی، مظہر کلیم کی عمران سیریز کا ایک اور تیز رفتار اور ایکشن سے بھرپور سائنسی ناول ہے۔ اس بار پاکیشیا کے سائنسدانوں نے ایک ایسا لیزر ہتھیار ایجاد کیا ہے جو کسی بھی آتشی اسلحہ یا جاندار کو کچھ دیر کے لئے بیکار کر سکتا ہے۔ ایکریمیائی حکومت نے اس ہتھیار کو تباہ کرنے کے لئے کیپٹل ایجنسی کی خدمات حاصل کی ہیں۔ لیکن عمران اور اُس کے ساتھیوں نے نہ صرف اس ایجنسی کو ختم کر ڈالا کر دیا بلکہ ایکریمیا کی ایک انتہائی اہم لیبارٹری بھی تباہ کر دی۔

”**کیپٹل ایجنسی**“ کتاب گھر پر دستیاب ہے۔ جسے **ناول** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

دوسرے دن حکیم طولانی کا ''مرض'' اپنے عروج پر تھا۔ دردِ قولنج کی طرح کسی کو اپنی غزل سنانے کی جستجو انہیں تڑپا رہی تھی اور حکیم طولانی سے قطع نظر، وہ مرغِ سیماب دکھائی دے رہے تھے۔

گھر میں تو اپنی بیگم کو سنا نہیں سکتے تھے، کیونکہ باورچی خانے میں بالکل ''زیرو میٹر'' کانچ کے برتنوں کا سیٹ رکھا ہوا تھا۔ جسے وہ پرسوں ہی مارکیٹ سے خرید کر لائے تھے۔ لامحالہ...... کہیں وہی سیٹ بیگم اٹھا کر ان کے سر پر مار دیتیں تو......! ہزاروں کا نقصان ہو جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ حکمت اور شاعری سے جو کچھ بچا کھچا دماغ تھا، اس نے کام کیا اور وہ گھر سے چپ چاپ نکل آئے۔

اُن کا ارادہ آج قطعی مطب جانے کا نہیں تھا۔ موڈ ہی نہیں تھا۔ جب تک وہ اطمینان سے بیٹھ کر کسی کو اپنی غزل نہیں سنا دیتے، انہیں قرار نہیں آ سکتا تھا۔ بہرحال وہ نکل کھڑے ہوئے تھے، اور اب یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ دور دور تک کوئی بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ نہ شرفو سبزی والا، نہ ہاشم کباڑیہ، نہ قدوس برتن والا اور نہ کرم وچھابڑی والا...... کوئی بھی تو نہیں تھا۔

اچانک حکیم طولانی کو سلیم دودھ والا یاد آیا۔ اُس سے بھی اُن کی اچھی دعا سلام تھی، وہ اُن کی کافی عزت بھی کرتا تھا۔ اس کا خیال آتے ہی وہ تیز تیز قدموں سے اس کی دکان کی طرف چل دیے۔

سلیم دودھ والا اس وقت اپنی دکان میں بیٹھا ہوا مزے سے دودھ میں پانی ملا رہا تھا۔ اس وقت کوئی گاہک بھی موجود نہیں تھا۔ حکیم طولانی کو دیکھتے ہی وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے کا رنگ بھی اڑ گیا تھا۔

''حک...... حک...... حک......'' اس سے بولا بھی نہ جا سکا۔

''یہ کون سا ورد کر رہے ہو بھئی......؟'' حکیم طولانی چونکے، پھر سر ہلا کر خود ہی بولے۔ ''اچھی بات ہے...... اچھی بات ہے۔ اس سے دکان اور کاروبار میں برکت ہوتی ہے۔''

سلیم نے زور سے نفی میں سر ہلایا۔

''مم...... میں...... میں تو آ...... آپ کا نام لے رہا تھا۔''

''ہائیں......'' حکیم صاحب چونکے۔ ''بڑوں کا نام لیتے ہو؟ شرم نہیں آتی تمہیں......؟''

''افوہ......'' سلیم نے بھاری بھرکم ہونے کے باوجود پاؤں پٹخے۔ ''میں آپ کا نام تھوڑی لے رہا تھا۔''

''عجیب آدمی ہو۔ ابھی کہہ رہے تھے کہ آپ کا نام لے رہا تھا اور اب کہہ رہے ہو کہ نام نہیں لے رہا تھا۔ تمہارا دماغ تو درست ہے......؟''

''ارے حکیم صاحب...... میں دراصل یہ کہنا چاہتا تھا کہ حکیم صاحب...... السلام علیکم...... بس......'' سلیم نے بتایا۔

''وعلیکم السلام......'' وہ جلدی سے بولے۔ ''لیکن یہ تو کوئی اتنی مشکل بات نہیں تھی کہ جو تمہارے منہ سے نکل نہیں رہی تھی۔''

''میں دراصل...... گھبرا گیا تھا جی......'' اس نے بتایا۔

''کیوں بھئی......؟ تم گھبرا کیوں گئے تھے......؟ میں ڈکیت ہوں یا تم کوئی چوری کر رہے تھے؟'' انہوں نے اسے غور سے دیکھا۔

”ن ...... نہیں ...... میں کوئی چوری نہیں کر رہا تھا۔“ اس نے جلدی سے کہا۔

”ہیں ......؟“ حکیم طولانی نے آنکھیں نکالیں۔ ”تو پھر کیا ...... میں ڈکیت ہوں؟“

”ن ...... ن نہیں ......“ اس نے گڑبڑا کر کہا۔

”تو پھر ...... آخر کیا بات ہے؟ تم گھبرا گئے تھے؟“ حکیم طولانی بھی اڑ گئے۔

”وہ دراصل میں پانی ...... مم میرا مطلب ہے کہ دودھ ...... پانی ...... دودھ ......“ وہ پھر ہکلانے لگا۔

”کیا لگا رکھا ہے یہ پانی دودھ اور دودھ پانی ......؟ صاف صاف بتاؤ ......؟“

”وہ جی ......“ اب سلیم کچھ سنبھل گیا تھا۔ ”میں دودھ کو پانی سے دھو رہا تھا۔“

”اوہ ...... اچھا ...... اچھا۔“ حکیم طولانی نے سر ہلایا۔ ”یہ تو بہت اچھی بات ہے بھئی ...... لوگوں کو صاف ستھری چیزیں ہی مہیا کرنی چاہئیں ...... اور ہاں ...... میں دراصل اس لئے آیا ہوں کہ ......“

”آپ اندر تو تشریف لائیں ...... آرام سے بیٹھیں، میں آپ کو لسی پلاتا ہوں۔“ سلیم نے خندہ پیشانی سے کہا۔

حکیم صاحب جلدی سے دکان میں گھس آئے اور سامنے رکھی ہوئی دو کرسیوں میں سے ایک سنبھال لی۔ سلیم بھی ان کے سامنے ہی دراز ہو گیا۔ ”جی ...... حکیم صاحب ......!“ وہ ہمہ تن گوش ہو چکا تھا۔

”میں دراصل تمہیں اپنی تازہ ......“ حکیم صاحب نے بولنا چاہا۔

”ایک منٹ حکیم صاحب ...... لسی تو رہ گئی۔“ سلیم نے چونک کر ان کی بات کاٹی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

کونے میں ڈیپ فریزر رکھا ہوا تھا۔ سلیم نے اس میں سے لسی کا گلاس نکالا اور لا کر حکیم صاحب کو پیش کر دیا۔ حکیم صاحب نے غٹاغٹ لسی ”چڑھائی“ اور گلاس نیچے رکھ دیا۔

”ہاں ...... اب کہیئے ......!“ سلیم نے پھر کہا۔

”بات یہ ہے کہ میں تمہیں اپنی ......“ حکیم صاحب نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

”لسی کیسی تھی حکیم صاحب؟“ سلیم نے دوبارہ ان کی بات کاٹ دی۔

”بہت اچھی تھی، میں دراصل تمہیں اپنی ......“

”اور لسی لاؤں ......؟“

”نہیں بھئی ...... لسی کا تو ایک ہی گلاس بہت ہوتا ہے۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ......“

”لسی بنانا بھی ایک فن ہے جی ......“ سلیم کا لہجہ فاتحانہ تھا۔

”بالکل بھئی ...... بالکل ...... ہاں تو میں تمہیں ......“

"میں نے اپنے ابا سے لسی بنانا سیکھی تھی۔"

"سیکھی ہوگی...... سیکھی ہوگی...... میں یہ کہہ رہا تھا کہ......"

"اور جناب......" سلیم نے پھران کی بات کاٹی۔ "اللہ بخشے...... میرے دادا کے ہاتھ کی لسی اگر آپ پی لیتے تو عش عش کرتے۔"

"ضرور...... ہاں...... تو میں تمہیں اپنی......"

"دور دور سے پہلوان آتے تھے ان کے پاس...... ہاں جی......"

"آتے ہوں گے...... ضرور آتے ہوں گے...... میں تمہیں اپنی تازہ......"

"جگا پہلوان کا نام سنا ہے آپ نے......؟"

"سنا ہوگا...... ہاں...... تو......"

"ارے...... بڑا مشہور پہلوان تھا جی...... کسی اور کے ہاتھ کی لسی تو اسے پسند ہی نہیں آتی تھی۔" سلیم نے پھر انہیں بولنے کا موقع نہیں دیا۔

حکیم صاحب بے بسی سے اپنے ہونٹ کاٹتے رہے۔ ادھر سلیم نے جو جگا پہلوان کے قصے چھیڑے ہیں تو بس......

سلیم بولے جا رہا تھا اور حکیم صاحب بے بسی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ آخر کار جب ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا تو وہ بے ساختہ ہوگئے۔

ان کی آنکھوں میں بے بسی دیکھ کر سلیم جگا پہلوان کی داستان سناتے سناتے رک گیا اور خود بھی غمزدہ آواز میں بولا۔ "افسردہ مت ہوں حکیم صاحب...... اللہ بخشے...... افسوس کرنے سے جگا پہلوان کوئی واپس تھوڑی آجائے گا...... صبر کریں......"

یہ سن کر حکیم صاحب باقاعدہ اور بلند آواز سے افسوس کرنے لگے۔ سلیم نے اٹھ کر ان کی پیٹھ تھپکی۔ اب اسے کیا معلوم کہ حکیم صاحب کیوں ایسا کر رہے تھے......!

☆......☆......☆

"آپ مہ پارہ کو کیسے جانتے ہیں......؟" سلیم کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ابے بدبخت...... ہم کیا اسی عمر میں عشق کریں گے؟" بابا کو طیش آگیا۔ "ارے بے وقوف......! ہم کہانیوں والے بابا ہیں۔ ہم سے کوئی بات چھپی نہیں ہوتی۔ ہم سب کچھ جانتے ہیں۔"

"اوہ ہاں...... مم...... میں بھول گیا تھا۔ پلیز...... معاف کر دیں۔" سلیم نے جلدی سے کہا۔

"جاؤ...... معاف کیا......" بابا نے گویا فراخدلی کا مظاہرہ کیا۔ "اب تم یہ بتاؤ کہ مہ پارہ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟"

"جج...... جی...... بالکل......"

"ابے مت کر شادی...... کیا پاگل ہوا ہے......؟ شادی کرنے والوں کا حال دیکھا ہے؟ مجھے ہی دیکھ لے...... میری بیوی مجھے اتنا مارتی ہے

.......اتنا مارتی ہے کہ بس......‘‘ ان کی آواز گلوگیر ہوگئی۔

’’مہ پارہ سے شادی نہیں ہوئی تو میں مرجاؤں گا بابا......!‘‘ سلیم کراہا۔

’’اتنا گھسا پٹا ڈائیلاگ مت بول......‘‘ بابا نے آنکھیں نکالیں۔

’’اچھا......‘‘ سلیم نے جلدی سے کہا اور جملہ بدل کر کہا۔ ’’مہ پارہ سے شادی ہوگئی تو میں مرجاؤں گا بابا......!‘‘

’’اب ہوئی نا بات......‘‘ بابا خوش ہوگئے۔ ’’مرے گا......اور بے موت مرے گا۔ فکر مت کر۔‘‘

’’تو پھر جلدی سے بتایئے کہ میں بے موت کب اور کیسے مروں گا؟‘‘ سلیم نے بڑی حسرت سے پوچھا۔

’’تو تو بے موت ہی مرنا چاہتا ہے؟‘‘ بابا نے ترچھی نظر کی۔

’’جی بابا......‘‘

’’اچھا تو سن......اور غور سے سن......!‘‘ بابا نے تنبیہہ کی۔

’’میرا خیال ہے بابا......آپ بھول رہے ہیں۔‘‘ سلیم نے انہیں ٹوکا۔ ’’صحیح بول ہیں کہ سن صاحبہ سن...... پیار کی دھن۔‘‘

’’گستاخ......بے ادب......‘‘ بابا غصے میں گرجے۔ ’’تو کیا ہمیں نوٹنکی والا سمجھ رہا ہے؟‘‘

’’نہیں بابا......ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کے گھر میں پانی کی ایک ہی ٹنکی ہوگی، نوٹنکیوں کا آپ بھلا کیا کریں گے؟‘‘

’’تو احمق بھی ہے۔‘‘ بابا نے کان کھجایا۔ ’’تجھ سے کوئی بات کرنا فضول ہے۔ اچھا......سن......پیار کی دھن......ہت تیرے کی......مم......میرا مطلب ہے کہ اگر تو مہ پارہ سے شادی کرنا چاہتا ہے تو آج سے ٹھیک دو ماہ بعد شام کے وقت مہ پارہ کے گھر کے سامنے پہنچ کر چیخنا شروع کردے کہ اگر مہ پارہ کی شادی ہوگئی تو میں خودکشی کرلوں گا۔‘‘

’’یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بابا......؟‘‘ سلیم نے حیرت سے کہا۔ ’’اس سے زیادہ اوٹ پٹانگ بات میں نے کبھی نہیں سنی۔‘‘

’’تو اب سن لے......کیا فرق پڑتا ہے......ابے گدھے......! جو میں کہہ رہا ہوں، وہ کر......ورنہ پچھتائے گا۔‘‘

’’آپ کہتے ہیں تو کرلیتا ہوں، ورنہ آپ کی جگہ کوئی اور سر پھرا ہوتا تو میں اس کی مالش کردیتا۔ وہ کُٹ لگاتا کہ بس......‘‘

’’بس......بس۔ رہنے دے منہ کی باکسنگ، اور اس بات کو اپنی گرہ سے باندھ لے۔ آج سے ٹھیک دو ماہ بعد......اور ہاں......مہ پارہ کے گھر کے سامنے یہ اعلان کرنے کے بعد کم از کم دو ماہ کے لئے کہیں دور دراز شہر میں چلے جانا۔‘‘

’’ہائیں......‘‘ سلیم نے آنکھیں پھاڑیں۔ ’’شہر بھی چھوڑنا پڑے گا......؟‘‘

’’ہاں......یہ ضروری ہے۔ کل ٹوٹل یہ چار ماہ کی مدت ہے۔ اگر تو نے یہ سب کرلیا، تو پھر مہ پارہ تیری ہے۔‘‘

’’اور......اور......دو مہینے تک جب میں شہر سے باہر رہوں گا، تو میری دکان کا کیا ہوگا؟‘‘ سلیم کے لہجے میں تشویش تھی۔

’’اسے میں نیلام کروادوں گا۔‘‘ بابا فوراً بولے۔ ’’ابے تو کیسا عاشق ہے؟ لوگ عشق میں دنیا چھوڑ دیتے ہیں اور تو دو مہینے کے لئے دکان

نہیں چھوڑ سکتا...... تُف ہے تجھ پر...... لعنت ہے تجھ پر...... ملامت ہے تجھ پر اور......"

"بس بابا میں۔" سلیم نے ہاتھ اٹھایا۔ "اتنا ہی کافی ہے۔ میں کرلوں گا یہ سب...... کرلوں گا۔"

"شاباش۔" بابا خوش ہوگئے۔ "جا...... اب تو جا...... تیرا کام ہوگیا۔"

دفعتاً سلیم کو کچھ یاد آ گیا۔ جلدی سے بولا۔

"بابا جی......! آپ کو تو معلوم ہوگا۔ یہ مالوطن کون ہے؟ اور...... اور...... وہ سینگوں والی برقعہ پوش عورت کون تھی، جو میری دکان پر آئی تھی!"

"ابے...... یہ کیا یاد آ گیا تجھے بد بخت......" بابا زیر لب بڑبڑائے، پھر بلند آواز سے سلیم کو مخاطب کیا۔ "ان سب باتوں کو بھول جا...... نکال دے انہیں اپنے ذہن سے......"

"کیوں نکال دو......؟" سلیم نے آنکھیں دکھائیں۔

"مت نکال...... میرا کیا ہے......" بابا نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔ "تیرا اپنا ہی دماغ خراب ہوگا۔"

"اوہ...... ہاں۔ یہ بھی آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اچھا تو...... میں وہ سب بھول جاؤں گا۔"

"اچھا کرے گا۔" بابا نے سر ہلایا۔ "اب میں جا رہا ہوں۔ تو وہی کرنا، جو میں کہہ چکا ہوں۔" یہ کہہ کر بابا غائب ہوگئے اب وہاں صرف سلیم ہی کھڑا تھا۔

☆......☆......☆

میرے خواب ریزہ ریزہ

جو چلے تو جاں سے گزر گئے جیسے خوبصورت ناول کی مصنفہ ماہا ملک کی ایک اور خوبصورت تخلیق۔ میرے خواب ریزہ ریزہ کہانی ہے اپنے "حال" سے غیر مطمئن ہونے اور "شکر" کی نعمت سے محروم لوگوں کی۔ جو لوگ اس نعمت سے محروم ہوتے ہیں، وہ زمین سے آسمان تک پہنچ کر بھی غیر مطمئن اور محروم رہتے ہیں۔

اس ناول کا مرکزی کردار زینب بھی ہمارے معاشرے کی ہی ایک عام لڑکی ہے جو زمین پر رہ کر ستاروں کے درمیان جیتی ہے۔ زمین سے ستاروں تک کا یہ فاصلہ اس نے اپنے خوش رنگ خوابوں کی راہ گزر پر چل کر طے کیا تھا۔ بعض سفر منزل پر پہنچنے کے بعد شروع ہوتے ہیں اور انکشافات کا یہ سلسلہ اذیت ناک بھی ہوسکتا ہے۔ اس لیے رستوں کا تعین بہت پہلے کرلینا چاہیے۔

یہ ناول کتاب گھر پر دستیاب ہے، جسے رومانی معاشرتی ناول سیکشن میں پڑھا جاسکتا ہے۔

شبن خیراتی بہت خوش تھا، کیونکہ اسے کوئی چراغ رگڑے بغیر ایک جن مل گیا تھا۔ ایک ایسا جن جو کسی قسم کے نخروں کے بغیر تندور سنبھالے ہوئے تھا۔ نہ اسے آگ کی گرمی کا احساس ہوتا تھا، اور نہ وہ کوئی اور شکایت کرتا تھا۔

بہر حال، کچھ بھی ہو...... شبن خیراتی کی جان چھوٹ گئی تھی، ورنہ آئے دن اسے نئے نئے تندور لگانے والوں کو ڈھونڈنا پڑتا تھا۔

اب وہ اطمینان سے کاؤنٹر سنبھالے ہوئے تھا، پہلے وہ ٹیپ ریکارڈر پر غم زدہ گانے سنا کرتا تھا، لیکن اب اس کے ہوٹل میں شوخ قسم کے گانے گونجا کرتے تھے، وہ خوش جو تھا۔

بس...... صرف ایک مسئلہ تھا اور وہ تھا بوقاف کی خوراک کا مسئلہ، کم بخت...... جنوں ہی کی طرح کھاتا تھا۔ ایک وقت میں تندور کی درجن درجن بھر روٹیاں ہڑپ کر جاتا تھا، سالن کی پلیٹیں اس کے علاوہ ہوتیں اور ان کی تعداد اس پر منحصر تھی کہ پکا کیا ہے...... اگر نہاری یا قورمہ ہوتا تو پلیٹوں کی تعداد بھی روٹیوں کے برابر پہنچ جاتی۔

اکثر اوقات شبن اپنا سر پیٹ لیتا اور جھلا کر بوقاف سے کہتا۔ ''بوقاف صاحب......! کہیں آپ کے پیٹ میں کیڑے تو نہیں ہیں؟''

وہ اب بوقاف سے آپ جناب سے ہی بات کرتا تھا، کیونکہ بوقاف کی دیگر حرکتوں کے علاوہ اس کی خوراک بھی بتا رہی تھی کہ وہ واقعی جن ہے۔

''معلوم نہیں......'' بوقاف کندھے اچکا کر کہتا۔ ''اگر انسان بننے کے بعد ہو گئے ہوں، تو کہہ نہیں سکتا۔''

''کیا مطلب......؟'' شبن الجھ کر پوچھتا۔

''انسان کا مطلب بتاؤں یا کیڑوں کا؟'' بوقاف منہ بنا کر کہتا اور دوبارہ سے کھانے پر ٹوٹ پڑتا۔ ویسے شبن کے لئے یہ سودا برا نہیں تھا۔ بوقاف کو کون سی اجرت دینی پڑتی تھی......! کھانا ہی تو کھا رہا تھا، بھلے دس آدمیوں کا سہی۔

شبن کے ہوٹل میں دو ملازم اور بھی تھے، جو کھانا اور چائے گاہکوں کو سرو کرتے تھے۔ وہ دونوں بوقاف سے ذرا دور ہی دور رہتے تھے، کیونکہ شبن نے انہیں ڈرا دیا تھا کہ بوقاف تھوڑا سا کریک ہے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ شبن چاہتا تھا کہ اس کے علاوہ اور کوئی بوقاف سے واقف نہ ہو، اس نے بوقاف کا انسانی نام کاشف رکھا تھا۔ دوسروں کے سامنے وہ بوقاف کو اسی نام سے پکارتا تھا۔ ابھی تک بوقاف نے ہوٹل سے کہیں اور جانے کی فرمائش نہیں کی تھی، بس مست لوگوں کی طرح ''تندور کا کیڑا'' بن کر رہ گیا تھا۔ شبن کو اور کیا چاہیے تھا......؟ ''چپڑی وہ بھی دو دو۔'' مل رہی تھی۔

اس دن شام کا وقت تھا۔ ہوٹل میں میزیں بھی زیادہ بھری ہوئی نہیں تھیں۔ کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا شبن، بڑے مستی بھرے انداز میں جھوم رہا تھا۔ کیونکہ ٹیپ ریکارڈر پر ایک کلاسک گانا بج رہا تھا۔

چلتے چلتے یونہی کوئی مل گیا تھا

اس کی آنکھیں بند تھیں، سر بھی ہل رہا تھا اور ٹانگیں بھی، نہ جانے کون سی دنیا میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک ہی ''دھاڑ'' کر کے کسی نے کاؤنٹر پر مکا مارا۔

شبن نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ کیا دیکھتا ہے کہ سامنے دو بدمعاش ٹائپ کے غنڈہ نما آدمی کھڑے ہیں اور خون خوار نظروں سے اسے دیکھ رہے ہیں۔ شبن کی ہوا کھسک گئی۔ فوراً سیدھا ہوا اور ٹیپ کی آواز ہلکی کر دی۔

’’جج...... جی...... فرمایئے......؟ کیا آپ بھتہ لینے آئے ہیں؟‘‘ شبن نے پوچھا۔

’’نہیں......‘‘ ایک نے سپاٹ لہجے میں مختصر سا جواب دیا۔

’’تت...... تو پھر...... کک...... کیا ڈکیتی مارنے آئے ہیں؟‘‘ شبن کی آواز میں خوف شامل ہو گیا۔

’’نہیں......‘‘ وہی شخص پھر بولا۔

’’تو پھر...... کیا ہوٹل پر قبضہ کرنے آئے ہیں؟‘‘ شبن کی آواز میں خوف اور بھی بڑھ گیا۔

’’نہیں......‘‘ اسی شخص کا جواب تھا۔

دوسرا اب تک خاموش رہ کر شبن کو گھور رہا تھا۔

’’تت...... تو کیا...... تو کیا آپ دونوں نے میرے اکلوتے بچے کو اغوا کر لیا ہے اور اب تاوان لینے آئے ہیں؟‘‘ شبن کی آنکھیں پھٹ پڑیں، اور بھی برا حال ہو گیا تھا اس کا......

’’نہیں......‘‘ پھر وہی جواب ملا۔

’’تت...... تو...... کیا...... آپ...... مجھے قتل کرنے آئے ہیں؟‘‘ اب کی بار شبن کی ٹانگیں کپکپانے لگیں اور چہرے کی ہوائیاں اڑ گئیں۔

دفعتاً دوسرے شخص نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پچاس روپے کا نوٹ نکال کر بے حال ہوتے ہوئے شبن کی طرف بڑھا دیا اور بولا۔

’’بھائی صاحب......! ذرا پچاس روپے کا کھلا دے دو، ترکاری والے کے پاس کھلا ہی نہیں ہے، ہم تو ٹنڈے لینے نکلے تھے۔‘‘

یہ سن کر شبن کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ خواہ مخواہ اپنا خون خشک کرتا رہا تھا۔ اس نے جلدی سے خود کو سنبھالا اور منہ بنا کر کرخت آواز میں بولا۔

’’جاؤ...... بھائی...... جاؤ۔ کوئی کھلا والا نہیں ہے۔ ہاں...... چلے آتے ہیں منہ اٹھا کر کھلا مانگنے کے لئے۔ چلو...... آگے بڑھو۔‘‘

دونوں آدمی مایوس ہو کر چلے گئے۔ شبن نے جلدی سے ٹیپ ریکارڈر کا والیم بڑھایا اور دوبارہ جھومنے لگا۔

☆......☆......☆

گاگے شاہ، برکت صاحب اور گل بانو ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ مہ پارہ اس وقت باورچی خانے میں چائے تیار کر رہی تھی۔ بوقاف کے واقعے کو ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ گاگے شاہ اپنے گاؤں سے دوبارہ واپس آئے تھے۔

ان کی واپسی کی وجہ تھیں گل بانو، جنہوں نے بوقاف سے نکاح کے سلسلے میں اودھم دھاڑ مچایا ہوا تھا۔

برکت صاحب نے انہیں لاکھ سمجھایا، لیکن گل بانو کی کھوپڑی میں کوئی بات نہ اتر سکی، ویسے بھی شوہر کی بات بیوی کی سمجھ میں آتی کب ہے......؟

خیر...... تو پھر تنگ آ کر برکت صاحب نے گاگے شاہ کو زحمت دینے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ گاگے شاہ کافی دیر سے انہیں ’’دوپٹے کی آڑ‘‘ میں

سے سمجھا رہے تھے۔ ایک آدھ بار انہوں نے ''دوپٹے کے پار'' جھانکنے کی ناکام کوشش بھی کی تھی۔

''وہ سب تو صحیح ہے شاہ صاحب!'' گل بانو کہہ رہی تھیں۔ ''لیکن اگر سردار اپنے وعدے سے پھر گیا تو......؟''

''وہ جنوں کا سردار ہے، انسانوں کا نہیں کہ اپنے وعدے سے پھر جائے گا۔'' گاگے شاہ نے دلیل پیش کر دی۔

گل بانو نے سمجھ جانے والے انداز میں گردن ہلا دی۔ ''شاہ صاحب!'' برکت صاحب بھی بولے۔ ''یہ بتائیں کہ نکاح ہوگا کب اور کس دن ہوگا؟''

''یہ ارینجمنٹ تو سردار ہی کی طرف سے ہوگی۔'' انہوں نے بتایا۔ ''کیونکہ اب سارا سیٹ اپ ان ہی کا ہے۔ تم بے فکر رہو...... جیسے ہی سردار کی طرف سے اشارہ ہوا، میں آپ لوگوں کو مطلع کر دوں گا۔ فکر نہ کریں۔''

''فکر تو ہوگی شاہ صاحب...... نہ جانے کیا ہو......؟'' گل بانو کی آواز سے پریشانی جھلک رہی تھی۔

''پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ میں ہوں نا......'' گاگے شاہ نے تسلی دی۔

''آپ نے دیکھی ہے......؟'' گل بانو نے جھٹ سے پوچھا۔

''کیا......؟'' گاگے شاہ چونکے۔ ''پریشانی......؟''

''نہیں۔ میں ہوں نا......'' وہ شرما کر بولیں۔ ''کیا فلم ہے...... سچ......!''

''واقعی...... بہت اچھی فلم ہے۔'' گاگے شاہ نے تائید کی۔

''خاک اچھی ہے۔'' برکت صاحب نے منہ بنایا۔ ''فلمیں تو بس جب تک اچھی تھیں کہ جب تک رنگین نہیں ہوئی تھیں۔ بلیک اینڈ وائٹ فلموں میں تہذیب تھی، تمدن تھا، اخلاق تھا اور وہ سبق آموز ہوتی تھیں۔ ان فلموں میں جو عشق ہوتا تھا، وہ واقعی عشق تھا۔ اور اب......''

''تم نے بالکل ٹھیک کہا برکت۔'' گاگے شاہ نے سر ہلایا۔ ''لیکن...... ہر چیز کا اپنا ایک دور ہوتا ہے۔ وہ دور چلا گیا۔ اب یہ ایک نیا دور ہے، اس کی ہر چیز نئی ہے۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ اخلاق، محبت اور تہذیب، یہ سب پرانی چیزیں تھیں۔'' برکت صاحب حیرت سے بولے۔ ''اور نئے دور میں ان کی کوئی گنجائش نہیں ہے؟''

''شاید......'' گاگے شاہ نے کندھے اچکائے۔

''پہلے کے لوگ ایک دوسرے سے محبت رکھتے تھے، ان میں خلوص تھا، ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا تھا، اس لئے ان کا وقت بھی اچھا گزرتا تھا۔ مجھے حیرت ہے کہ آج کل کے لوگ اپنے اپنے گھروں میں مقید رہ کر ایک دوسرے سے بے تعلق ہو چکے ہیں، تو پھر ان لوگوں کا وقت آخر کیسے گزرتا ہوگا......؟'' برکت صاحب نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

''وقت بھی اب پہلے جیسا کہاں رہا......!'' گاگے شاہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''وہ بھی ہماری زندگیوں کی طرح مختصر سا ہو کر رہ گیا ہے۔

ادھر سورج نکلا، ادھر صبح گئی اور پھر شام آئی اور پلک جھپکتے رات ہوگئی۔ گویا وقت نے بھی ہمارے معمولات سے مایوس ہو کر منہ موڑ لیا ہے۔“

”واقعی......ادھر اتوار گزرتا ہے کہ دوسرا اتوار سر پر آ کھڑا ہوتا ہے۔“ گل بانو بھی بول اٹھیں۔

”ہم......ہم نہیں رہے، تو پھر......وقت کیوں وقت رہے گا؟“ کاگے شاہ کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ تھی۔ چند لمحے خاموشی میں ہی گزر گئے۔ تینوں اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔ اچانک گل بانو کسی خیال کے تحت چونک اٹھیں۔

”ارے......مگر......یہ مؤا بوقاف آخر ہے کہاں؟“

☆......☆......☆

”میں یہاں ہوں......“ وہ چلا کر بولا اور دھم سے جامن کے درخت پر سے چھلانگ لگا دی۔ ”ابھی آیا......!“

پھر وہ فوراً ہی اٹھ کر دروازے کی طرف دوڑا اور جھٹ سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے موجود شخصیت کو دیکھ کر اس کی باچھیں نہ جانے کیوں کھل اٹھیں۔

”ارے......حکیم صاحب......آپ......!“ اس کے منہ سے نکلا۔

”ہاں......میں......“ حکیم طولانی نے سر ہلایا۔ پھر اسے گھورا۔ ”تم تھے کہاں؟ کتنی دیر سے دروازہ پیٹ رہا ہوں......“

”جامن کے درخت پر چڑھا ہوا تھا۔“ اس نے غم زدہ لہجے میں کہا۔ چہرے پر بھی دردناک قسم کی علامتیں ظاہر ہوگئی تھیں۔

”کیوں......؟“ وہ چونکے۔ ”یہ جامن کا موسم تو نہیں ہے۔ پھر تم وہاں کیا کر رہے تھے شرفو میاں......؟“

”اپنے آپ کو ہلکا کر رہا تھا حکیم صاحب......!“ شرفو سبزی والے کا وہی لہجہ تھا۔

”اتنے اوپر سے......؟“ حکیم صاحب نے چونک کر پوچھا۔

”مم......میرا مطلب ہے کہ......“ وہ گڑبڑا گیا۔ پھر دوبارہ رونی صورت بنا کر بولا۔ ”اپنا دھیان بٹا رہا تھا حکیم صاحب......آپ اس وقت مسیحا بن کر آئے ہیں......اف......“

”میں دراصل اس لئے آیا ہوں کہ تمہیں اپنی ایک تازہ......“ حکیم صاحب نے بولنا چاہا۔

”ارے آپ اندر تو آئیں...... یہاں کھڑے کھڑے کیا......آئیں......“ شرفو نے ان کی بات کاٹی۔ پھر وہ انہیں اندر ایک کمرے میں لے آیا۔ حکیم صاحب سلیم دودھ والے کو اپنی غزل نہ سنا سکے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس وقت شرفو کے پاس دکھائی دے رہے تھے۔

سلیم دودھ والے کی دکان سے نکل کر پہلے تو انہوں نے متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھا تھا اور پھر جب انہیں کوئی بھی دکھائی نہ دیا تو ان کے ذہن میں شرفو سبزی والا اچھل کود کرنے لگا۔ انہوں نے فوراً ہی اپنی غزل کے سلسلے میں اس کے گھر کا رخ کیا تھا، تاکہ جلدی سے اسے ہی اپنی غزل سنا سکیں۔ آرام سے بیٹھنے کے بعد انہوں نے منہ کھولا۔

”میں تمہیں اپنی......“

''کیا بتاؤں حکیم صاحب......'' شرفو نے ان کی بات کاٹی۔ ''کوئی ایک پریشانی ہو تو بتاؤں......آہ......موت بھی تو نہیں آتی۔''

''اس کی تم فکر نہ کرو۔'' حکیم صاحب نے اسے تسلی دی۔ ''ایسا زہر دوں گا کہ آدھے منٹ میں ہی جہان فانی سے کوچ کر جاؤ گے۔ بس......تم میری تازہ......''

''مر کے بھی سکون نہیں ملے گا حکیم صاحب......'' اس نے پُرسوز انداز میں ان کی بات کاٹی۔ ''میں کیا کیا بتاؤں......؟ کوئی ایک پریشانی ہو تو بتاؤں......!''

''ساری پریشانیاں بتا دینا۔'' حکیم صاحب مچلے۔ ''بس تم میری تازہ......''

''ہائے......ہائے......'' شرفو نے پھر ان کی بات کاٹی۔ ''اتنے زیادہ غم تو کسی کو بھی نہ ملے ہوں گے حکیم صاحب......!''

''نہیں ملے ہوں گے۔ واقعی نہیں ملے ہوں گے۔'' حکیم صاحب نے تائید کی۔ ''تم میری تازہ......''

''پہلے مجھے کاروبار میں نقصان ہوا......ہائے......'' اس نے کراہتے ہوئے کہا۔

''اچھا......اچھا۔'' حکیم صاحب نے جلدی سے سر ہلایا۔ ''تم میری تازہ غزل تو......''

''پھر میں مارکیٹ کا قرض دار ہوا......'' اس نے پھر ان کی بات کاٹی۔

''ہو گئے ہو گے......ہو گئے ہو گے۔'' حکیم صاحب نے تائید کی، پھر فوراً ہی بول پڑے۔ ''لیکن تم پہلے میری تازہ غزل......''

''منے کو بخار ہو گیا......''

''تم......میری تازہ غزل......''

''منی کو کھانسی ہو گئی......''

''تم میری تازہ غزل تو......''

''مکان کا کرایہ چڑھ گیا......''

''تم میری تازہ غزل تو سن......''

''اور اب......'' شرفو نے پھر ان کی سنی ان سنی کی اور باقاعدہ دھاڑیں مار کر روتے ہوئے بولا۔ ''اور اب......حکیم صاحب......میری بیوی......مجھے چھوڑ کر اپنے میکے چلی گئی ہے۔ ہائے......''

یہ کہہ کر شرفو اٹھا اور دیوانہ وار حکیم صاحب سے لپٹ کر رونے لگا۔ حکیم صاحب اس افتاد گراں پر ہکا بکا رہ گئے۔

☆......☆......☆

یہ بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ چچا تندوری کا ذریعۂ معاش کیا تھا......!

قصہ نورس سے متصل کھلے میدان سے آگے گھنا جنگل تھا۔ چچا تندوری اس جنگل سے مختلف اقسام کی جڑی بوٹیاں اکٹھی کرتے تھے اور

انہیں لے جا کر شہر میں بیچ دیتے تھے۔ بعض اوقات وہ حکیم طولانی سے بھی ان جڑی بوٹیوں کا سودا کر لیا کرتے تھے۔

چچا تندوری کے اس وقت وارے نیارے ہوتے تھے۔ جب کوئی نایاب قسم کی جڑی بوٹی ان کے ہاتھ لگتی تھی۔ کیونکہ پھر انہیں منہ مانگے پیسے ملا کرتے تھے۔

اس وقت بھی وہ اپنے ذریعۂ معاش کے سلسلے میں اسی جنگل میں ادھر ادھر بھٹک رہے تھے۔ آج وہ کافی دور بھی نکل آئے تھے۔ ان کا مخصوص تھیلا ان کے ہاتھ میں تھا۔

وہ ایک گھنے درخت کے نیچے سے گزر رہے تھے کہ اچانک ہی کسی نے درخت پر سے چھلانگ لگائی اور ان کے مقابل آ کھڑا ہوا۔ یہ ایک نورانی صورت والے بزرگ تھے، جن کے چہرے پر داڑھی بھی تھی۔ ان کے کپڑے بے داغ سفید رنگ کے تھے۔ کوئی اور ہوتا تو شاید گھبرا ضرور جاتا، لیکن وہ چچا تندوری تھے، انہوں نے منہ ٹیڑھا کر کے سوالیہ نظروں سے بزرگ کی طرف دیکھا۔

’’پریشان مت ہو بچہ......! ہم تیری مدد کے لئے آئے ہیں۔‘‘ بزرگ نے باوقار انداز سے انہیں مخاطب کیا۔

’’میں کوئی پریشان وریشان نہیں ہوں۔‘‘ چچا تندوری نے برا سا منہ بنایا۔ ’’تم ہو کون......؟ اپنا لہجہ ذرا درست کرو...... میں تمہیں بچہ نظر آ رہا ہوں......؟‘‘

’’بہت بھاری ہو......!‘‘ بزرگ بالکل دھیرے سے بڑبڑائے۔

’’کیا کہہ رہے ہو......؟‘‘ چچا سن نہ سکے تھے۔

’’کچھ نہیں......‘‘ بزرگ نے سر ہلایا۔ ’’میں چچا بول رہا تھا، منہ سے بچہ نکل گیا۔ عادت ہے نا...... اس لئے......‘‘

’’بہت گندی عادت ہے۔‘‘ چچا کا جواب تھا۔ پھر وہ چونکے۔ ’’ارے...... تم تو میرا نام بھی جانتے ہو...... تم آخر ہو کون......؟‘‘

’’جہاں جن اور آسیب ہوں، وہاں میں ضرور ہوتا ہوں۔ اپنے متعلق بس اتنا ہی بتاؤں گا۔‘‘ بزرگ نے جواب دیا۔

’’اوئے...... ذرا زبان سنبھال کے......‘‘ چچا تندوری کے تیور بدلے۔ ’’میں تمہیں جن اور آسیب نظر آتا ہوں...... ہیں......؟‘‘

’’ان سے بھی بڑھ کر۔‘‘ بزرگ نے آہستہ سے کہا اور پھر بلند آواز سے بولے۔ ’’تم نے ہماری بات کا غلط مطلب نکالا ہے۔ چھوڑو...... تم نہیں سمجھو گے۔ تم میرا حلیہ نہیں دیکھ رہے ہو......؟ میں بزرگ ہوں۔‘‘

’’مجھے تو تم مشکل سے چوسنا آم لگ رہے ہو۔‘‘ چچا طنزیہ انداز میں مسکرائے۔ ’’درخت پر سے کسی سڑے ہوئے پھل کی طرح تو گرے ہو تم...... ہونہہ۔‘‘

یہ سن کر بزرگ کو غصہ آ گیا۔ ’’گستاخ...... بے ادب......! ہم تجھے راکھ کر دیں گے...... بھسم کر دیں گے۔‘‘

’’ابے او...... ماچس کی تیلی......! ہلکا ہو...... ہلکا ہاں۔‘‘ چچا اپنی مخصوص بولی پر اُتر آئے۔

بزرگ نے جھنجھلا کر اپنے پاؤں پٹخے۔ ’’کیا ہوا......؟‘‘ چچا تندوری نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ ’’کیا چیونٹیاں چڑھ گئیں......؟‘‘

”اوہ……او……“ بزرگ دانت پیس کر غرائے۔ ”اگر مجھے تمہاری مدد کے لئے نہیں بھیجا گیا ہوتا تو……تمہیں ابھی مزہ چکھا دیتا۔“

”کس نے بھیجا ہے……؟“ چچا نے چونک کر پوچھا۔

”دس از ٹاپ سیکرٹ……“ بزرگ نے اکڑ کر کہا۔

”کیا تم فرنگیوں کے ایجنٹ ہو……؟“ چچا نے محتاط انداز سے پوچھا۔

”یا خدا……“ بزرگ نے رو دینے والے انداز میں آسمان کی طرف دیکھا۔ ”مجھے اس تندور سے نجات دلا۔“

”روٹیاں بھی لگاتے ہو……؟“ چچا تندوری کا سوال تھا۔

”نہیں……!“ بزرگ زور سے چلائے۔ ”نہیں……نہیں……نہیں……“

”یہ کوئی نیا گانا ہے کیا……؟“ چچا تندوری کے لہجے میں حیرت تھی۔

”ارے میرے باپ……!“ بزرگ نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”میں یہ ٹھیکا ہی چھوڑ دوں گا۔ میرے دادا……پردادا کی بھی توبہ، جواب میں نے کسی کی مدد کی……اب تم ذرا غور سے سنو……! تم بانگ دینے والے مرغوں سے پریشان ہونا……؟“

”تمہیں کیسے معلوم……؟“ وہ اچھل پڑے۔

”ابے……جو پوچھ رہا ہوں……وہ بتا……“ بزرگ تنک کر بولے۔

”ذرا……تمیز سے بات کرو……ہاں……“ چچا تندوری ہتھے سے اکھڑ گئے۔

”اچھا بھائی جان معاف کر دیجئے……اب بتائیے……آپ ان سے پریشان ہیں کہ نہیں؟“ بزرگ نے مجبوراً اپنا لہجہ بدلا۔

چچا تندوری نے فوراً جواب نہیں دیا تھا۔ پہلے ادھر ادھر دیکھا اور پھر بزرگ کے کان میں سرگوشی کی۔

”ہاں یار……پریشان تو ہوں۔“

”ہاہاہا……“ بزرگ نے ایک بلند و بانگ قہقہہ لگایا۔ ”بس……اب تمہیں پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔“

”کیوں……؟ کیا مرغوں کی نسل ختم ہو رہی ہے؟“ چچا کے لہجے میں مسرت تھی۔

”یہی سمجھ لو……“ بزرگ لاپروائی سے بولے۔

”کیا واقعی……؟“

”ہاں بھئی……اس مرغی کا پتا لگ گیا ہے جو ایسے انڈے دے رہی ہے کہ ان انڈوں سے صرف بانگ دینے والے مرغے ہی پیدا ہو رہے ہیں اور پھر وہ مرغے چاروں طرف پھیل جاتے ہیں، اسی لئے تمہیں ہر ایک کے پیچھے بھاگنا پڑتا ہے۔“ بزرگ نے بتایا۔

”کہاں ہے وہ مرغی……؟“ چچا تندوری بے تاب ہو گئے۔

”اسی جنگل میں ہے، لیکن اسے صرف ایک ہی بندہ پکڑ سکتا ہے۔ یہ تمہارے اور میرے بس کی بات نہیں ہے۔“

’’کون ہے وہ بندہ......؟‘‘ چچا تندوری کی بے چینی عروج پر تھی۔

’’وہ آدھا انسان ہے اور آدھا جن ہے۔ اسے کاشف کہتے ہیں لیکن اس کا اصل نام بوقاف ہے۔‘‘ بزرگ نے بتایا۔

’’بوقاف......؟‘‘ چچا تندوری چونکے۔ ’’یہ نام تو سنا سنا سا ہے۔ کون ہے یہ بوقاف...... کہاں رہتا ہے......؟‘‘

’’شبن خیراتی کے ہوٹل میں تندور پہ کام کرتا ہے۔ اسی کو معلوم ہے کہ وہ مرغی جنگل میں کس جگہ ہے اور وہی اس کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ تمہیں اس کے پاس جانا پڑے گا۔‘‘ بزرگ نے کہا۔

’’جاؤں گا...... ضرور جاؤں گا......‘‘ چچا تندوری نے جلدی سے گردن ہلائی۔

’’اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے...... اور ہاں...... وہ آسانی سے اس مرغی کے متعلق نہیں بتائے گا...... تم نے اس کی ٹھیک ٹھاک چمپا پلیٹ کرنی ہوگی...... اس کے بغیر وہ تمہارے ساتھ جنگل میں آنے کے لئے آمادہ نہیں ہوگا۔‘‘

’’فکر ہی مت کر بڈھے...... اس کی تو میں......‘‘ چچا نے جوش میں آ کر ایک والدہ سوز گالی دی۔

’’بہت بدتمیز ہو......‘‘ بزرگ نے سڑا سا منہ بنایا۔ ’’اور تم نے ہماری شان میں بھی گستاخی کر دی...... بڈھا کہہ دیا ہمیں......!‘‘

’’اماں تو کیا...... تمہیں گبرو جوان کہوں......؟‘‘ چچا تندوری نے انہیں آنکھیں دکھائیں۔

’’لاحول ولا......‘‘ بزرگ کے منہ سے نکلا۔

دوسرے ہی لمحے وہ غائب ہو گئے۔ اب وہاں صرف چچا تندوری کھڑے ہوئے آنکھیں پٹ پٹا رہے تھے۔

☆......☆......☆

حاصل

حاصل آپ کی پسندیدہ مصنفہ عمیرہ احمد کے حساس قلم کی تخلیق ہے۔ یہ ناول عمیرہ احمد کے ابتدائی دور کی یادگار تحریر ہے۔ بعد میں انہوں نے اسی طرز پر اپنا ایک اور ناول ’’لاحاصل‘‘ بھی تحریر کیا تھا جو کہ بہت پسند کیا گیا۔ حاصل کہانی ہے ایک نوجوان کی جو سچے مذہب اور ذہنی سکون کی تلاش میں ہے اور اپنی اس تلاش میں وہ مسلمان سے عیسائی مذہب اختیار کرنا چاہتا ہے اور یہ کہانی ہے ایک نوجوان لڑکی جسے متلاشی ہے آفاقی مذہب کی اور دلی سکون کی اور اُس کی یہ تلاش اُسے عیسائیت سے متنفر کر کے اسلام کی راہ پر لے آتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ عمیرہ احمد کے مداح اس ناول کو پسند کریں گے۔ ’’حاصل‘‘ کتاب گھر پر دستیاب ہے جسے **ناول** سیکشن کے معاشرتی رومانی ناول میں دیکھا جا سکتا ہے۔

حکیم طولانی کو اب چکر آنے لگے تھے۔ ان کی غزل گیس کی طرح کبھی ان کے پیٹ میں درد کرتی اور کبھی کھوپڑی میں چڑھ جاتی۔ اس کے باہر نکلنے کا فی الوقت کوئی راستہ نہیں تھا۔ کیونکہ...... وہ شرفو سبزی والے کو بھی اپنی غزل سنانے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔

بے نیل و مرام، وہ اس کے گھر سے بھی اس طرح نکلے کہ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو شرفو سے چھڑوایا تھا، ورنہ وہ تو ان سے چمٹ چمٹ کر رو رہا تھا۔

تھکے تھکے قدموں سے وہ آگے بڑھے۔ سوچ رہے تھے کہ اب کہاں جائیں......؟ کسے اپنی غزل سنائیں......؟

عین اسی وقت گلی میں سامنے سے ایک شخص آتا ہوا دکھائی دیا۔ حکیم صاحب کو نہ جانے کیا سوجھی کہ جب وہ ان کے قریب سے گزرا تو انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

وہ شخص چونکا، حکیم صاحب جلدی سے بولے۔

''میری ایک غزل سنو گے......؟''

جواباً وہ شخص خاموش رہا۔ البتہ اس نے اپنے چہرے سے حیرت ضرور ظاہر کی تھی۔

حکیم صاحب کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ وہ جوش میں بھر گئے۔ دل خوشی کے مارے بلیوں اچھلنے لگا اور انہوں نے جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈال کر غزل کا پرچہ نکال لیا۔

وہ آدمی اب بھی چپ چاپ کھڑا ہو کر ان کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ حکیم طولانی نے آؤ دیکھا اور نہ تاؤ...... فوراً ہی اپنی غزل شروع کی اور پوری کی پوری سنا ڈالی۔

غزل ختم کر کے انہوں نے اس شخص کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھا۔ ''کیسی لگی میری غزل......؟'' ان کے الفاظ تھے۔

اس آدمی نے سر سے پاؤں تک حکیم طولانی کا جائزہ لیا اور پھر ایک طویل سانس لے کر اس نے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکالا اور حکیم طولانی کی طرف بڑھا دیا۔

حکیم صاحب نے کارڈ پر نظر ڈالی، لکھا تھا۔

''میں گونگا اور بہرہ ہوں، برائے مہربانی مجھے تنگ نہ کریں۔''

یہ پڑھ کر حکیم طولانی کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ دل میں ایک شدید قسم کی بے ہودہ سی خواہش نے سر ابھارا (یعنی کپڑے پھاڑیں اور جنگل کا رخ کریں)، بے بسی کے جراثیم پوری طرح ان پر حملہ آور ہو گئے، شرمندگی نے ان کے کان میں سرگوشی کی۔

''ابے...... زمین کھودو اور اس میں سما جا......''

غرض یہ کہ حکیم طولانی کا اس وقت وہ حال تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ وہ گم صم ہو کر اس شخص کی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھ گئے، البتہ وہ اس کا کارڈ واپس کرنا نہیں بھولے تھے۔

اب ان کا دل بھر آیا تھا۔ جیسے جیسے وہ قدم اٹھا رہے تھے، ان کا دل بھاری ہوتا جا رہا تھا۔ صرف ایک غزل اور......!

بھری دنیا میں کیا کوئی بھی ایسا نہیں تھا، جو ان کی غزل سن لیتا......! کوئی بھی نہیں......؟

وہ ان ہی سوچوں میں غلطاں...... خراماں خراماں چلے جا رہے تھے کہ اچانک ہی کوئی ان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

حکیم طولانی نے چونک کر اپنے قدم روکے اور سر اٹھا کر دیکھا۔ ان کے سامنے ایک نورانی شکل وصورت والے بزرگ کھڑے تھے۔ ان کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی۔

☆......☆......☆

انسان بننے کے بعد، کچھ دن تک تو واقعی بوقاف ذہنی طور پر مفلوج ہی رہا تھا۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ اس میں احساسات جاگنے لگے۔ سب سے پہلے جو بات اس نے محسوس کی، وہ یہ تھی کہ وہ تندور پر روٹیاں لگا رہا تھا۔

یہ بھی بھلا کوئی تک تھی......؟ کہاں کا انصاف تھا کہ کئی خوبصورت اور جوان لڑکیوں پر اپنی دھاک بٹھانے والا جن، ایک معمولی سے آدمی کی طرح روٹیاں لگائے......

یہ خیال آتے ہی وہ پیچ وتاب کھانے لگا۔ دل ہی دل میں غصہ امنڈنے لگا۔ وہ اس وقت بھی تندور کے لئے آٹا گوندھ رہا تھا۔ دل چاہا کہ ابھی ابھی کاؤنٹر پر جائے اور موٹے شبن خیراتی کا گلا گھونٹ کر اسے مار ڈالے اور پھر موٹے کے نام کی لاج رکھنے کے لئے اس کے مردہ جسم کا ہر حصہ بلیوں اور کتوں کو خیرات کر دے۔

لیکن پھر بوقاف کو یہ بھی خیال آیا کہ شبن نے اپنے طور پر اس کی مدد ہی کی ہے۔ بوقاف کے پاس سر چھپانے کا ٹھکانہ بھی تھا اور کھانے کے لئے روٹی بھی......

نہ جانے وہ خود کہاں ہے......؟ سردار نے اسے کہاں لا پھینکا ہے......؟ جس کی بدولت وہ اس حال کو پہنچا تھا وہ خود کہاں تھی؟ آہ...... مہ پارہ......؟ کہاں تھی وہ......؟

اس کا خیال آتے ہی بوقاف کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھنے لگی اور اس سے ملنے کی شدید خواہش نے اسے آ گھیرا۔

اس تندور سے نکلنے کے بعد ہی مہ پارہ کو ڈھونڈا جا سکتا تھا۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ اسے تو ابھی یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ خود کہاں ہے۔ بہر حال اب وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اس ہوٹل میں نہیں رہے گا۔ یہاں سے نکل بھاگنے کے بجائے شبن خیراتی کو باقاعدہ بتا کر یہاں سے رخصت ہوگا۔

دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر کے وہ مطمئن سا ہو گیا۔ اب وہ کافی تندہی سے پیڑے بنانے لگا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ گنگنا بھی رہا تھا۔

دل میں چھپا کے پیار کا طوفان لے چلے
ہم آج اپنی موت کا سامان لے چلے

☆......☆......☆

”کون ہیں بھئی آپ......“ حکیم طولانی نے تعجب سے پوچھا۔ ”تم بہت پریشان ہونا......؟ ہم تمہاری پریشانی کا حل نکالنے آئے ہیں۔“ بزرگ نے پُر وقار انداز سے کہا۔

”اوہ......اوہ......کیا واقعی......؟“ حکیم طولانی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

”ہاں بھئی......“ بزرگ نے مسکرا کر کہا۔ ”پریشان حال لوگوں کی مدد کرنا ہی ہماری ڈیوٹی ہے۔“

”اوہ......آپ تو پہنچے ہوئے بزرگ لگ رہے ہیں۔ آپ کو تو سب کچھ معلوم ہوگا۔“ حکیم طولانی نے مکھن رسید کیا۔

”ارے نہیں......میں کیا ہوں......“ بزرگ شرما گئے۔

”ارے......آپ تو اہل نظر ہیں......مثل ثمر ہیں......“ حکیم طولانی بولے۔

”ہی ہی......“ بزرگ بل کھانے لگے۔

”آپ غنچہ دہن ہیں......سیمیں بدن ہیں......جان من ہیں۔“ حکیم طولانی کا مکھن سے بھرا تعریف کا دریا رواں دواں تھا۔

”ابے بس کر......“ بزرگ نے تنگ آ کر ہاتھ اٹھایا۔ ”نہ تو سلیم رضا ہے اور نہ میں ریڈیو پاکستان ہوں۔“

”اچھا تو پھر......“ حکیم طولانی نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ”نکالوں اپنی غزل......؟ آپ سنیں گے......؟“

”نہیں......نہیں......“ بزرگ نے بے ساختہ ان کا ہاتھ روکا۔ ”یہ کیا غضب کر رہے ہو؟“

”کیوں......؟“ حکیم طولانی مجسم سوال بن گئے۔

”میں تمہیں پاگل نظر آتا ہوں، جو تمہاری غزل سنوں گا......؟“ بزرگ نے انہیں گھورا۔

”تت......تو......آپ بھی میری غزل نہیں سنیں گے......؟“ حکیم طولانی کا چہرہ مرجھا گیا۔

”مجھے روحانی طاقت ملی ہے۔“ بزرگ نے اطلاع دی۔ ”سر کھپانے کی طاقت مجھ میں ہرگز نہیں ہے۔ ویسے بھی میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں۔“

”پھر آپ میری کیا مدد کریں گے؟“ حکیم طولانی کا لہجہ مایوسانہ تھا۔

”تمہیں زندہ زمین میں گاڑ دوں گا۔“ بزرگ جھنجھلا گئے۔ پھر لہجہ نرم کرتے ہوئے بولے۔ ”اے محترم شاعر......! ہم تمہیں یہ بتانے کے لئے نازل ہوئے ہیں کہ ایک ہی شخص ہے، جو تمہاری غزل سن سکتا ہے۔ بلکہ غزل کیا، تم اسے اپنا پورا دیوان سنا سکتے ہو۔ ہاں......“

”کون ہے وہ احمق......مم......میرا مطلب ہے کہ کون ہے وہ شخص......؟“ حکیم طولانی نے جلدی سے پوچھا۔

”اس کا نام بوقاف ہے۔“ بزرگ نے بتایا۔

”بوقاف......“ حکیم طولانی سوچ میں ڈوب گئے۔ ”یہ نام انسانوں والا تو ہرگز نہیں لگتا۔“

”ٹھیک کہتے ہو۔“ بزرگ نے سر ہلایا۔ ”میں نے ایک بکرا پالا ہے، اسی کا نام بوقاف ہے۔ ارے احمق......! جو کہہ رہا ہوں......چپ

چاپ سن...... زیادہ ٹیں ٹیں مت کر۔"

"اچھا جناب...... اچھا۔" حکیم طولانی دبک گئے۔

"ہاں...... یہ ہوئی نا بات...... بوقاف کوئی بھی ہو...... اس بات سے تمہیں کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے۔ بس...... اتنا جان لو کہ ایک وہی تمہاری غزل سن سکتا ہے اور کسی میں اتنی ہمت نہیں ہے۔" بزرگ نے کہا۔

"یہ بات تو واقعی صحیح ہے۔" حکیم طولانی کا سینہ پھول گیا۔ بزرگ نے ان کے کلام کی تعریف جو کی تھی۔

"زیادہ اکڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔" بزرگ نے ان کی کیفیت بھانپتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔ "میرا مطلب تھا کہ تمہاری فضول قسم کی بکواس سنے گا بھی کون......؟ آج کل کس کے پاس ٹائم ہے......؟"

بزرگ کے اس ریمارک سے حکیم طولانی کا پھولا ہوا سینہ صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ پھر انہوں نے منہ بسورتے ہوئے مری مری سی آواز میں پوچھا۔ "اچھا...... تو اب آپ یہیں بتا دیں کہ وہ...... بوقاف کہاں ملے گا؟"

☆......☆......☆

سلیم نے نہ صرف یہ کہ "پراسرار بزرگ" کی "فرمائی" ہوئی باتوں کو گرہ سے باندھ لیا تھا۔ بلکہ وہ کافی دن تک تو اس سوچ میں گم رہا کہ اسے مہ پارہ کے گھر کے سامنے جو ڈرامہ کرنا ہے، وہ خود یہ سب کر بھی سکے گا یا نہیں......!

چنانچہ کافی سوچ بچار کے بعد اس نے یہ فیصلہ کیا کہ قبل از وقت اس عمل کی ریہرسل کی جائے۔ چنانچہ ایک دن اس نے اپنی دکان کی چھٹی کی اور طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں بند ہو گیا۔

پہلے تو اس نے کمرے میں ٹہل لگائی، آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور پھر زوردار آواز سے کھنکھارتے ہوئے گلا صاف کیا۔ اب وہ پوری طرح بلند آواز سے چیخنے کے موشن میں آ چکا تھا۔ پھر اس نے کیا بھی یہی، وہ چیخ کر بولا۔

"مہ پارہ......! اگر تمہاری شادی ہو گئی، تو میں خودکشی کر لوں گا...... ہاں...... خودکشی کر لوں گا۔" یہ جملہ پورا ہوا ہی تھا کہ کسی نے کمرے کا دروازہ پیٹ ڈالا۔ وہ چونک کر دروازے کی طرف بڑھا۔

اس نے دروازہ کھولا تو سامنے اس کی والدہ کھڑی تھیں۔ ان کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔

"کیا ہوا ہے......؟" بیگم اشرف نے اسے گھورا۔

"کک...... کچھ نہیں...... امی......" وہ ہکلانے لگا۔

"کچھ تو ہوا ہے...... ابھی ابھی کمرے سے چلانے کی آواز آئی ہے۔ میں باتھ روم جا رہی تھی کہ آواز سن کر ادھر چلی آئی۔ ہٹو...... سامنے سے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے سلیم کو دھکیلا اور اندر گھس آئیں۔ وہ چاروں طرف دیکھ رہی تھیں، جیسے سلیم کے علاوہ بھی کمرے میں کسی اور کی توقع ہو۔

"کون تھا یہاں......!" خالی کمرہ پا کر وہ سلیم کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

’’کوئی بھی نہیں، امی جان...... یہاں تو صرف میں ہوں۔‘‘ سلیم نے بے بسی کا اظہار کیا۔

’’میں کیسے مان لوں......؟ میں نے خود آواز سنی ہے۔ تم کسی سے باتیں کر رہے تھے۔‘‘

’’آپ کو وہم ہوا ہے۔‘‘ سلیم نے آنکھیں چرا کر جواب دیا۔

’’وہم......! اور مجھے......‘‘ انہوں نے حیرت سے دہرایا۔ پھر غور سے سلیم کی طرف دیکھ کر بولیں۔ ’’ٹھیک ہے، مجھے وہم ہوا ہے۔ لیکن پھر تم کیوں نظریں چرا رہے ہو......؟ صاف صاف بتاؤ...... یہاں کون تھا......؟‘‘

’’کوئی بھی نہیں امی جان...... آپ کے سر کی قسم...... نہیں......‘‘ سلیم نے قسم کھالی۔

’’ہوں......‘‘ بیگم اشرف نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ ’’میں یقین کر لیتی ہوں...... اور ہاں...... تمہاری طبیعت خراب ہے نا......؟ لیٹ کر آرام کرو...... سمجھے......!‘‘

’’جی...... جی...... بالکل۔‘‘ اس نے جلدی سے سر ہلایا۔

بیگم اشرف کمرے سے نکل گئیں۔ سلیم نے سکون کی طویل سانس خارج کی اور دروازہ بند کر کے، دروازے سے ہی ٹک گیا۔ ریہرسل کا منصوبہ ناکام ہو چکا تھا۔

☆......☆......☆

تاش کے پتے

جُرم کی بساط پر کھیلی جانے والی خونی بازی...... ایک جنونی قاتل کا قصہ جو دُنیا کے عظیم ترین قاتلوں کے درمیان اپنا نام سرفہرست رکھنا چاہتا تھا۔ تاش کے باون پتے اُس کے مرکز نظر تھے۔ فی قتل ایک پتے کے حساب سے شروع ہونے والا یہ سلسلہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ قانون کے محافظ معمولی سے سراغ کو بھی فراموش نہ کرتے ہوئے قاتل تک پہنچنا چاہتے تھے۔ مگر قاتل کی احتیاط پسندی اور فنکاری محافظوں کی راہ میں حائل تھی۔

سطر سطر سنسنی اور سسپنس پھیلانے والے اس ناول کی دلچسپ ترین بات یہ ہے کہ قاتل آپ کے سامنے ہونے کے باوجود بھی ساتھ پردوں میں پوشیدہ ہے۔

تاش کے پتے ایک سنسنی خیز اور دلچسپ ترین ایڈونچر سے بھرپور ناول ہے جسے کتاب گھر کے **ایکشن ایڈونچر جاسوسی ناول سیکشن** میں پڑھا جا سکتا ہے۔

جنی (بوقاف کی ماں) پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور روناف اسے دلاسہ دے رہا تھا۔

''بھئی...... اب کیا کرتے......؟'' روناف کا لہجہ نرم تھا۔ ''سردار بھی اس وقت وہاں موجود تھے...... بوقاف نے تو حد ہی کر دی تھی۔ نہ اپنی غلطی تسلیم کر رہا تھا اور نہ ہی توبہ کر رہا تھا۔ ٹھیک ہے...... میں سمجھتا ہوں...... تم بہت زیادہ دکھی ہو، لیکن میں بھی کچھ کم دکھی نہیں ہوں۔ میرے پروں پر بھی اس وقت آرے چل رہے ہیں۔''

''میں کہتی ہوں، اسے انسان بنانے کی ضرورت ہی کیا تھی......؟'' جنی نے باقاعدہ ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ''پہلے والے دور کے انسان ہوتے تو میرا دل پھر بھی مطمئن ہو جاتا۔ آج کل کے انسانوں سے واقف ہیں آپ......؟''

''یہ تو ہے......'' روناف نے کان کھجایا۔

''میں تو کہتی ہوں کہ اسے انسان بنانا ہی نہیں چاہئے تھا۔''

''تو پھر...... کیا بناتے......؟'' روناف کے لہجے میں حیرت تھی۔

''کچھ بھی...... گدھا...... گھوڑا، لکڑ بھگا...... اودھ بلاؤ، اور بھی کئی جانور میں نے دیکھے ہیں...... نام نہیں معلوم......''

''کیا کہہ رہی ہو......؟'' روناف نے اسے گھورا۔ ''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟''

''میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں...... اب تو انسانوں نے مہلک قسم کے خون خوار درندوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ کاغذ کے ٹکڑوں کے پیچھے یہ لوگ ایک دوسرے کی جان لے لیتے ہیں۔ گولیاں مار دیتے ہیں۔ بم بلاسٹ کر دیتے ہیں۔ ان کی سیاست بھی صرف ان ہی کاغذ کے چند ٹکڑوں کے لئے ہوتی ہے۔ جبکہ ہم لوگ سیاست میں کتنا تعمیری کام کرتے ہیں۔'' جنی بولتی چلی گئی۔

''آج تمہیں ہو کیا گیا ہے......؟'' روناف اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

''بیٹے کا صدمہ......'' جنی کا مختصر سا جواب تھا۔

روناف تھوڑی دیر تک خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ اب جنی کافی حد تک سنبھل چکی تھی، اور کسی سوچ میں ڈوب گئی تھی۔

''چلو...... اچھا ہے......'' تھوڑی دیر بعد روناف بولا۔ ''اس کی عقل شاید اس طرح ٹھکانے پر آ جائے۔''

''اس عقل کا کیا فائدہ، جو ٹھوکر کی منتظر رہے۔'' جنی نے طویل سانس لے کر کہا۔

''انسانوں میں اور ہم جنوں میں ایک بات تو مشترک ہے۔'' روناف نے سر ہلا کر کہا۔

''وہ کیا......؟'' جنی نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہم دونوں ہی رب العزت کے یہاں جواب دہ ہیں اور اس لئے شیطان نے ہمارے گرد اپنا جال بن رکھا ہے۔ یہ سب شیطان ہی کی چالیں ہیں کہ ہم خواہ مخواہ الٹے سیدھے معاملات میں اپنے سینگ اڑا دیتے ہیں۔ اب بوقاف ہی کو دیکھ لو...... ایک لڑکی کے روپ میں آ کر شیطان نے اسے کس طرح بہکا کر انسان بنوا دیا۔'' روناف کا لہجہ غم زدہ تھا۔

اس کی بات نے گہرا اثر کیا اور جنی دوبارہ رونے لگی۔ روناف چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''ارے...... ارے...... تم پھر رونے لگیں......''

''میرا بوقاف...... ہائے......'' جنی نے ہچکی لی۔

''دیکھو...... رونے سے کچھ نہیں ہوگا...... کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تم اس کے لئے دعا کرو...... اور انتظار کرو کہ وہ کب سدھر کر واپس پلٹے گا۔''

''وہ...... واپس آ تو جائے گا نا......؟''

''ضرور آئے گا......'' روناف کا لہجہ ٹھوس تھا۔ ''اک دن ضرور وہ لوٹ کر آئے گا...... اور اسے پورا پورا احساس ہوگا کہ اس نے جو کچھ بھی کیا، غلط کیا۔''

''کب آئے گا میرا لال......؟''

''بہت جلد...... کیونکہ مچھلی پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ وہ مر جائے گی۔ پھر تم خود ہی فیصلہ کرو...... کیا بوقاف ہم لوگوں سے جدا ہو کر رہ سکتا ہے......؟''

جنی نے چند لمحے کچھ سوچا اور پھر سمجھ جانے والے انداز میں سر ہلا دیا۔ اس کے باوجود اس کی آنکھوں کے کوزے دوبارہ امنڈنے کے لئے بے تاب ہو گئے۔

☆......☆......☆

آج بوقاف نے ٹھان لی تھی کہ وہ شبن خیراتی کے ہوٹل کو خیر باد کہہ دے گا۔ چونکہ شبن کو اطلاع دینا بھی ضروری تھی، اس لئے بوقاف اس وقت کاؤنٹر کے قریب کھڑا ہوا، اسے متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کوشش اس لئے کہ آج پھر شبن خیراتی کافی خوش گوار موڈ میں مست ہو کر گانے سن رہا تھا اور اسے متوجہ کرنا ذرا مشکل کام تھا۔ شبن کی آنکھیں بند تھیں اور وہ ہولے ہولے گردن ہلا کر گانے کی دھن پر مٹک رہا تھا۔

ہوٹل میں اس وقت زیادہ تر میزیں خالی تھیں۔ دوپہر کے گیارہ بجے کا وقت تھا۔ بوقاف سوچ ہی رہا تھا کہ شبن کو اپنی طرف متوجہ کرے کہ عین اسی وقت دو افراد ہوٹل میں داخل ہوئے۔ یہ شکل و صورت سے غنڈہ ٹائپ دکھائی دے رہے تھے۔ بوقاف نے محسوس کیا کہ ان کے ارادے ہرگز اچھے اور نیک نہیں ہیں، وہ چوکنا ہو گیا اور غور سے ان دونوں کی طرف دیکھنے لگا۔

دونوں بدمعاش ٹائپ آدمی کاؤنٹر ہی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پھر وہ نزدیک آ پہنچے اور ان میں سے ایک نے کاؤنٹر پر ایک زوردار مکا مارا۔

شبن نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ پھر جیسے ہی اس کی نظر بدمعاشوں پر پڑی، اس نے برا سا منہ بنایا اور ٹیپ ریکارڈ کی آواز کم کر دی۔ ساتھ ہی اس نے الٹا ہاتھ لہرایا اور لاپرواہی سے بدمعاشوں سے مخاطب ہوا۔ ''جاؤ...... جاؤ...... میرے پاس پچاس کا کھلا نہیں ہے۔''

یہ سنتے ہی دونوں بدمعاش آگ بگولا ہو گئے۔ خود بوقاف بھی شبن کی دیدہ دلیری پر حیرت زدہ رہ گیا تھا۔

’’اوئے......موٹی توند......!‘‘ ایک بدمعاش گرجا۔ ’’تو نے کیا ہمیں بھکاری سمجھا ہے......؟ ہیں بے......؟‘‘

یہ کہہ کر وہ بدمعاش کاؤنٹر کے دوسری طرف پہنچ گیا اور اس نے ایک زوردار قسم کے گھونسے سے شبن کی کنپٹی سینک ڈالی۔ شبن کی آنکھوں میں بہت سے ستارے بریک ڈانس کرنے لگے۔

ہوٹل میں موجود افراد بھی اسی جانب متوجہ ہو گئے تھے اور اپنی کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اسی وقت بوقاف نے مداخلت کی۔

’’یہ......یہ تم لوگ کیا کر رہے ہو......؟‘‘

’’تیرے ساتھ تو کچھ نہیں کر رہے۔‘‘ بوقاف کے قریب کھڑا ہوا بدمعاش اس پر الٹ پڑا۔ ’’تو کیا اس کا خالو ہے؟‘‘

’’یہ غلط ہے اور......‘‘

’’ابے تیرے غلط کی تو......‘‘ اندر والے بدمعاش نے ایک موٹی سی گالی دی اور شبن کی کنپٹی پر دوسرا مکا جڑ دیا۔

’’میرا......میرا قصور کیا ہے......؟‘‘ شبن کراہا۔

’’قصور......!‘‘ مکا مارنے والے نے حیرت سے دہرایا۔ ’’ابے تو نے پنگو بدمعاش اور ٹنگو بدمعاش کو بھکاری بنا دیا......اور پوچھ رہا ہے کہ قصور کیا ہے......!‘‘

پنگو اور ٹنگو کا نام سن کر شبن کی ہوا کھسک گئی۔ کیونکہ یہ دونوں نامی گرامی بدمعاش تھے۔

’’مم......مجھے غلط فہمی ہو گئی تھی۔‘‘ شبن نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔

’’کیسی غلط فہمی......؟ کیا ہماری شکلیں بھکاریوں سے ملتی جلتی ہیں؟‘‘ ٹنگو دھاڑا، وہ باہر کھڑا تھا، پھر اس نے بھی شبن کے سر پر ایک دھپ رسید کر دی۔

ارد گرد لوگ بھی جمع ہو چکے تھے، اب بوقاف سے رہا نہ گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر ٹنگو کی گردن دبوچ لی۔

چونکہ ہاتھ بوقاف کا تھا، اس لئے ٹنگو کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ ’’اے چھوڑ......چھوڑ میری گردن......‘‘ اس کی آواز گلے میں پھنس گئی۔

’’ابے او......! چھوڑ اس کی گردن......‘‘ پنگو بھی دہاڑا اور پھرتی سے کاؤنٹر سے کود کر بوقاف سے لپٹ پڑا۔

ادھر شبن سہم کر کپڑے سے اپنی کنپٹیاں سہلا رہا تھا۔ ٹنگو اور پنگو کا نام سن کر ہوٹل کے گاہک بھی کونے کھدروں میں دبک گئے تھے۔

بوقاف پہلے تو پنگو کے وزن سے لڑکھڑایا۔ کیونکہ ٹنگو کی گردن اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ پھر بوقاف نے سنبھل کر دوسرے ہاتھ میں پنگو کی گردن بھی دبوچ لی۔

شبن اور دوسرے لوگ آنکھیں پھاڑ کر یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ سب ہی کو یقین تھا کہ اب شبن کے حمایتی کی خیریت نہیں ہے۔ کیونکہ ٹنگو اور پنگو نامی گرامی بدمعاش تھے۔ ان کا سکہ کھوٹا سہی، لیکن پورے علاقے میں چلتا ضرور تھا۔

لیکن سب کی امیدوں کے برخلاف، دونوں بدمعاش اپنی گردنیں چھڑانے میں قطعی ناکام رہے۔ یوں لگ رہا تھا۔ جیسے کسی انسان نے

دونوں ہاتھوں میں مرغیوں کی گردنیں پکڑ رکھی ہوں۔

دونوں تھوڑا سا مچلے اور پھر ڈھیلے پڑ گئے۔

''اماں بھائی صاحب......!'' ننگو نے پھنسی پھنسی آواز میں بوقاف کو مخاطب کیا۔ ''تم خواہ مخواہ کود پڑے...... ہمارا پھڈا تو اس موٹے سے ہو رہا تھا۔ بلاوجہ تم......''

''اس بے چارے سے تمہارا کیا جھگڑا ہے......؟'' بوقاف نے ان کی گردنیں چھوڑتے ہوئے پوچھا۔

''جھگڑا......؟'' ننگو نے اپنی گردن سہلا کر شبن کو گھورا۔ ''ہم بھتہ لینے آئے تھے...... اس بدبخت نے ہمیں بھکاری سمجھ کر دھتکار دیا۔''

''بھتہ کیا ہوتا ہے......؟'' بوقاف نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ ہم جیسے غنڈے بدمعاشوں کا ٹیکس ہوتا ہے۔ ہم لوگ ہر دکان اور ہر ہوٹل پر جاتے ہیں اور اپنا خرچہ پانی لے لیتے ہیں۔''

''گورنمنٹ کی طرف سے......؟'' بوقاف کے لہجے میں الجھن تھی۔

''نہیں بھئی......'' ننگو ہنسا۔ ''تم تو بھولے رام ہو...... ارے استاد...... یہ ہماری دادا گیری ہوتی ہے۔ چھنے خانی ہوتی ہے...... اب سمجھے......!''

''اوہ......'' بوقاف کے منہ سے نکلا۔ ''یہ تو دھاندلی ہے...... غلط ہے...... تمہیں پولیس والے نہیں پکڑتے......؟''

یہ سن کر دونوں بدمعاش منہ دبا کر ہنسنے لگے۔ پھر انہوں نے بوقاف کو ایسے دیکھا جیسے وہ بالکل الو اور احمق پاجی ہو۔ پھر ننگو، شبن کی طرف مڑا شبن محتاط سا ہو گیا۔

''ابھی تو ہم جا رہے ہیں...... پھر کسی دن آئیں گے۔''

''کیوں آؤ گے بھئی......!'' بوقاف نے پھر مداخلت کی۔

''بھتہ لینے...... اور کیوں......؟'' ننگو نے گردن اکڑا کر کہا۔

''میرے خیال سے تم دونوں ابھی بھتہ لے جاؤ۔ اگر دوبارہ آؤ گے...... تو خواہ مخواہ تم دونوں کو تکلیف ہوگی...... یہ لو......''

یہ کہہ کر بوقاف آگے بڑھا اور ننگو کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ جڑ دیا۔ ننگو الٹ کر گرا اور بے حس و حرکت ہو گیا۔

☆......☆......☆

ایک مستقل شامت تھی، جو بے چارے سلیم کے تعاقب میں لگی ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی ''ادھوری ریہرسل'' کو مکمل کرنے کے لئے گھر سے نکل کھڑا ہوا تھا۔

گھر میں تو خطرہ تھا...... کیونکہ اس کی والدہ نے اسے پہلی دفعہ ہی شک کی زد میں لے لیا تھا اور ہو سکتا تھا کہ اگر سلیم ''رنگے ہاتھوں'' پکڑ لیا جاتا تو ضرور پاگل خانے کی دیواروں میں چنوا دیا جاتا۔ (نوٹ: انارکلی پاگل ہرگز نہیں تھی)

وہ گھر سے نکلا اور ایک سنسان جگہ آ پہنچا۔ یہ ایک بے آباد میدان تھا۔ جہاں خودرو گھاس پھونس اگی ہوئی تھی۔ چونکہ دوپہر کا وقت تھا۔ اس لئے

دور دور تک کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ پھر بھی سلیم نے چاروں طرف ایک محتاط قسم کی نظر دوڑائی اور پھر مطمئن ہو کر بلند آواز سے چیخا۔

”مہ پارہ......! اے میری جان مہ پارہ......! میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگر تمہاری شادی ہوگئی تو......تو، میں خودکشی کر لوں گا...... ہاں خودکشی کر لوں گا۔“

پہلی دفعہ کی کوشش ہی انتہائی کامیاب رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں اپنی قوتِ گویائی کو داد دینے لگا۔ کتنے کمال سے اس نے یہ جملے ادا کیے تھے۔ واؤ......! ہُرے......!

اس نے ایک بار پھر اپنے جملے دہرائے۔ عین اسی وقت کسی نے اس کے کاندھے پر تھپکی دی۔ وہ اچھل پڑا۔ گھوم کر دیکھا تو سٹی گم ہوگئی۔ اس کے سامنے دو مسٹنڈے قسم کے پولیس والے کھڑے تھے، اور خون خوار نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”کیوں بے......؟ خودکشی کرے گا تو......؟ اوئے شرم نہیں آتی تجھے......؟“ ایک پولیس والا گرجا۔

”او......اے او......!“ دوسرے نے اس کا کالر جھٹکا۔ ”بدکردار انسان......! غیرت پکڑ اوئے...... بے غیرتاں......!“

سلیم ہکا بکا ان کی شکلیں دیکھ رہا تھا۔ یہ مصیبت کہاں سے نازل ہوگئی تھی......؟

”ہم تو گشت پر تھے......“ پہلے پولیس والے نے گویا اس کے دل کی بات سن لی تھی۔ ”وہ تو اچھا ہوا کہ تم نے چیخ کر اپنے جرم کا اقرار کر لیا...... اور ہم نے تمہیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا...... ثبوت کے ساتھ...... کیوں کمالے......؟“ وہ اپنے ساتھی کی طرف گھوما۔

”ہاں جمالے......!“ کمالے نے فوراً گردن ہلائی۔ ”قانون کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں۔ پاتال میں بھی مجرم کو نہیں چھوڑتے۔“

”اب تم بتاؤ......“ جمالے نے سلیم کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ ”اب تک کتنی مرتبہ خودکشی کر چکے ہو......؟“

”کیا کہہ رہے ہو جمالے......؟“ کمالے نے اپنے ساتھی کو ٹوکا۔ ”خودکشی بھی کوئی بار بار کرتا ہے...... یہ تو ایک ہی بار ہوتی ہے۔“

”مجھے معلوم ہے...... معلوم ہے۔“ جمالے نے فوراً گردن ہلائی۔ ”میں تو تفتیش کا آغاز کر رہا ہوں۔“

”میں نے کوئی خودکشی نہیں کی......“ سلیم نے زبان کھولی اور جھنجھلا کر بولا۔ ”اور نہ ایسا کوئی ارادہ ہے۔“

”جھوٹ......“ جمالے کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔ ”سفید جھوٹ...... اور وہ بھی قانون کے سامنے...... یہ تو ڈبل جرم والی کرائم اسٹوری ہے۔ کس گروہ سے تعلق ہے تمہارا...... نام بتاؤ اوئے......؟“

”اس گروہ کا کوئی ایک نام نہیں ہے۔“ سلیم نے جل کر کہا۔ ”کیونکہ خودکشی کرنے والے لوگ مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ کوئی بھوکا ہوتا ہے، کوئی غربت کا مارا ہوتا ہے اور کوئی نوکری و روزگار کا مارا......“

”اوئے...... ہمیں سبق پڑھاتا ہے......؟“ جمالے نے آنکھیں نکالیں۔ ”جرم پر جرم کیے جا رہا ہے۔ قانون کو سبق پڑھاتا ہے......؟“

”سبق نہیں پٹی جمالے......“ کمالے نے تصحیح کی۔ ”یہ ہمیں پٹی پڑھا رہا ہے۔“

”یہ تو اور بھی خطرناک واردات ہے۔“ جمالے کا انداز معنی خیز تھا۔ پھر وہ سلیم کا گہری نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ”او...... تیرا

کیس تو ہر لمحے سنگین ہوتا جا رہا ہے۔"

"چڑھا دو مجھے پھانسی......" سلیم نے بھنا کر کہا۔

"ہوں......" کمالے نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ "تا کہ تیرا خودکشی کرنے والا منصوبہ پورا ہو جائے......کیوں......؟"

"دیکھ لو اس کی چالاکی......" جمالے نے دخل دیا۔ "بہت گھاگ مجرم ہے یہ......گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رکھا ہے اس نے۔ ہاں......"

"میں گدھا نہیں ہوں۔" سلیم کا منہ بن گیا۔

"رہنے دے......ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ تو کیا ہے......اب باتوں میں مت الجھا اور یہ بتا کہ تو خودکشی جیسا سنگین جرم کیوں کر رہا تھا......؟"

"تھانے لے چلو اسے......سب کچھ اگل دے گا۔" کمالے نے کہا۔

"آخر میرا جرم کیا ہے......؟" سلیم چلا اٹھا۔

"آرام سے بات کر......اتنا بڑا جرم کر کے پوچھ رہا ہے کہ کیا جرم کیا ہے؟ خودکشی کوئی چھوٹا جرم ہے۔"

"میں نے کب کی ہے خودکشی......؟"

"ہم نہیں آتے، تو تو اب تک کر بھی چکا ہوتا......پھر کیا ہوتا......؟"

"تو میں خودکشی کرتا ہی کیوں......؟" سلیم جز بز ہو رہا تھا۔

"ہمیں کیا معلوم......؟" کمالے نے ناک بھنوں چڑھائی۔ "یہ تو تجھے ہی پتا ہو گا۔"

سلیم کا دل چاہا کہ کہیں نکل بھاگے۔ ان پولیس والوں سے جان چھڑانا مشکل ہو رہا تھا۔ کم بخت......عذاب کے فرشتوں کی طرح نازل ہوئے تھے۔

"اب کرنا کیا ہے......یہ بتاؤ......؟" تنگ آ کر سلیم نے پوچھا۔

"تجھے حوالات کی سیر کروائیں گے......اور کیا کریں گے......" کمالے نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا۔

"اور اگر میں نے حوالات میں خودکشی کر لی تو......؟" سلیم نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

دونوں پولیس والے اس کی شکل ہی دیکھتے رہ گئے۔ عین اسی وقت قریب ہی کہیں فائرنگ کی آواز گونجی۔

پولیس والے اچھل پڑے۔ خود سلیم بھی چونک گیا تھا۔ "نکلو بھئی یہاں سے......" کمالے نے جلدی سے کہا۔

"ہاں......ہاں......چلو......" جمالے نے بھی کہا۔

ادھر فائرنگ کی تڑاتڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دو گروپوں کا آپس میں مقابلہ ہو رہا ہو۔

"چل بھئی......تو بھی بھاگ......ہم بھی کسی طرف نکلتے ہیں۔" کمالے نے سلیم سے مخاطب ہو کر کہا۔ "خوامخواہ کسی گولی کی زد میں آ گئے تو

ڈر کے مارے کوئی فاتحہ پڑھنے بھی نہیں آئے گا۔‘‘

’’یہ ہے کیا چکر......؟ فائرنگ کیوں ہو رہی ہے؟‘‘ سلیم سے رہا نہ گیا۔

’’اس علاقے میں دو برتن ہیں، جو آپس میں ٹکراتے رہتے ہیں۔ سمجھے......!‘‘

’’ہوں......تو تم لوگوں کو انہیں گرفتار کرنا چاہیے، نا کہ تم خود ہی بھاگ رہے ہو......‘‘ سلیم نے اعتراض کیا۔

’’ان برتنوں کے مالک، بہت اونچے لوگ ہیں۔ ہم کیسے ہاتھ ڈالیں گے؟‘‘

کمالے نے جواب دیا۔ ’’اگر ہم نے ایسا کیا تو خود ہمارے گھر کے برتن ہی بک جائیں گے۔‘‘

اس دوران تینوں ہی میدان سے نکل آئے تھے۔ فائرنگ اب بھی جاری تھی۔ گلی کے کونے پہ آ کر جمالے نے جلدی سے سلیم کا ہاتھ مصافحے کی طرح تھاما اور بولا۔

’’نکلو بادشاہ......تم بھی کوئی گلی پکڑو اور ہم بھی......تم سے ہم خرچہ پانی لیتے، لیکن......حالات سازگار نہیں ہیں......پھر کبھی سہی۔ اور ہاں......ایک بات یاد رکھنا......! آئندہ کبھی خودکشی کرو تو اچھی طرح دیکھ لینا کہ آس پاس کوئی پولیس والا تو موجود نہیں ہے۔ ہاں......‘‘

☆......☆......☆

ہوٹل کے ہال میں موت کی سی خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ خود شبن بھی ہکا بکا رہ گیا تھا۔ ’’یہ...... یہ تم نے کیا کیا......؟‘‘ پنگو نے چیخ کر بوقاف کو مخاطب کیا۔

’’بھتہ دیا ہے......‘‘ بوقاف اطمینان سے بولا۔ ’’تمہیں بھی چاہیے......؟‘‘

پنگو اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے بوقاف کو گھورنے لگا۔ پھر وہ ٹنگو کی طرف متوجہ ہوا اور اسے ہلا جلا کر دیکھا۔

وہ ہوش میں تھا۔ البتہ بوقاف کے تھپڑ نے اس کے ہونٹ کا گوشہ پھاڑ دیا تھا، جس سے خون بہنے لگا تھا۔ وہ اپنے ساتھی کی مدد سے اٹھ کھڑا ہوا اور بائیں ہاتھ کی آستین سے خون صاف کرتے ہوئے خون خوار نظروں سے بوقاف کو گھورنے لگا۔

’’اب تم دونوں یہاں سے دفع ہو جاؤ۔‘‘ بوقاف نے انہیں دھتکارا۔ ’’اور آئندہ کبھی کسی سے بھی بھتہ نہیں لینا......اللہ نے ہاتھ پاؤں سلامت دیے ہیں، خواہ مخواہ کیوں دوسروں کا حق چھین کر آگ سے اپنا پیٹ بھر رہے ہو......؟‘‘

’’اپنی نصیحت اپنے پاس رکھو......‘‘ ٹنگو بگڑ کر بولا۔ ’’تم جانتے نہیں ہو......تم نے کس پر ہاتھ اٹھایا ہے۔‘‘

’’تم پر اٹھایا ہے بھئی......اور کس پر ہاتھ اٹھاؤں گا......؟ اتنی جلدی بھول گئے؟‘‘ بوقاف کے لہجے میں حیرت تھی۔

اس کی بات سن کر شبن وغیرہ بے ساختہ ہنس پڑے۔ ادھر ٹنگو اور پنگو کے تو آگ ہی لگ گئی۔ پنگو پاؤں پٹخ کر بولا۔

’’ہم کنگ کانگ کے خاص آدمی ہیں۔ سمجھے......! تم نے سانپ کے بل میں ہاتھ ڈالا ہے۔ اب اس کا خمیازہ تمہیں بھگتنا پڑے گا۔‘‘

’’فلم کنگ کانگ میں نے دیکھی ہے......‘‘ بوقاف نے سر ہلا کر بولا۔ ’’لیکن اس میں تو کنگ کانگ مر گیا تھا۔‘‘

’’یہ دوسرا کنگ کانگ ہے......‘‘ پنگو ہنسا۔’’اس کنگ کانگ سے زیادہ خوفناک اور خطرناک......‘‘

’’اچھا......!‘‘ بوقاف کے لہجے میں حیرت تھی۔ پھر وہ شبن کی طرف گھوما۔ جس کا چہرہ تاریک ہو رہا تھا۔ شاید وہ کنگ کانگ سے واقف تھا۔

’’آپ واقف ہیں کنگ کانگ سے......؟‘‘ بوقاف نے شبن سے پوچھا۔

’’نن......نن......نن......‘‘ شبن ہکلا کر رہ گیا۔

’’یہ کیا جواب ہوا......؟‘‘ بوقاف کے لہجے میں الجھن تھی۔ ٹنگو بڑے اسٹائل سے ہنسا۔

’’یہ جانتا ہے کنگ کانگ کو......اسی لئے اس کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی۔‘‘ یہ کہہ کر وہ اپنے ساتھی کی طرف مڑا۔’’چلو پنگو! اب مسٹر کنگ کانگ ہی اس سے نمٹیں گے۔ چلو......‘‘

پھر دونوں نے معنی خیز نظروں سے بوقاف کی طرف دیکھا اور ہوٹل کے دروازے کی طرف بڑھے۔ بوقاف انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا، پھر وہ شبن کی طرف مڑا، جو پتھر کا بت بنا ہوا تھا۔

’’آپ نے بتایا نہیں......کون ہے یہ کنگ کانگ......؟‘‘ بوقاف نے پوچھا۔

’’وہ......وہ شہر میں رہتا ہے۔‘‘ شبن نے زبان کھولی۔’’نامی گرامی بدمعاش ہے۔ لوگ اس کے نام سے ہی کانپتے ہیں۔ تم نے......تم نے بہت غلط کیا......بہت غلط کیا۔‘‘

’’میں نے کیا کیا ہے......؟‘‘ بوقاف نے حیرت سے پوچھا۔

’’تم نے اس کے آدمیوں سے پنگا لیا ہے۔ مجھے بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کے گرگے ہوں گے۔‘‘ شبن نے پریشان کن لہجے میں کہا۔

بوقاف اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ ہوٹل کے گاہک بھی اٹھ کر اب قریب آ کھڑے ہوئے تھے اور سن گن لے رہے تھے۔

اچانک شبن نے سرسراتی ہوئی آواز میں بوقاف کو مخاطب کیا۔’’اب تم......ابھی اور اسی وقت میرا ہوٹل چھوڑ دو۔ یہاں سے چلے جاؤ۔‘‘

’’سچ......!‘‘ بوقاف خوشی سے اچھل پڑا۔

☆......☆......☆

ٹنگو اور پنگو، ایک دوسرے کو لعنت ملامت کرتے ہوئے، ایک چھوٹے سے مکان میں داخل ہوئے۔ دراصل ہوٹل سے نکلتے ہی دونوں کے درمیان پھوٹ پڑ گئی تھی۔ پنگو کا کہنا تھا کہ ٹنگو خواہ مخواہ اس آدمی سے دب گیا جبکہ ٹنگو نے اپنے ردعمل کی یہ توجیہہ بیان کی۔

’’ابے پاگل......! مجھے لگ رہا تھا کہ وہ ہم سے بھی بڑا کوئی فنٹر ہے۔ خواہ مخواہ پنگا لینے کا کیا فائدہ......! سب کے سامنے وہ ہماری کُٹ لگا دیتا، تو سارے بھرم تیل ہو جاتے۔‘‘

’’یہ تم نہیں بول رہے۔‘‘ پنگو کا لہجہ طنزیہ تھا۔’’بلکہ وہ چماٹ بول رہا ہے جو اس نے تمہارے تھوتھنے پر دھرا تھا۔‘‘

’’بکواس مت کر......‘‘ ٹنگو کو غصہ آ گیا۔’’تیرے کتے جیسے تھوتھنے پر پڑتا نا وہ چماٹ......تو میں پوچھتا، لوہا تھا اس کا ہاتھ......لوہا۔‘‘

’’اس کا ہاتھ لوہے کا نہیں تھا...... بلکہ تمہاری کھال پتلی ہے۔‘‘ پنگو نے منہ بنایا۔

’’بس...... بس رہنے دے......‘‘ ٹنگو نے ہاتھ اٹھایا۔’’کس کس سے کتنے کتنے چماٹ کھائے ہیں...... تمہیں پتا نہیں ہے......؟ شروع شروع میں لوگوں سے کتنا پٹے ہیں......! لیکن...... اس کا ہاتھ......‘‘

یہ کہہ کر اس نے اپنا پٹا ہوا گال سہلایا۔ پنگو کچھ نہ بولا۔ پھر ٹنگو خود ہی بولا تھا۔’’ابھی جا کر استاد کو رپورٹ دیتے ہیں۔ وہ خود نمٹ لے گا...... اگر زیادہ بات بڑھی تو پھر کنگ کانگ زندہ باد......!‘‘

’’ویسے...... یہ کنگ کانگ بھی خوب ہے۔ ایسا باس نہ کبھی دیکھا اور نہ سنا۔‘‘ پنگو نے موضوع بدلا۔

’’ہاں......‘‘ ٹنگو نے طویل سانس لی۔’’یہ تو ہے۔ کتنی فلموں کے ولن اور باس دیکھے، لیکن کنگ کانگ جیسا باس نہ کبھی دیکھا، اور نہ سنا۔‘‘

ایسی ہی باتیں کرتے ہوئے وہ دونوں اس مکان کی راہداری سے گزر کر ایک کمرے میں آ پہنچے۔ کمرے میں صرف ایک پلنگ بچھا ہوا تھا، جس پر ایک نہایت کمزور اور دبلا پتلا آدمی لیٹا ہوا سو رہا تھا۔ اس کے جسم پر صرف شلوار تھی۔ اوپری حصہ ننگا تھا، جس کی بدولت اس کی پسلیاں صاف دکھائی دے رہی تھی۔

ٹنگو نے آگے بڑھ کر اس کا کندھا زور سے ہلایا۔

’’اٹھو استاد...... بہت سو لئے...... اٹھو......‘‘

کمزور سا آدمی فوراً ہی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور چندھیائی ہوئی آنکھوں سے دونوں کی طرف دیکھنے لگا۔

’’کیا...... کیا ہوا......؟ کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے......؟‘‘ اس نے بھرائی ہوئی اور کرخت آواز میں پوچھا۔ ویسے اس کے جسم کی مناسبت سے اس کی آواز قطعی الٹ تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے چوزا، ہاتھی کی طرح چنگھاڑ رہا ہو۔

’’استاد......!‘‘ ٹنگو نے منہ بنا کر کہا۔’’تم سے کتنی بار کہا ہے...... کہ دروازہ بند کر کے سویا کرو...... تم سو رہے ہوتے ہو اور محلے کے بچے گھر میں گھس کر تمہاری پسلیاں گنتے ہیں۔‘‘

’’گننے دو......‘‘ استاد لاپروائی سے بولا۔’’گننے سے کم تھوڑی ہو جائیں گی۔‘‘

’’اور اگر کسی دن...... کسی شرارتی بچے نے ایک آدھ پسلی توڑ دی تو......! استاد......! ہم تو لٹ جائیں گے بھری دنیا میں...... قسم سے۔‘‘ پنگو کے لہجے میں تشویش تھی۔

’’کیوں......؟ تم کیا میری پسلی سے پیدا ہوئے ہو......؟‘‘ استاد بھنا کر بولا۔

دونوں کھی کھی کر کے ہنس دیئے۔ پھر ٹنگو نے سنجیدہ ہو کر استاد کو اپنی رام کہانی سنائی۔

استاد غور سے سن رہا تھا۔ کیونکہ اسی وجہ سے بے دھیانی میں کئی بار اس نے اپنی پسلیاں گنیں۔ یہ بات پنگو نے نوٹ کر لی تھی، اس لئے وہ بول پڑا۔

’’لگتا ہے استاد...... تمہیں بھی اپنی پسلیوں کی فکر ہے، اس لئے گن رہے ہو۔ قمیض پہن کر سویا کرو۔‘‘

’’کیا کروں......؟ عادت ہی نہیں ہے قمیض پہننے کی۔‘‘ استاد نے جھینپ کر جواب دیا۔ پھر فوراً ہی وہ موضوع بدل کر بولا۔

’’تم دونوں نے اچھا کیا، جو اس سے نہیں الجھے...... نہ جانے وہ کس گروہ کا آدمی ہو۔ میں کنگ کانگ کو رپورٹ کر دوں گا۔ پھر وہ جانے اور اس کا کام...... ویسے...... نام کیا ہے اس کا؟‘‘

’’معلوم نہیں......‘‘ ٹنگو نے احمقوں کی طرح گردن ہلائی۔

’’عجیب احمق ہو......‘‘ استاد پھر بھنایا۔ ’’ہاتھ ملانے والے کا بھی نام معلوم ہوتا ہے، اور تم نے تو ہاتھ کھایا ہے...... پھر بھی تمہیں اس کا نام نہیں معلوم۔‘‘

پنگو کی ہنسی نکل گئی۔ ٹنگو نے اسے گھور کر دیکھا۔

’’اس بے چارے کو کیوں گھور رہے ہو......؟‘‘ استاد نے جواباً اسے گھورا۔ ’’تم نے کام ہی ایسا کیا ہے...... اس کا نام بھی تمہیں نہیں معلوم...... ہونہہ۔‘‘

’’تو اب استاد...... کیا تم کنگ کانگ کو رپورٹ دو گے......؟‘‘ پنگو نے سوال کیا۔

’’ہاں...... یہی کرنا پڑے گا۔ پھر وہ خود ہی نمٹ لے گا۔‘‘ استاد نے بتایا۔

’’تم اس سے کیوں نہیں نمٹ لیتے......؟‘‘ ٹنگو نے اس کی پسلیوں پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

’’مجھے بخار ہو رہا ہے۔‘‘ استاد کراہا۔ ’’نزلہ بھی ہے...... اور...... اور کھانسی بھی ہو رہی ہے۔ دو چار موشن بھی......‘‘

’’بس...... بس۔‘‘ ٹنگو نے اپنی ناک دبائی۔ ’’ہم سمجھ گئے...... ہم سمجھ گئے۔‘‘

یہ سن کر استاد نے ایک طویل اطمینان بخش سانس لی۔ جیسے کوئی بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا ہو۔

☆......☆......☆

شبن نے اسے اس طرح دیکھا، جیسے اس کے سر پہ سینگ نکل آئے ہوں، یا نکلنے والے ہوں اور ان کی نوکیں برآمد ہوئی ہوں۔

’’میں تو خود آپ سے یہی کہنے والا تھا۔‘‘ بوقاف چہکا۔ ’’اچھا ہوا کہ مجھے اجازت مل گئی...... بہت بہت شکریہ...... میں ذرا کپڑے بدل لوں، پھر چلا جاؤں گا...... ضرور جاؤں گا۔‘‘

’’کیا تم یہاں سے جا کر خوش ہو گے......؟‘‘ شبن کا انداز بدل گیا، اس نے گلوگیر لہجے میں پوچھا تھا۔

’’بالکل...... بالکل......‘‘ وہ فوراً بولا۔ ’’ذرا...... یہ تو بتائیے کہ یہ کون سا علاقہ ہے؟‘‘

’’کیوں......؟‘‘

’’اپنی معلومات میں اضافہ کروں گا......!‘‘

’’یہ قصبہ نورس ہے۔‘‘ کہتے ہوئے شبن نے اپنی دکھتی ہوئی کنپٹی سہلائی۔

’’اوہ......‘‘ بوقاف کے منہ سے حیرت کے مارے نکلا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سردار نے اسی علاقے میں پھینکا تھا۔

اب مہ پارہ سے ملنے کی خواہش اور بھی بڑھ گئی تھی۔ وہ جلد سے جلد اپنی محبوبہ سے مل لینا چاہتا تھا۔

چنانچہ وہ جلدی سے مڑا اور ہوٹل کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گیا۔ شبن مغموم آنکھوں سے اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر ہوٹل کی چھت کو گھورنے لگا۔

اسی وقت ہوٹل کا ایک گاہک آگے بڑھا۔ ’’شبن میاں! اتنا دکھ ہے تو اسے ہوٹل سے کیوں نکال رہے ہوں......؟ رہنے دو اسے ہوٹل میں......‘‘

’’آں......‘‘ شبن خیالات سے چونکا۔ ’’یہی تو مشکل ہے۔ اگر میں نے اسے ہوٹل میں رہنے دیا تو کنگ کانگ میرا ہوٹل نہیں رہنے دے گا۔ اینٹ سے اینٹ بجادے گا وہ......کیا کروں......! مجبوری ہے۔‘‘

’’ہاں...... یہ تو ہے۔ اب تمہارے تندور کا کیا ہوگا؟‘‘

’’اب...... پھر کوئی بندہ ڈھونڈنا پڑے گا۔‘‘ شبن نے پھر ٹھنڈی سانس لی۔ ’’بقول شاعر

وہ تو چلے گئے اے دل، یاد سے ان کی پیار کر

پھر شبن نے جلدی سے پرانے غمگین گانوں کا کیسٹ نکالا اور ٹیپ ریکارڈ میں لگا دیا۔ فضا پرسوز ہوگئی۔ لتا اور رفیع کا ڈوئیٹ ہوٹل میں گونجنے لگا۔

دیکھ لیا میں نے
قسمت کا تماشہ دیکھ لیا

شبن کے چہرے پر دلی کرب کے آثار پھیل گئے، پھر اس نے مری مری سی آواز میں بیرا گیری کرنے والے لڑکے کو آواز لگائی۔

’’ابے چھوٹو......ابے چھوٹو......!‘‘

’’جی...... مالک......!‘‘ چھوٹو میز صاف کر رہا تھا۔ فوراً ہی اس کی طرف متوجہ ہوا۔

’’دیکھ ذرا...... عبدل بھائی کو بلا کر لے آ......ان سے کہنا...... کہ تندور سنبھالنا ہے...... شبن بھائی اچھے پیسے دیں گے۔ جا بچہ...... جلدی سے بھاگ کر جا......شاوا......‘‘

’’اچھا مالک......‘‘ چھوٹو نے فوراً سر ہلایا۔

’’اور مانے کو بھی بلا کر لا......ابھی تک نہیں آیا کم بخت......‘‘ شبن نے دوسرے بیرے کا نام لیا تھا۔

’’اچھا مالک......ابھی گیا اور ابھی آیا۔‘‘ یہ کہہ کر چھوٹو باہر نکل گیا۔

اتنی دیر میں بوقاف آ گیا۔ وہ کپڑے تبدیل کر چکا تھا۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ تندور سے آزادی ملنے کی وجہ سے بے حد

خوش ہے۔ شبن اسے ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔ بوقاف نے قریب آ کر پوچھا۔

’’ٹکر ٹکر...... ٹکر ٹکر دیکھتے ہو کیا......؟‘‘

’’آنکھیں تیری...... چہرہ تیرا......‘‘ شبن بھی گنگنایا۔

’’یہ دونوں چیزیں میں آپ کو ضرور دے جاتا۔‘‘ بوقاف کا لہجہ ہمدردانہ تھا۔ ’’لیکن مجبوری ہے۔ لوگ مجھے سرکٹا سمجھ کر مجھ سے خوف زدہ ہو جائیں گے۔‘‘

’’اچھا...... تو اپنے ہاتھ ہی دے جاؤ۔ تندور میں روٹی تو لگ جایا کرے گی۔‘‘ شبن کا لہجہ رو دینے والا تھا۔

’’میں ٹھاکر بھی نہیں ہوں۔‘‘ بوقاف نے نفی میں سر ہلایا۔

’’اچھا...... تو پھر آؤ...... آخری بار گلے سے تو لگ جاؤ۔‘‘ یہ کہہ کر شبن کاؤنٹر سے باہر نکل آیا۔

اور پھر وہ واقعی بوقاف سے لپٹ پڑا تھا۔ اس نے بوقاف کو اتنی زور سے بھینچا کہ بوقاف کو الجھن ہونے لگی۔ ’’آپ مجھے بہت یاد آئیں گے۔ میں جب بھی تندور کی طرف دیکھوں گا، مجھے آپ ہی دکھائی دیں گے۔‘‘ شبن نے کہا۔

’’اپنی تصویر دے جاؤں......؟‘‘ بوقاف نے اسے پرے ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

’’وہ روٹیاں لگا لے گی......؟‘‘ شبن نے چونک کر پوچھا۔

’’نہیں...... تصویر تو تصویر ہی ہوتی ہے۔‘‘ بوقاف نے اپنا گال کھجایا۔

’’اسے کیا گلے میں لٹکاؤں گا؟‘‘ شبن نے منہ بنایا۔ ’’ابے...... تو جن ہے، تیری تصویر روٹیاں بھی نہ لگا سکے، تو تیرے جن ہونے کا فائدہ کیا......؟‘‘ وہ فوراً ہی آپ سے تُو پر اتر آیا تھا۔

’’میں جن ہوں، ہوّا تو نہیں ہوں۔‘‘ بوقاف کا منہ بن گیا۔

’’بس...... جا یار...... چھوڑ......‘‘ شبن نے اس سے بھی برا منہ بنایا۔ ’’میں تو سمجھتا تھا کہ جن بہت ’’بمبو‘‘ قسم کی چیز ہوتے ہیں۔ لیکن......‘‘ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ پھر بڑی بے اعتنائی سے اس نے بوقاف کو رخصت کیا تھا۔

بوقاف نے باہر نکل کر ایک طویل سانس لی۔ جب سے وہ انسان بنا تھا، پہلی بار اس نے کھلی فضا دیکھی تھی۔ ورنہ اب تک اس نے ہوٹل سے باہر قدم تک نہیں نکالا تھا۔ اس کا ذہن ہی کسی طرف مائل نہیں تھا۔

لیکن اب اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے خواہ مخواہ شبن خیراتی کے ہوٹل میں اتنے دن ضائع کر دیئے۔

وہ اس وقت جہاں کھڑا تھا، یہ ایک چھوٹا سا بازار تھا۔ جس میں ضروریاتِ زندگی کی تمام اشیاء دستیاب تھیں۔ شبن خیراتی کے ہوٹل سے متصل سبزی اور گوشت کی کئی دکانیں قطار سے بنی ہوئی تھیں۔

ان دکانوں کی وجہ سے یہاں کافی رونق تھی۔ بوقاف کو لوگوں کا ایک ہجوم سا دکھائی دیا۔ ابھی تک وہ ہوٹل کے سامنے ہی کھڑا تھا۔

دراصل بوقاف یہ فیصلہ کرنا چاہتا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہئے......! دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ پلک جھپکتے میں مہ پارہ کے گھر جا پہنچے۔ لیکن پھر اس کے دل میں کئی اندیشے جاگ اٹھے۔ مثلاً

اندیشہ نمبر ۱:۔ ہوسکتا ہے کہ مہ پارہ کو صرف جن سے ہی محبت ہو، اور اب وہ بوقاف کو انسانی روپ میں قبول نہ کرے تو......؟

اندیشہ نمبر ۲:۔ ہوسکتا ہے کہ مہ پارہ کے والد اس کی کھنچائی کر دیں۔ جب وہ جن تھا، اس وقت تک تو وہ پھر بھی تھوڑا بہت اس سے ڈرتے تھے، لیکن اب تو......!

اندیشہ نمبر ۳:۔ ہوسکتا ہے کہ ایسا کچھ نہ ہو، لیکن اگر نکاح کے وقت قاضی نے شناختی کارڈ مانگ لیا تو......؟

بوقاف بے چارے کے پاس تو ابھی راشن کارڈ بھی نہیں تھا، شناختی کارڈ کہاں سے آ جاتا۔

بہرحال کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ یہی سوچ کر اس نے ایک بار پھر طویل سانس بھری اور قدم اٹھا دیئے۔

ابھی دو چار قدم ہی آگے بڑھا کہ اچانک ہی کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

وہ چونک کر مڑا اور پھر......سامنے والے کو دیکھ کر اس کی جو حالت ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔

دل دھک سے رہ گیا، خون خشک ہوگیا، جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی اور چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ پھر بھی اس نے اپنی جسمانی طاقت جمع کی اور خشک ہوتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔

”ارے......! چچا تندوری......تم......؟“

☆......☆......☆

طبلہ بج رہا تھا......اور وہ بھی سردار کے سر پر اور طبلہ بجانے والے ہاتھ بھی خود اسی کے تھے۔ اس کے خیمے میں اس وقت مالوط موجود تھا اور مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔

”ستیاناس......“ سردار بڑبڑایا۔ ”سب کچھ ستیاناس کر دیا......“

”تم نے ہمارے سارے پروگرام کی ایسی کی تیسی کر دی۔“

”مم......میں نے تو......“ مالوط ہکلایا۔ ”سردار......! میں نے تو آپ کی ہدایت پر عمل کیا تھا۔“

”یہ......ہماری ہدایت پر عمل کیا تھا، یا ہماری ہدایت کا بیڑا غرق کیا تھا......؟ بولو......“

”نن......نہیں سردار“ وہ پھر ہکلایا۔

سردار نے اب طبلہ بجانے کا عمل ترک کر دیا تھا۔ وہ مالوط کو گھورتے ہوئے بولا۔ ”اس سے بہتر تو یہ تھا کہ ہم تمہیں حقیقتاً کوئی سزا دے دیتے۔“

”وہ کیا سردار......؟“ مالوط نے چونک کر پوچھا۔

''مثلاً ہم یہ سزا سناتے کہ کراچی شہر میں جاؤ اور کوئی اچھی سی نوکری تلاش کرو۔'' سردار نے جواب دیا۔

''نہیں سردار......'' مالوط تقریباً چیخا۔ ''اللہ تعالیٰ کے واسطے...... مجھے یہ سزا مت دیجئے گا۔ اُف...... کتنی خوفناک ہے یہ سزا......نوکری...... اور وہ بھی کراچی میں......اللہ معافی۔'' یہ کہہ کر مالوط نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

''اچھا......تو پھر ایک اور سزا ہے۔'' سردار نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''وہ کیا سردار؟ یہ والی سزا تو بہت خوفناک ہے۔ کوئی اور ہی بتائیں۔'' مالوط کا انداز ملتجیانہ تھا۔

''دوسری سزا یہ ہے کہ تم ٹیلی فون کا نظام سنبھال لو...... کسی گھر کا بھی فون خراب نہیں ہونا چاہئے، کوئی کمپلین نہیں آنی چاہئے۔'' سردار کا لہجہ معنی خیز تھا۔

یہ سزا سن کر بھی مالوط کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ وہ تڑپ کر بولا۔ ''نہیں سردار......نہیں......! یہ بھی ناممکن کام ہے۔ ٹیلی فون کا نظام تو پیدائشی درہم برہم ہے۔ میں بھلا اسے کیا درست کر سکوں گا۔ اگر پورے ملک میں دس لاکھ ٹیلی فون سیٹ ہوں گے، تو دس لاکھ ہی روزانہ کمپلینیں ہوں گی۔ یہ محکمہ اور اس کا سسٹم کبھی درست نہیں ہو سکتے۔ پلیز سردار......! کوئی اور سزا سوچیں۔''

''کیا خاک سوچیں......؟'' سردار جھنجھلایا۔ ''ان دونوں سزاؤں کے علاوہ اور کون سی کڑی سزا ہے...... بتاؤ......؟ ایک تو تم نے کام ہی ایسا کیا ہے کہ تمہاری عقل پر ماتم کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔ تمہیں ضرورت ہی کیا تھی، طولانی اور تندوری کو بوقاف کے پیچھے لگانے کی......؟''

''وہ......وہ جی......بس۔''

''وہ، جی اور بس کا کیا مطلب ہوا......؟'' سردار نے آنکھیں نکالیں۔

''یہ تینوں لفظ مہمل ہیں۔'' مالوط نے سمجھایا۔ ''آپ نے اردو کے قواعد نہیں پڑھے؟''

''نہیں......'' سردار کے منہ سے نکلا، پھر اس نے جلدی سے انداز بدل کر مالوط کو گھورا۔ ''اور ہاں......تم نے پھر سلیم کو الجھن میں ڈال دیا......؟ باز نہیں آؤ گے تم اپنی حرکتوں سے......؟''

''اوہ......وہ......'' مالوط نے بمشکل اپنی ہنسی ضبط کی۔ ''آپ نے ہی تو کہا تھا کہ اسے......''

''ہم نے اس طرح کہا تھا؟'' سردار نے اس کی بات کاٹی۔ ''وہ بے چارہ ایک اور نئی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اگر تمہاری یہی حرکتیں رہیں تو وہ حقیقتاً خودکشی ہی کر لے گا۔''

مالوط کچھ نہ بولا۔ سر جھکائے ہوئے سنتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں ایک دھیمی سی شرارت کی چمک تھی۔

''ہمارا خیال ہے کہ تمہیں بھی انسان ہی بنا دیا جائے۔'' سردار نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تمہارے جراثیم بھی اسی طرح ہلاک ہوں گے۔''

''سردار......! گستاخی معاف......آج کل انسان کا خود ہی انسان ہونا بڑا مشکل ہے۔ بقول شاعر

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
تو پھر......میں کیا انسان بن سکوں گا۔‘‘

’’کیا بوقاف کو ہم نے انسان کی کھال پہنائی ہے؟‘‘ سردار جھنجھلا کر بولا۔ ’’ابے......انسان کی نسل تو وہی ہے نا......؟ گڑبڑ تو ان کی قدروں میں ہوئی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ شعر جس نے کہا ہے، اس کی دم نکل آئی ہو۔‘‘

’’توبہ کیجئے......‘‘ مالوط بے ساختہ بولا۔ ’’یہ مرزا غالب کا شعر ہے۔‘‘

’’اوہ......مرزا غالب......‘‘ سردار چونکا۔ ’’ان کے کلام سے تو واقعی توبہ ہی بھلی......سمجھ میں ہی نہیں آتا......خیر ارے......تم نے ہمیں باتوں میں لگالیا......! اب فوراً اصل موضوع کی طرف آجاؤ۔ ہاں تو......اب جلدی سے حکیم طولانی اور چچا تندوری سے بوقاف کا پیچھا چھڑاؤ......تاکہ پھر ہمارا اصل مشن شروع ہوسکے۔‘‘

’’وہ تو ہوجائے گا سردار......لیکن مسئلہ ایک اور بھی ہے۔‘‘ مالوط نے کہا۔

’’وہ کیا......؟‘‘ سردار نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

’’کنگ کانگ بھی اب بوقاف کی تاڑ میں ہے۔‘‘ مالوط نے بتایا۔

’’کیا......؟ کنگ کانگ......؟‘‘ سردار اچھل ہی تو پڑا۔

’’جی......‘‘

’’مگر......ایسا کیسے ہوا......؟‘‘

محی الدین نواب کے قلم سے شاہکار ناول
پتھر کا شیشہ
قیمت 150 روپے

’’خود بہ خود......میرا کوئی قصور نہیں ہے۔‘‘ مالوط جلدی سے بولا۔

’’اوہ......‘‘ سردار کے لہجے میں تشویش تھی۔ ’’یہ تو بہت برا ہوا۔ کنگ کانگ سے جان چھڑانا تو بڑا مشکل کام ہے اب......اب کیا ہوگا......؟‘‘

سردار سوچ میں پڑ گیا۔ ایک بار پھر اس کے ہاتھ، خود اسی کے سر پر طبلہ بجانے لگے۔ یہ سردار کے ذہنی ٹینشن کی علامت تھی۔ مالوط اسے خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔

☆......☆......☆

شبن خیراتی نے اپنے دل میں یہ تہیہ کرلیا تھا کہ اب کاؤنٹر پر آنے والوں سے بات چیت کرنے میں قطعی پہل نہیں کرے گا۔ کیونکہ دو مرتبہ اسے ٹھیک ٹھاک قسم کی نصیحت ہوچکی تھی۔ وہ کاؤنٹر پر آنے والوں سے اپنے طور پر اظہار خیال کرتا اور صورت حال اس کے برعکس نکلتی۔ اس کے سر میں ابھی تک ’’دھماکے‘‘ ہورہے تھے۔ کنگ کانگ کے آدمیوں نے اس کی جو ٹھکائی کی تھی، وہ اتنی آسانی سے بھولنے والی نہیں تھی۔

بوقاف کو ہوٹل چھوڑے ہوئے کافی دیر گزر چکی تھی۔ تندور فی الحال عبدل بھائی کے ہینڈاوور تھا۔ عبدل بھائی اسی محلے میں رہتے تھے اور

کچھ دنوں کے لئے تندور سنبھال سکتے تھے، لیکن مستقل طور پر تندور سنبھالنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔

شبن، گاہکوں سے بل وصول کر کے ابھی فارغ ہی ہوا تھا کہ ایک بار پھر دو بدمعاش ٹائپ کے آدمی ہوٹل میں داخل ہوئے۔ وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کاؤنٹر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی شبن چوکنا ہو گیا، بے اختیار ہو کر اس نے اپنی کنپٹیاں سہلائیں۔ اسے گزشتہ ''چماپلیٹ'' یاد آ گئی تھی۔ پھر وہ ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اتنی دیر میں وہ دونوں کاؤنٹر کے قریب آ پہنچے اور دونوں نے کاؤنٹر پر اپنی کہنیاں ٹکا دیں۔ وہ چپ چاپ کھڑے تھے اور خون خوار نظروں سے شبن کو گھور رہے تھے۔

شبن بھی سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی زبان حسب عادت بے چین تھی لیکن بمشکل خود پر قابو رکھتے ہوئے اس نے اپنی زبان کو دانتوں تلے دبا لیا تھا۔ یہ دونوں بدمعاش بھی شاید قسم کھا کر آئے تھے کہ بولنے میں پہل ہرگز نہیں کریں گے۔

عجیب صورت حال تھی، ادھر شبن بے چین تھا کہ یہ کم بخت منہ سے کچھ پھوٹیں، لیکن وہ ''کم بخت'' بھی اس مقابلے میں اس سے پیچھے نہیں تھے۔ وہ بھی صرف اسے گھورے جا رہے تھے۔

آخر کار شبن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا، اس کی زبان نے دانتوں کو ایک زوردار جھٹکا مارا اور آزاد ہو گئی۔ فوراً ہی شبن کے منہ سے نکلا۔

''نہ تو آپ لوگ کھلا لینے آئے ہیں اور نہ ہی آپ کا ارادہ بھتہ لینے کا ہے۔ تو پھر...... آپ دونوں کس لئے آئے ہیں؟''

''تمہیں کیسے معلوم......؟'' ایک بدمعاش نے چونک کر پوچھا اور پھر معنی خیز نظروں سے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔ اس کے ساتھی نے بھی اسی انداز میں گردن ہلائی اور شبن کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''بتاؤ بھئی...... تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ ہم کس ارادے سے آئے ہیں؟''

''بس...... ایسے ہی......'' شبن نے کندھے اچکا دیئے۔ اب انہیں کیا بتاتا......

''ایسے ہی کے بچے......!'' پہلا بدمعاش غرایا۔ ''جلدی بتا......؟''

اب تو شبن کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ ہکلا کر رہ گیا۔ پچھلی ''کٹائی'' کا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔

''ابے بتاتا ہے یا دوں ابھی گھما کے......!'' پہلے بدمعاش نے سیدھے ہاتھ کا مکا بنا کر لہرایا۔ ''تجھے کیسے معلوم ہوا......؟''

شبن کی صورت پر بارہ بجنے لگے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ سب ہی اپنے اپنے مشغلوں میں مصروف تھے۔ بیرا گیر لڑکے بھی گاہکوں کے آرڈر سرو کر رہے تھے۔

ایسے میں شبن کو بوقاف شدت سے یاد آیا۔ خاص طور پر وہ وقت، جب بوقاف نے ٹنگو بدمعاش کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ مارا تھا اور ٹنگو کئی قلابازیاں کھاتا ہوا الٹ گیا تھا۔

بے خیالی میں وہ منظر سوچتے ہوئے خود شبن کا ہاتھ بھی تھپڑ مارنے کے انداز میں اوپر اٹھا۔

''ابے...... مارے گا ہمیں......؟ ہاتھ اٹھائے گا ہم پر......؟ ٹھہر جا......! ابھی تیری دھنائی کرتے ہیں۔'' پہلے بدمعاش نے اس کا اٹھتا ہوا

ہاتھ دیکھ کر دانت پیستے ہوئے کہا۔

خود شبن بھی چونک پڑا۔ اس کے ہاتھ سے جو کچھ ''سرزد'' ہوا تھا، بے خیالی میں ہوا تھا۔ وہ تو بوقاف کو یاد کر رہا تھا۔ لیکن اب کیا ہوسکتا تھا......؟ شبن خیراتی کو بے اختیاری میں کیئے ہوئے پر پچھتانے کا بھی موقع نہ مل سکا۔

ایک بدمعاش کاؤنٹر کے اندر کودا اور شبن کو ''دے مار ساڑھے چار'' کرنے لگا۔ جبکہ دوسرے بدمعاش نے باہر ہی سے شبن کے ''دو اور دو پانچ'' کر دیئے۔

اور جب تک ہوٹل میں موجود دوسرے لوگوں کو خبر ہوتی، شبن خیراتی کا تیا پانچہ ٹھیک ٹھاک ہو چکا تھا۔ ہوٹل کے بیرے اور میزوں کے گرد بیٹھے ہوئے گاہک ''دھائیں دھوئیں'' کی آوازیں سن کر چونکے، اور پھر شبن کا ''حال'' دیکھتے ہی کاؤنٹر کی طرف بڑھے۔

ادھر دونوں بدمعاشوں نے جب اس مجمع کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو شبن کو چھوڑ کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے اور خون خوار نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ مجمع سٹ پٹا گیا۔

''مارو بھئی...... مارو...... اور مارو......'' ایک صاحب نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''ہم لوگ آپ کے کام میں مداخلت کرنے تھوڑی آئے ہیں۔''

''اور کیا......'' ایک اور صاحب نے بھی سر ہلا کر تائید کی۔ ''بلکہ ہم تو سیکھنے کے لئے آئے ہیں کہ گھونسا کہاں پڑنا چاہیے، تھپڑ کہاں مارنا چاہیے اور لات کہاں لگانی چاہیے۔''

''اچھا...... اچھا......'' دونوں بدمعاش خوش ہوتے ہوئے سر ہلا کر بولے اور دوبارہ شبن کی مرمت شروع کر دی۔

''بس...... بس، ہم سیکھ گئے......'' ان ہی صاحب نے جلدی سے کہا۔

دونوں بدمعاشوں نے شبن کو چھوڑ دیا، گویا جاں بخشی کر دی۔ اگر وہ صاحب یہ بات نہ کہتے تو شاید دونوں بدمعاش اسے مار مار کر دنبہ بنا دیتے۔ (جسمانی لحاظ سے شبن ہاتھی تو تھا ہی)

شبن کے حواس بحال ہونے میں تھوڑا سا وقت لگا تھا۔ اس نے اپنی گردن زور زور سے جھٹکی۔ ''ہاں بھئی......'' ایک بدمعاش نے پرسکون انداز میں اسے مخاطب کیا۔ ''اب بتاؤ...... تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ ہم لوگ بھتہ لینے اور کھلا مانگنے نہیں آئے؟''

یہ سن کر شبن کے آنسو نکل آئے۔

''ارے...... تم تو رو رہے ہو۔'' ایک بدمعاش چونکا۔

''کیا کرے بے چارہ......!'' دوسرے بدمعاش نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ''اس غریب کی ہم نے ٹھکائی بھی تو بہت لگائی ہے۔ افسوس......!''

''نہیں......'' شبن نے روتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

''ایں......'' دوسرا بدمعاش چونکا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ ہم نے تمہاری زیادہ ٹھکائی نہیں لگائی......؟''

”نہیں......“شبن نے پھر وہی جواب دیا۔ وہ اب باقاعدہ ہچکیاں لے کر رو رہا تھا۔

”تو پھر......تمہارا مطلب یہ ہے کہ تمہاری ہڈیاں اور مصالحہ مانگ رہی ہیں؟“ پہلے بدمعاش نے پوچھا۔

”نہیں......“شبن کا ایک ہی جواب تھا۔

”ابے......منہ سے پھوٹ تو......“ پہلا بدمعاش جھنجھلا گیا۔ ”بتا تو سہی کہ کیا بات ہے؟“

جواباً شبن نے اپنی ہچکیوں پر قابو پا کر اور آنسوؤں کو پونچھ کر مختصراً انہیں پہلے آنے والے دونوں بندوں کا قصہ سنایا، جو کہ کھلا لینے آئے تھے۔ پھر اس کے بعد شبن نے انہیں ننگو اور پنگو کی کہانی بھی سنا ڈالی۔

دونوں کہانیاں سن کر بدمعاشوں نے خاص اسٹائل سے اپنے ہاتھ اٹھا کر شبن کو ”ٹھوڑے“ کیا۔ ”ابے...... بے وقوف......“ پہلا بدمعاش ہنسا۔ ”ہمیں پہلے ہی بتا دیا ہوتا......ہم تجھے اس طرح تو نہ کوٹتے۔“

”تو پھر کس طرح کوٹتے......؟“شبن نے مسمسی صورت بنا کر پوچھا۔

”لٹا لٹا کر۔“ پہلا بدمعاش جھنجھلا گیا۔ ”ابے......میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ پھر ہم تمہیں نہیں مارتے۔“

”مجھے نہیں مارتے تو پھر کس کو مارتے؟“شبن نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔

”اس سے کام کی بات کر یار......!“ دوسرے بدمعاش نے پہلے بدمعاش کا کندھا جھنجھوڑا۔ ”اور پھر جلدی سے یہاں سے پھوٹ......ورنہ یہ ہمارے دماغ کی چولیں ہلا دے گا۔“

”ہاں......ہاں......اب وہی پوچھ رہا ہوں۔“ پہلا بدمعاش جلدی سے بولا۔ پھر وہ شبن کی طرف گھوما۔ ”ہم کنگ کانگ کے آدمی ہیں۔ تم یہ بتاؤ کہ وہ آدمی کون تھا، جس نے ننگو کی ٹھکائی کی تھی۔“

”وہ......وہ آدمی نہیں تھا۔“شبن کے منہ سے نکلا۔

”ہیں......!“ دونوں چونک اٹھے۔ پھر پہلا بدمعاش بولا۔ ”تو کیا کسی بچے نے اسے مارا تھا؟“

”نہیں......“شبن نے پھر نفی میں سر ہلایا۔

”تو کیا......کسی بڈھے نے......!“ دوسرے بدمعاش نے پوچھا۔

”نہیں......“شبن کا وہی جواب تھا۔

”ابے......تو کیا کسی عورت نے مارا تھا اسے؟“ پہلا بدمعاش بلند آواز سے بولا۔

”نہیں۔“شبن کا اب بھی وہی جواب تھا۔

دونوں بدمعاشوں نے ایک دوسرے کی طرف حیرت بھری نظروں سے دیکھا۔ پھر پہلے بدمعاش نے آگے بڑھ کر شبن کے کان میں سرگوشی کی۔

’’تو کیا اسے کسی ہیجڑے نے مارا ہے؟‘‘

’’نہیں......‘‘ شبن نے پھر گردن ہلا دی۔

دونوں بدمعاشوں کی اب حالت دیکھنے والی تھی۔

’’ابے......اب تو کچھ بھی نہیں بچا...... تجھے اپنے ہوٹل کا واسطہ......‘‘ پہلے بدمعاش نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ’’جلدی سے بتا دے میرے باپ......! کہ انہیں کس نے مارا تھا۔‘‘

’’ارے......میرے بھائیوں......!‘‘ شبن نرم انداز میں گویا ہوا۔ ’’وہ ایک جن تھا، بوقاف نام تھا اس کا، ہاں......‘‘

’’ہوں......‘‘ پہلے بدمعاش نے غور سے شبن کی طرف دیکھا۔ ’’تو وہ جن تھا......؟‘‘

’’ہاں......‘‘ شبن نے جلدی سے سر ہلایا۔

’’کوہ قاف سے آیا ہوگا......؟‘‘ دوسرے بدمعاش نے بھی نرم انداز سے پوچھا۔

’’معلوم نہیں۔‘‘ شبن نے جواب دیا۔ ’’ویسے سپلائی تو وہیں سے ہوتی ہے۔‘‘

’’ہم ابھی بتاتے ہیں کہ سپلائی کہاں سے ہوتی ہے۔‘‘ پہلے بدمعاش نے اطمینان سے جواب دیا اور اپنے ساتھی کی طرف مڑا۔ ’’مارو سالے کو......ہم سے مذاق بھی کر رہا ہے اور ہمارا ٹائم بھی ضائع کر رہا ہے۔‘‘

اور......ایک بار پھر شبن کی ٹھکائی شروع ہوگئی۔ دونوں بدمعاش یک دم ہی اس پر پل پڑے تھے۔

☆......☆......☆

ہمالیہ کی ترائی میں......! اس وقت جو کچھ ہو رہا تھا۔ اگر انسانی آنکھ دیکھ لیتی تو ششدر رہ جاتی۔ یہاں ’’انسدادِ جن گردی‘‘ کی کمیٹی کے زیر اہتمام ’’جن بچاؤ مہم‘‘ کی کانفرنس کا انعقاد ہونے والا تھا۔

چنانچہ اسی اجلاس کے سلسلے میں یہاں اس کمیٹی کی تیاریاں اپنے عروج پر تھیں۔

ہمالیہ کی ترائی......دل کش اور مسحور کن نظاروں سے مزین تھی۔ یہ ایک پیالے نما میدان میں سرسبز و شاداب وادی تھی، جو چاروں طرف سے بنفشی رنگ کے چمکیلے پہاڑوں میں گھری ہوئی تھی۔ ان پہاڑوں کے درمیانی کٹاؤ، کئی اندرونی غاروں کا پتا دے رہے تھے۔ ایک چھوٹی سی آبشار بھی تھی جو وادی کے قریب سے گزر کر تھوڑے فاصلے پر موجود ایک خوبصورت سی جھیل میں گر رہی تھی۔

اس جھیل میں کئی آبی پرندے موجود تھے، جو اس وقت بھی اپنے پروں کو پھڑ پھڑا کر ایک دوسرے سے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔

تو یہ تھی وہ وادی...... جہاں کچھ ہی دنوں بعد ایک بہت بڑی اور اہم کانفرنس ہونے والی تھی۔ جس میں جنوں کے کئی قبیلوں کے سردار شرکت کرنے والے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ ’’انسدادِ جن گردی‘‘ کا ایک اہم رکن یعنی جروش قبیلے سے تعلق رکھنے والا قاقالان، اس وقت بھی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ادھر

سے ادھر دوڑ دھوپ کر تا رہا تھا۔

اس کے ساتھیوں میں وہی لوگ شامل تھے، جو اس کے ساتھ مل کر تمام سرداروں کو کانفرنس کی دعوت دے کر آئے تھے۔ یعنی طوھار، گاسا، جبروش اور اشاق۔

اس وادی کا بیشتر حصہ قدرتی طور پر اونچے، گھنے درختوں اور پھولدار بیلوں سے ڈھکا ہوا تھا، گویا یہ درخت اور بیلیں کسی مکان کی چھت کا کام دے رہی تھیں۔

اسی قدرتی چھت کے نیچے اجلاس منعقد ہونا تھا۔ چنانچہ اس وقت قالان یہاں لائٹنگ کا انتظام کروا رہا تھا۔

طوھار اور گاسا کی ذمہ داری تھی، صفائی ستھرائی کی، جبکہ جبروش اور اشاق کی ذمہ داری میں فرنیچر کا سامان شامل تھا۔ یعنی میز اور کرسیاں وغیرہ۔

کانفرنس کے اختتام پر ہونے والی دعوت کا انتظام بھی خود قالان نے اپنے ذمے لیا ہوا تھا۔ یوں قالان کے کندھوں پر زیادہ بوجھ تھا۔ لیکن اس کے اندر جو جوش اور جذبہ مؤجزن تھا، وہ اسے تھکاوٹ سے قریب نہیں ہونے دے رہا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ جب دوپہر کے وقت کھانے کا دسترخوان بچھایا گیا، تو جبروش نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ''قالان......! تم صبح سے ہم لوگوں کے مقابلے میں دوگنا کام کر چکے ہو، لیکن تمہارے چہرے پر دور دور تک تھکن کا نام و نشان نہیں ہے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو......'' قالان دھیرے سے مسکرایا۔ ''میں دراصل روزانہ گلوکوز پیتا ہوں...... تم لوگ بھی پیا کرو۔''

''لیکن...... وہ تو انسانی مشروب ہے۔'' طوھار نے اعتراض کیا۔

''اب کیا کریں......؟'' قالان نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''مشہور و معروف حکیم تو انسانوں میں ہی گزرے ہیں، اس لئے مجبوری ہے۔''

''لیکن...... ہم لوگ یہاں اسی لئے تو جمع ہو رہے ہیں کہ انسانوں کا بائیکاٹ کریں۔ یہ انسان ہی تو ہے...... جو ہمارے اس اجلاس میں بحث کا موضوع ہے۔ پھر بھی تم انسانوں کی پروڈکٹ کی تعریف کر رہے ہو۔ واہ...... یہ کیا بات ہوئی......؟'' طوھار نے باقاعدہ چھوٹی سی تقریر کر ڈالی۔

جواباً قالان نے کچھ کہنے کے بجائے اپنا کان کھجایا۔ پھر کچھ سوچ کر وہ طوھار کو جواب دینے ہی والا تھا کہ اچانک ایک زبردست قسم کی دلخراش چیخ فضا میں گونجی۔

پانچوں چونک اٹھے اور سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

''کیا مجھے وہم ہوا ہے؟'' قالان کے منہ سے نکلا۔

''نہیں...... چیخ میں نے بھی سنی ہے۔'' طوھار بولا۔

باقی دونوں نے بھی تائید کی۔

''حیرت ہے......'' قالان نے کہا۔ ''یہاں...... اس وادی میں ہم پانچوں کے علاوہ تو اور کوئی بھی نہیں ہے...... پھر یہ کون چیخا تھا......؟''

''آؤ...... دیکھتے ہیں...... میرا خیال ہے کہ چیخ اس طرف سے آئی تھی۔'' گاسا نے ہاتھ اٹھا کر ایک جانب اشارہ کیا۔ سب نے اسی

جانب دیکھا۔ ذرا فاصلے پر ایک غار کا دہانہ تھا۔ شاید وہ چیخ اسی غار سے برآمد ہوئی تھی۔

دفعتاً ایک بار پھر ویسی ہی چیخ فضا میں گونجی اور اب ان پانچوں کو یقین ہو گیا کہ آواز اسی غار سے آئی ہے۔ ''چلو...... دیکھتے ہیں۔'' قالان اٹھ کھڑا ہوا۔

چاروں جنوں نے اس کی تقلید کی اور پھر وہ تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے غار کے دہانے پر آ پہنچے۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ چاروں ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے۔ ''پہلے میں اندر جاتا ہوں۔'' قالان آگے بڑھا۔ ''تم لوگ میرے پیچھے آ جانا۔''

یہ کہہ کر اس نے غار کے دہانے پر قدم رکھ دیا۔ عین اسی وقت ایک حیرت انگیز ترین منظر اس کے ساتھیوں نے دیکھا۔ جیسے ہی قالان نے غار میں قدم رکھا، ایک زناٹے دار تھپڑ کی آواز فضا میں گونجی اور قالان الٹ کر گرا۔

تھپڑ قالان کے گال پر پڑا تھا، لیکن تھپڑ مارنے والا قالان سمیت کسی کو بھی دکھائی نہ دیا۔ البتہ چند ہی لمحوں بعد ایک زوردار قہقہے سے فضا جھنجھنا اٹھی۔ یہ قہقہہ کافی طویل تھا۔

قالان اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا اور غار کے دہانے کو گھورتے ہوئے اپنا گال سہلا رہا تھا۔ دفعتاً قہقہہ تھم گیا اور ایک بھرائی ہوئی گونجدار آواز ان کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

''کان کھول کر سن لو...... یہاں کچھ نہیں ہوگا۔ یہ ہمارا علاقہ ہے۔''

☆......☆......☆

میرے خواب ریزہ ریزہ

جو چلے تو جاں سے گزر گئے جیسے خوبصورت ناول کی مصنفہ ماہا ملک کی ایک اور خوبصورت تخلیق۔ میرے خواب ریزہ ریزہ کہانی ہے اپنے ''حال'' سے غیر مطمئن ہونے اور ''شکر'' کی نعمت سے محروم لوگوں کی۔ جو لوگ اس نعمت سے محروم ہوتے ہیں، وہ زمین سے آسمان تک پہنچ کر بھی غیر مطمئن اور محروم رہتے ہیں۔

اس ناول کا مرکزی کردار زینب بھی ہمارے معاشرے کی ہی ایک عام لڑکی ہے جو زمین پر رہ کر ستاروں کے درمیان جیتی ہے۔ زمین سے ستاروں تک کا یہ فاصلہ اس نے اپنے خوش رنگ خوابوں کی راہ گزر پر چل کر طے کیا تھا۔ بعض سفر منزل پر پہنچنے کے بعد شروع ہوتے ہیں اور انکشافات کا یہ سلسلہ اذیت ناک بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے رستوں کا تعین بہت پہلے کر لینا چاہیے۔

یہ ناول کتاب گھر پر دستیاب ہے، جسے رومانی معاشرتی ناول سیکشن میں پڑھا جا سکتا ہے۔

اس جملے کے بعد خاموشی چھا گئی۔ پانچوں حیرت کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ بولنے والا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر قالان ہی اپنا گال سہلاتے ہوئے بلند آواز میں بولا۔ ”کون ہو تم......؟ سامنے آؤ......“

جواب میں ایک زوردار قہقہہ سنائی دیا اور پھر آواز گونجی۔ ”ہم تمہارے سامنے ہیں، لیکن تمہیں دکھائی نہیں دیں گے۔“

”ہم سے تمہاری کیا مراد ہے؟“

”میں اکیلا نہیں ہوں۔ میرے ساتھ اور بھی میرے ساتھی ہیں۔“

”تم ہو کون......؟ اور دکھائی کیوں نہیں دے رہے؟“

”ہم پونامی شہر کے پرانے کھنڈرات کی بدروحیں ہیں اور اسی لئے تمہیں دکھائی نہیں دے رہیں۔“ جواب ملا۔

”ابھی تو تم نے کہا تھا کہ میں اکیلا نہیں ہوں، روح تو مؤنث ہوتی ہے...... اگر تم بدروح ہو تو تمہیں یہ کہنا چاہئے تھا کہ میں اکیلی نہیں ہوں۔“ گاسا نے اعتراض کیا۔

”میں مردانہ بدروح ہوں۔“ جواب ملا۔ ”اپنے ساتھی سے پوچھو...... اس کے منہ پر مردانہ ہاتھ پڑا ہے کہ زنانہ......!“

”یہ تو ہے......“ قالان نے سر ہلایا۔ پھر وہ بولا۔ ”خیر......! اب یہ بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو؟“

”تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟“ الٹا سوال کیا گیا۔

”ہم یہاں ایک میٹنگ منعقد کرنا چاہتے ہیں، جس میں ہماری قوم کے بڑے بڑے سربراہ شرکت کریں گے۔“

”کس مسئلے کی میٹنگ ہے......؟ کیا ہوگا اس میٹنگ میں؟“ سوال کیا گیا۔

”یہ میٹنگ انسانوں کے خلاف ہوگی۔ ہم انسانوں سے سخت پریشان اور عاجز ہیں۔“

”تم ان سے عاجز اور پریشان ہو اور ہم تم دونوں مخلوق سے پریشان ہیں۔“ بدروح کی آواز گونجی۔ ”ہم لوگ ہزاروں سال سے نہایت اطمینان اور سکون سے پونامی کے کھنڈرات میں رہ رہے تھے، لیکن پھر انسانوں نے ہمیں وہاں سے نکال دیا۔“

”کیسے نکالا......؟“ گاسا نے دلچسپی سے پوچھا۔

”بس...... انہوں نے وہاں کے کھنڈرات ختم کر کے ایک نئے شہر کی بنیاد رکھ دی۔ ہمیں وہاں سے نکلنا پڑا اور ہم بھاگ کر یہاں آ گئے۔ اب تم لوگ ہمیں یہاں سے بھی بھگانا چاہتے ہو۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم تو صرف......“

”بس...... بس رہنے دو ہم یہ چالیں اور دھوکے بازیاں خوب سمجھتے ہیں۔ کان کھول کر سن لو......! اگر یہاں تم لوگوں نے کچھ بھی کیا...... تو ہم سب کو نیست و نابود کر دیں گے۔ کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ سمجھ گئے......! یہ ہماری طرف سے وارننگ ہے...... پہلی اور آخری وارننگ......“

ان الفاظ کے ساتھ ہی بولنے والا خاموش ہو گیا۔ ان پانچوں کو ایسا محسوس ہوا جیسے اب وہاں کوئی نہیں ہے۔

’’ہیلو……!بات سنو……‘‘ قالان نے پکارا۔

لیکن جواب ندارد۔ اب وہاں تھا ہی کون……؟ شاید بدروح واپس غار میں جا چکی تھی۔ یہ پانچوں ہونقوں کی طرح ایک دوسرے کی شکلیں ہی دیکھتے رہ گئے۔

☆……☆……☆

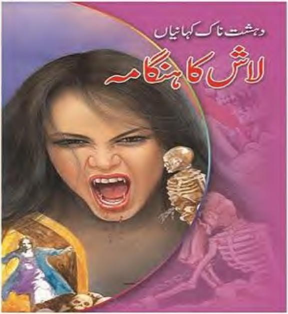
دہشت ناک کہانیاں
لاش کا ہنگامہ

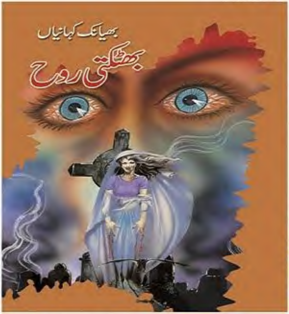
بھیانک کہانیاں
بھٹکتی روح

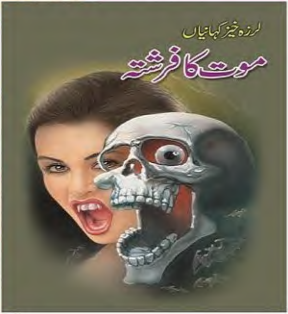
لرزہ خیز کہانیاں
موت کا فرشتہ

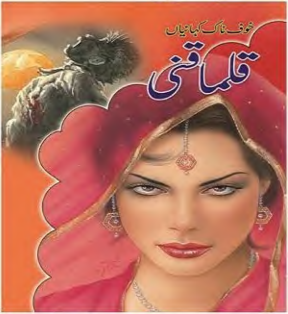
خوف ناک کہانیاں
قلماقنی

یہ واقعی چچا تندوری تھے جو بوقاف کے سامنے کھڑے ہوئے نپے تلے انداز میں اسے دیکھ رہے تھے۔ وہی چچا تندوری، جن سے پہلے بھی دو مرتبہ ٹکراؤ ہو چکا تھا۔ جن کے بارے میں وہ اور مالوط، دونوں ہی تسلیم کر چکے تھے کہ چچا تندوری بذاتِ خود ایک آسیب ہیں۔ ان ہی کے ڈر اور خوف کی بدولت ایک دن بوقاف اور مالوط، برکت صاحب کے گھر سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے اور اب وہی چچا تندوری اس کے سامنے تھے۔

وہ گویا سانسیں روک کر کھڑا ہوا تھا، چہرہ فق تھا۔

”تم......تم مجھے جانتے ہو؟“ چچا تندوری نے نپے تلے انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے معمولی سی حیرت ظاہر کی۔

”آں......ہاں......“ بوقاف چونکا۔ ”آپ کو......آپ کو کون نہیں جانتا......آپ تو بہت مشہور اور معروف ہیں۔“

”کیوں......کیا میں اپنا کونڈا ہوں۔“ چچا تندوری برا مان گئے۔

”ارے......کہاں اپنا کونڈا اور کہاں آپ......وہ تو کچھ بھی نہیں ہے آپ کے آگے......ہاں......“ بوقاف نے جلدی سے بات بنائی۔

چچا تندوری نے برا سا منہ بنایا اور پھر بوقاف کو غور سے دیکھنے لگے۔ ”تمہاری شکل......“

”چنگیز خان سے ملتی ہے......؟“ بوقاف جلدی سے ان کی بات کاٹ کر پُرمسرت لہجے میں بول پڑا۔

”نہیں......بلکہ تمہاری شکل کچھ......“ چچا تندوری نے پھر اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہنا چاہا۔

”کچھ کچھ رومیو سے ملتی ہے......ہے نا......؟“ بوقاف نے پھر ان کی بات کاٹی۔

وہ دراصل ان کا ذہن بٹانا چاہ رہا تھا۔ لیکن مقابل بھی آخر چچا تندوری ہی تھے۔

”نہیں......تمہارا صرف سائڈ پوز کسی سے ملتا ہے۔“

”بھلا کس سے......؟“

”ارے اسی سے جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ البتہ تمہارے چوکھٹے کا فرنٹ مجھے جانا پہچانا سا لگ رہا ہے۔“ چچا تندوری اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے بولے۔

بوقاف یہ سن کر گھبرا گیا۔ جلدی سے بولا۔

”دیکھا ہوگا......مجھے آپ نے یہیں کہیں دیکھا ہوگا۔“

”یہیں کہیں نہیں الو......“ چچا تندوری نے اسے ڈانٹا۔ ”کسی خاص جگہ دیکھا ہے......ارے ہاں......یاد آ گیا۔“ وہ اچانک ہی اچھلے۔

بوقاف کا دل دھک سے رہ گیا۔ چچا تندوری اب معنی خیز نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ پھر ان کے ہونٹ ہلے۔

”تمہیں میں نے برکت صاحب کے گھر میں دیکھا تھا۔ تم......تم وہی ہو نا......“

”وہی......کک......کون وہی......؟“ بوقاف ہکلایا۔

”تمہارا نام بوقاف ہے نا......؟“

''ہاں......ہاں......''

''تو پھر......تم وہی جن ہو...... جو برکت صاحب کی لڑکی پر سوار تھا اور ...... اور تم اور تمہارے دوست نے مجھے الٹا لٹکا کر باندھ دیا تھا۔'' چچا تندوری کا لہجہ بدلنے لگا۔

''کیا کہہ رہے ہو آپ......؟ میں جن کہاں ہوں......؟ میں تو انسان ہوں۔''

''نام کیا ہے تمہارا؟''

''بو......بوقاف......''

''تو پھر......تم جن ہوئے نا......!''

''میرے سر پر سینگ ہیں!'' بوقاف نے سوال کیا۔

''نہیں......سینگ تو نہیں ہیں۔'' چچا تندوری نے غور سے اس کے سر کا جائزہ لیا۔

''تو پھر......اس کے سر پر تو سینگ تھے۔'' بوقاف نے بتایا۔

''تمہیں کیسے معلوم؟'' چچا تندوری کے لہجے میں شک تھا۔

بوقاف یہ سن کر گڑ بڑا گیا، پھر فوراً ہی سنبھل کر بولا۔

''ارے چچا......تم بھی بس......ارے بھائی......! جنوں کے سر پر اگر سینگ نہیں ہوں گے تو کیا دم ہوگی۔ جاؤ یار تم بھی......''

''اچھا اچھا......میں نے مان لیا کہ تم وہ بوقاف نہیں ہو......وہ تو سالا الو کا پٹھا تھا۔'' چچا نے یہ کہتے ہوئے دانت پیسے۔

بوقاف نے انہیں گھور کر دیکھا، بولا کچھ نہیں اور پھر وہ بول بھی کیا سکتا تھا۔ بھلا ان سے کیا پنگا لیتا......؟ جب کہ وہ خود جن تھا، ان سے تو اس وقت بھی ڈر لگتا تھا، پھر اب تو وہ بھی انسان ہی تھا۔

''اب تم جلدی سے میرے ساتھ چلو......'' چچا تندوری اصل موضوع کی طرف آ گئے۔

''آ......آپ کے ساتھ......! مگر کہاں......؟'' بوقاف گھبرا گیا۔

''ابے......انجان مت بن......'' چچا تندوری دلفریب انداز میں مسکرائے۔

''آپ نے انجان کہا ہے یا بے جان......؟'' بوقاف نے انہیں گھورا۔

''دیکھ......سیاڑاں مت بن......مت ٹال باتوں میں......بس چل میرے ساتھ......''

''لیکن......آخر کہاں......؟'' بوقاف جھلا گیا۔

''جنگل میں......اور کہاں......؟'' چچا تندوری نے بتایا۔

''جنگل میں......!'' بوقاف چیخا۔

''ہاں......اور کیا۔'' چچا تندوری نے کندھے اچکائے۔

''لیکن کیوں......؟''

''ابے......تو بھی الو کا پٹھا ہے۔'' چچا تندوری تنگ گئے۔ ''ابے گدھے......! اس مرغی کو جان سے مارنا ہے، جو خطرناک قسم کے انڈے شہر میں سپلائی کر رہی ہے۔''

''مرغی......! انڈے سپلائی کر رہی ہے......؟'' بوقاف بے چارہ اچنبھے میں پڑ گیا۔

''......انڈے دے رہی ہے۔ بس......!'' چچا تندوری نے گویا اس کی مشکل آسان کر دی۔

''کون سی مرغی......کہاں ہے وہ مرغی......؟ کیسے انڈے......؟ ابے چچا......! کیا تم کھسک گئے ہو......؟'' بوقاف کے منہ سے نکلا۔

یہ حقیقت تھی کہ چچا تندوری کی کوئی بات بھی اس کے پلے نہیں پڑ رہی تھی۔ لیکن چچا تندوری کو اس بات کی پرواہ کہاں تھی۔ انہوں نے جھٹ سے اس کی گردن پکڑ لی اور بولے۔

''بہت ہو گئی......اب چل میرے ساتھ......اور نکال کے دے مجھے وہ مرغی......ورنہ ابھی یہیں تجھے مرغا بناتا ہوں۔''

بے چارہ بوقاف سکتے کے عالم میں رہ گیا۔ یہ کیا مصیبت گلے پڑ گئی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو شاید بوقاف جان چھڑا لیتا، لیکن چچا تندوری کی شخصیت تو اس کے حواسوں پر سوار تھی۔ کسی کڑک مرغی کی گردن کی طرح، اس وقت اس کی گردن چچا تندوری کے ہاتھ میں تھی۔ آنے جانے والے لوگ بھی انہیں گھور کر دیکھ رہے تھے۔

''یہ کیا ہو رہا ہے بھئی......؟'' اچانک ایک آواز گونجی۔ دونوں ہی پلٹ پڑے تھے۔

یہ حکیم طولانی کی آواز تھی۔ وہ عقب میں کھڑے ہوئے تیز نظروں سے ان دونوں کو گھور رہے تھے۔

انہیں دیکھ کر چچا تندوری کے ماتھے پر سلوٹیں پڑ گئیں۔

☆......☆......☆

سلیم کا دل باغ باغ ہو رہا تھا۔ آج بہت ہی اچھا موقع ہاتھ لگا تھا۔ آج وہ نہایت اطمینان اور سکون سے اپنی ریہرسل کر سکتا تھا۔ دراصل اس کی والدہ اور والد کسی عزیز کے یہاں دعوت میں جا رہے تھے۔ چونکہ اتوار کا دن تھا، اس لئے وہ خود بھی گھر پر ہی موجود تھا۔ اتوار کو دکان بند ہوتی تھی۔ حالانکہ اس کے والد اور والدہ نے اسے بھی ساتھ چلنے کے لئے اصرار کیا تھا، لیکن اس نے سڑے سڑے سے منہ بنا کر معذرت کر لی۔ اس کا موقف تھا۔

''آپ لوگ ربیعہ آپا کے یہاں جا رہے ہیں اور وہ مجھے قطعی اچھی نہیں لگتیں۔ ایک تو وہ بولتی اتنے زور سے ہیں کہ جیسے سامنے والا بہرا ہو، دوسرے اتنی زور زور سے گردن ہلاتی ہیں کہ دیکھ کر چکر آنے لگتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ ان کے دونوں بچے بہت بدتمیز ہیں۔ بار بار گردن پکڑ کر جھولا جھولتے ہیں۔ چوتھے یہ کہ ان کے گھر میں سے عجیب سی بو آتی ہے، جیسے کچے انڈے سڑ گئے ہوں۔'' سلیم بولتا چلا گیا۔

"اور کچھ......؟" بیگم اشرف نے نتھنے پھلائے تھے۔

"ان کی اور بھی کئی خامیاں ہیں۔" سلیم نے سادہ سے لہجے میں جواب دیا۔ "وہ میں نے اپنی ڈائری میں لکھی ہوئی ہیں۔ ابھی تو صرف یہی یاد تھیں۔"

"اوہ......اچھا۔" اشرف الدین نے گردن ہلائی۔ پھر اسے تیز نظروں سے گھور کر بولے تھے۔ "تم نے اپنی ڈائری میں اور کیا کیا لکھا ہے......؟"

"بہت کچھ ابو جان......"

"یہ بھی لکھا ہے کہ تم گدھے اور احمق ہو؟"

"جی......؟" وہ چونک کر ان کی شکل دیکھنے لگا۔

"پاجی......نالائق......" اشرف صاحب کا پارہ چڑھنے لگا۔ "پہلے میں سمجھتا تھا کہ مہ پارہ جیسی لڑکی تمہیں نہ مل سکی، یہ بہت برا ہوا......لیکن اب میں یہ سوچ رہا ہوں کہ قدرت جو کچھ کرتی ہے بہتر ہی کرتی ہے۔ اس بے چاری کا ہاتھ مانگنے ہم سب گئے تھے، لیکن شاید اس کی قسمت ہی اچھی تھی کہ وہ تمہیں نہیں ملی۔ تم جیسے گدھے کے لئے تو کوئی گدھی......"

"کیا اول فول بک رہے ہیں......؟" بیگم اشرف نے دخل دیا۔ "میرے بیٹے میں آخر برائی کیا ہے......؟"

"اس میں واقعی کوئی برائی نہیں ہے۔" انہوں نے اتفاق کیا۔ "جب ہی تو یہ دوسروں کی برائیاں اپنی ڈائری میں لکھتا ہے۔"

"آپ اس کی بات مت کریں ابو جان......!" سلیم جوش میں بولا۔ "وہ گدھی......مم میرا مطلب ہے کہ مہ پارہ کی شادی مجھ سے ہو گی......صرف اور صرف مجھ سے......ہاں......"

"تم صرف نام کے سلیم نہیں ہو......بلکہ کام کے بھی سلیم ہو۔" اشرف صاحب نے گردن ہلائی۔ پھر وہ اپنی بیگم کی طرف مڑے۔ "چلو بیگم......! تم تو چلو......اسے اکیلے میں پلاؤ پکانے دو۔"

"پلاؤ......!" سلیم نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں......" وہ اطمینان سے بولے۔ "خیالی پلاؤ......"

یہ کہہ کر وہ اور ان کی بیگم کمرے سے نکل گئے۔ سلیم نے ایک لمبی سانس لی، سر جھٹک کر باپ کی باتوں کو ذہن سے نکالا اور دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑتے ہوئے اپنے "پلان" پر غور کرنے لگا۔

"ٹھیک ہے......بس یہی موقع اچھا ہے۔" وہ زیر لب بڑبڑایا۔

پھر اس نے سوچا کہ دروازے کی کنڈی لگا دی جائے، تاکہ اطمینان سے ریہرسل ہو سکے۔ یہ سوچ کر وہ کمرے سے نکل آیا۔

وہ دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ "اس وقت کون آ گیا......!" سلیم نے جھلا کر سوچا اور جھٹ سے دروازہ

کھول دیا اور پھر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

کیا دیکھتا ہے کہ سامنے وہی بزرگ کھڑے ہیں، جو اسے راستے میں ملے تھے، روایتی بزرگ...... اور شعلہ بار آنکھوں سے اسے گھور رہے ہیں۔

سلیم ٹپٹا گیا۔ دفعتاً بزرگ غصے کے عالم میں گرجے۔ ''ابے گدھے، نالائق...... احمق...... پاجی......! یہ سب کیا کر رہا ہے؟ کیا تیرے اسکرو ڈھیلے ہیں......؟''

''حیرت ہے......'' سلیم بڑبڑایا اور بزرگ کو غور سے دیکھ کر بولا۔ ''ابھی ابھی ابو جان نے بھی یہی گالیاں دی تھیں۔''

''مجھے اور بھی گالیاں آتی ہیں......'' بزرگ نے سر ہلایا۔ ''مثلاً تیری......''

''بس...... بس...... بابا جی...... میں سمجھ گیا۔'' وہ جلدی سے ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ''لیکن یہ تو بتائیں کہ آپ مجھے گالیاں کیوں دے رہے ہیں؟''

''یہ تو کیا کرتا پھر رہا ہے؟''

''کک...... کیا کر رہا ہوں؟''

''مجھ سے پوچھتا ہے...... بدبخت......! کیا تو کسی ڈرامے میں کام کرے گا، جو ریہرسل کر رہا ہے؟''

''اوہ......'' سلیم چونک اٹھا۔

''اوہ کے بچے......! آئندہ یہ حرکت مت کرنا، ورنہ تجھے کے ایم سی والے اٹھا کر لے جائیں گے۔ وہ تجھے اپنی گاڑی میں ڈالیں گے اور چلتے بنیں گے۔''

''معاف کیجئے گا بابا جی۔'' سلیم نے ٹوکا۔ ''کے ایم سی والے تو کچرا اور کتے اٹھاتے ہیں...... مرے ہوئے کتے......''

''جا معاف کیا......'' بابا نہ جانے کیا سمجھے۔ ''اب وہ تجھے اٹھا کر نہیں لے جائیں گے۔''

سلیم کا منہ بن گیا۔ بزرگ نے اس بات کو محسوس کر لیا اور بولے۔

''شکل تو تو نے ویسی ہی بنالی ہے، جسے وہ اٹھا کر لے جاتے ہیں...... خیر...... تیری شکل ہے...... مجھے کیا......! میں تجھ سے یہ کہنے آیا ہوں کہ اس مخصوص وقت کے علاوہ تجھے قطعی چیخنے اور چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تجھے اب یہ کام صرف مہ پارہ کے گھر کے سامنے ہی کرنا ہے۔ خبردار......! اگر اب اس وقت کے علاوہ کہیں اور یہ بکواس کی......''

اور یہ کہہ کر بزرگ ''چھو'' ہو گئے۔

☆......☆......☆

ان کی نظروں کو محسوس کرتے ہوئے حکیم طولانی بول اٹھے۔ ''ایسے کیوں دیکھ رہے ہو تندوری......؟ بقول شاعر

ظالم نظروں سے نہ یوں مجھ کو دیکھو، مر جاؤں گا

''اس موقع محل کے لئے تو یہ شعر نامناسب ہے۔'' بوقاف نے دخل دیا۔ ''آپ کو یہ کہنا چاہیے۔''

ایسے نہ مجھے تم دیکھو، سینے سے لگالوں گا''

''اگر میں نے انہیں سینے سے لگالیا......'' حکیم طولانی نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ''تو خود میری دوائیں بھی مجھ پر اثر نہیں کریں گی۔ یہ نہاتے ہی نہیں ہیں۔''

''اوہ......'' بوقاف کے منہ سے نکلا، ساتھ ہی اس نے اپنی ناک دبائی۔

''آپ یہاں کیسے حکیم صاحب......؟'' چچا تندوری نے شاید ان کا ریمارک سنا نہیں تھا۔

''یہ......یہ بوقاف ہے نا......؟'' حکیم صاحب نے بوقاف کی طرف اشارہ کرکے الٹا سوال کیا۔

''ہاں......ہے تو یہ بوقاف ہی......'' چچا تندوری نے سر ہلایا۔

''شکر ہے......'' حکیم صاحب کے چہرے پر اطمینان پھیل گیا۔ ''میں ہوٹل میں گیا تھا، وہاں سے معلوم ہوا کہ بوقاف ابھی ابھی ہوٹل سے نکلا ہے۔ میں نے تمہیں دیکھا اور ادھر چلا آیا۔ چلو......قسمت اچھی تھی کہ یہ یہیں مل گیا۔''

یہ کہہ کر وہ بوقاف کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر بولے۔ ''چلو بھئی......''

''کہاں......'' بوقاف چونکا۔

''بھئی......میرے مطب......اور کہاں۔'' حکیم طولانی نے مختصر جواب دیا۔

''لیکن......میں تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ آپ مجھے اپنے مطب میں کیوں لے کر جارہے ہیں؟''

''میں خود ٹھیک ٹھاک نہیں ہوں۔'' حکیم طولانی کے چہرے پر افسردگی چھا گئی۔ ''اسی لئے تمہیں لے جارہا ہوں۔ تمہیں اپنی غزلیں سناؤں گا۔ ایک تم ہی تو ہو......جو میری غزلیں سن سکتے ہو......!''

وہ افسردہ ہوگئے تھے۔ پھر انہوں نے بوقاف کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے جانے لگے۔ فوراً ہی چچا تندوری آگے بڑھے۔

''کیا کررہے ہو حکیم صاحب......! یہ تو میرے ساتھ جنگل میں جائے گا۔ تاکہ میں اس مرغی کا خاتمہ کرسکوں، جو سارے انڈے سپلائی کررہی ہے۔'' چچا تندوری نے بوقاف کا دوسرا ہاتھ تھام لیا۔

''مرغی......کون سی مرغی......؟'' حکیم طولانی نے حیرت سے پوچھا۔

''یہی میں بھی ان سے پوچھ رہا تھا۔'' بوقاف نے مسمسی صورت بنا کر ٹانگ اڑائی۔ چچا تندوری اسے گھور کر رہ گئے۔ بولے کچھ نہیں۔

''اچھا خیر......'' تھوڑی دیر بعد حکیم طولانی خود ہی بولے۔ ''وہ مرغی ہو یا مرغا......اس کی ایسی کی تیسی......بوقاف میرے ساتھ جائے گا۔''

''اپنا غصہ خراب ہے حکیم صاحب......!'' چچا تندوری کے تیور بدلے۔ ''پہلے......سالی......وہ مرغی دنیا سے جائے گی۔''

''سمجھا کرو تندوری......پہلے مجھے اپنی غزلیں......''

''بھاڑ میں گئیں تمہاری غزلیں......'' چچا تندوری نے خود بھی بھاڑ جیسا منہ کھولا۔

''بس تو پھر تمہاری مرغی بھی بھاڑ میں گئی۔''

اتنی دیر میں ان کے ارد گرد مجمع لگ چکا تھا۔ بوقاف عجیب الجھن میں گرفتار تھا۔

''لیکن میں کہاں جاؤں......!'' بوقاف منمنایا۔

''بھاڑ میں......'' مجمع میں سے کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

بوقاف بھنا کر پلٹا...... مجمع میں دوسرے لوگ بھی ہوں گے، لیکن بوقاف نے اپنے ارد گرد عجیب قسم کے آدمیوں کو پایا۔

ان کے چہروں پر وحشیانہ سی مسکراہٹ تھی۔

''آپ کی تعریف......؟'' بوقاف نے باری باری انہیں دیکھا۔

''اپنی تعریف کا سٹیفکیٹ ہم ساتھ لئے پھرتے ہیں......'' یہ کہہ کر کندھے پر ہاتھ مارنے والے نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پستول نکال لیا۔ اس کے باقی ساتھی بھی اب خالی ہاتھ نہیں تھے۔ کئی پستولوں نے بوقاف کی طرف رخ کر لیا۔

ان بدمعاشوں کے علاوہ اور جتنے لوگ وہاں موجود تھے، اسی وقت کائی کی طرح چھٹ گئے۔

ادھر حکیم طولانی کی ٹانگیں، اتنے سارے پستول دیکھ کر لرزنے لگی تھیں جبکہ چچا تندوری خون خوار نظروں سے ان بدمعاشوں کو گھور رہے تھے۔

بوقاف اس صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دفعتاً چچا تندوری ان بدمعاشوں کی طرف دیکھ کر گرجے۔

''کون ہو بے تم لوگ......؟''

''ابے او چھوئی موئی......!'' وہی بدمعاش پھنکارا۔ ''اپن کا تیرے سے واسطہ نہیں ہے ہاں...... ایک منٹ میں کھلاس کر ڈالے گا......کیا......؟''

''ابے او......!'' چچا تندوری بھی کہاں کم تھے۔ ''انڈیا کی تھرڈ کلاس فلم کے ولن...... ذرا ہوش میں رہ کر بات کر ہاں......''

ان کے اسٹائل نے بدمعاش اور اس کے ساتھیوں کو چونکا دیا۔ بدمعاش نے چچا تندوری کو غور سے دیکھا۔

''کیا تم بھی بدمعاش ہو......؟'' اس نے پوچھا۔

''گالی مت دے بے......'' چچا تندوری جیسے ہتھے سے اکھڑ گئے۔ ''میرا معاش حلال ہے...... بڑی محنت سے روزی کماتا ہوں میں ...... ہاں......''

''بھئی...... آخر مسئلہ کیا ہے؟'' حکیم طولانی نے بھی ہمت کر کے زبان کھولی۔

''ہمیں...... یہ بندہ چاہئے۔ ہم اسے لے جانے آئے ہیں۔'' بدمعاش نے بوقاف کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ تمہاری بھینس لے کر بھاگا ہے؟'' چچا تندوری کا لہجہ طنزیہ تھا۔

''بہت بول رہے ہو بڑے میاں......!'' بدمعاش نے انہیں گھورا۔ ''یہ دیکھ رہے ہو......؟ ہمارے ہاتھوں میں کھلونے نہیں ہیں۔''

’’ابے مجھے پستولوں سے ڈرا رہا ہے......؟‘‘ چچا تندوری نے آنکھیں نکالیں۔ ’’چلا پستول...... چلا......‘‘

یہ کہہ کر وہ سینہ تان کر کھڑے ہو گئے۔

’’ابے...... یہ کون سی فلم گلے پڑ گئی......؟‘‘ بدمعاش دھیرے سے بڑبڑایا۔ پھر وہ اپنے ساتھیوں کی طرف مڑا۔

’’کیوں بھئی...... کسی کے پستول میں گولیاں ہیں......؟‘‘

’’نہیں استاد......‘‘ سب نے نفی میں سر ہلا دیا۔

’’ابے دیکھو تو......‘‘ وہ چیخا۔

’’کہاں ہے گولی استاد......!‘‘ اس کے ایک ساتھی نے منہ بنا کر کہا۔ ’’تمہارے پستول کی طرح ہمارے پستول بھی خالی ہیں۔ صبح تم ہی تو کہہ رہے تھے کہ زہر کھانے کے بھی پیسے نہیں ہیں، تو گولیاں کہاں سے آئیں گی۔‘‘ عین اسی وقت چچا تندوری کا فلک شگاف قہقہہ سنائی دیا۔

☆......☆......☆

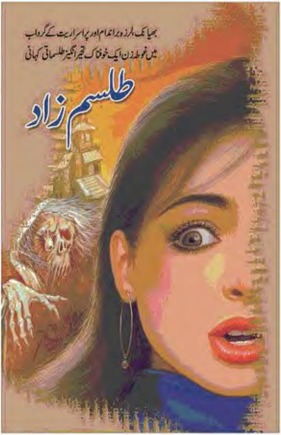
بھیانک، لرزہ براندام اور پراسراریت کے گرداب
میں غوطہ زن ایک خوفناک تحیر انگیز طلسماتی کہانی
طلسم زاد

زندگی کے نشیب و فراز کی پر پیچ اور پر آشوب پگڈنڈی پر
رواں دواں دل گداز، دل گرفتہ و خونچکاں، تحیر انگیز کہانی
بھنور

قالان...... اس وقت اپنے قبیلے کے سردار کے سامنے پریشان بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سردار کا نام قماطہ تھا۔

"کیا ہوا قالان......؟ کیا تمہارے سینگوں میں کسی قسم کی کوئی تکلیف ہو رہی ہے......؟" قماطہ نے دریافت کیا۔

"کاش یہی ہوتا......" قالان نے سر اٹھا کر ایک طویل سانس لی۔

"تو پھر...... بتاؤ...... کیا بات ہے؟"

"کیسے بتاؤں سردار......؟"

"ہمارے خیال سے تو تمہیں منہ سے ہی بتانا چاہیے۔ باقی تمہاری مرضی ہے۔" قماطہ نے لاپروائی سے کہا۔

"سردار...... آپ سمجھ نہیں رہے۔" وہ نہ جانے کیوں جھنجھلا گیا۔

"ہاں تو...... اب یہ بتاؤ کہ مسئلہ کیا ہے؟"

قالان نے اسے ہمالیہ کی ترائی میں ہونے والے واقعے کی تفصیل بتا دی۔

قماطہ خاموشی سے سنتا رہا۔ اس کی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ قالان کی داستان ختم ہونے کے بعد اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔

"ہوں...... یہ تو واقعی بڑی تشویش ناک صورت حال ہے۔"

"صرف تشویش ناک نہیں سردار، بلکہ حد درجے تشویش ناک...... کیونکہ تمام سرداروں کو دعوت دی جا چکی ہے اور اب ہم پر لازم ہے کہ میٹنگ کروائیں۔ ورنہ بڑی سبکی ہوگی۔"

"جگہ بدل دو......" قماطہ نے مشورہ دیا۔ "بدروحوں سے لڑنا ٹھیک نہیں...... میں نے تو جب سے "ایول ڈیتھ" فلم دیکھی ہے، تب سے ہی مجھے تو بدروحوں سے خوف آنے لگا ہے۔ بدروحوں کے خوف سے خود میری روح بھی لرزنے لگتی ہے۔"

"آپ نے کیا یاد دلا دیا۔" قالان نے جھرجھری لی۔ "ایول ڈیتھ...... ویری ہارر...... اف! توبہ......"

"جب ہی تو کہہ رہا ہوں کہ جگہ بدل دو۔ اس مسئلے کا یہی حل ہے۔" قماطہ نے کہا۔

"یہی تو مشکل ہے سردار......" قالان بے چارگی کے عالم میں بولا۔ "اب یہ قطعی ناممکن ہے۔ کیونکہ تمام سرداروں کو اسی جگہ کی دعوت دی گئی ہے۔"

"پھر...... اب کیا ہوگا......؟" قماطہ الجھن میں نظر آ رہا تھا۔

"اب میں آپ سے پوچھوں۔" قالان نے محتاط لہجے میں دریافت کیا۔

"کیا......؟" قماطہ چونکا۔

"یہی کہ کیا آپ کے سینگوں میں کسی قسم کی کوئی تکلیف ہو رہی ہے۔" قالان نے آخر کہہ ہی دیا۔

جواباً قماطہ نے خاموشی سے اسے تیز نظروں سے گھورا۔ قالان اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔

”کچھ کریں سردار...... ورنہ......“ قالان کہتے کہتے رک گیا۔

”ہاں...... میں کچھ کرتا ہوں۔“ قماطہ نے سر اٹھایا۔

”بیٹھے...... بیٹھے......؟“ قالان کے لہجے میں حیرت تھی۔

”نہیں یار......“ قماطہ جھنجھلا گیا۔ ”میں ابھی کوہ قاف سے رابطہ کرتا ہوں، شہنشاہِ جنات ہی بتائیں گے کہ اس مسئلے کا کیا حل ہو سکتا ہے۔“

یہ کہہ کر قماطہ نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل نکالا اور کسی کے نمبر پریس کرنے کے بعد موبائل کان سے لگا لیا۔

”ہیلو...... جی...... آداب عرض ہے شہنشاہِ جنات......“ رابطہ ملنے کے بعد اس نے کہا۔ ”میں قماطہ بول رہا ہوں...... جی...... جی۔“

علیک سلیک کے بعد اس نے موبائل پر قالان کے ساتھ پیش آنے والے تمام واقعے کی تفصیل سنا دی۔ پھر وہ دوسری طرف کی بات سنتا رہا اور ”جی...... جی“ کرتا رہا۔ قالان اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔

پھر قماطہ نے دوسری طرف کی بات مکمل ہوتے ہی خدا حافظ کہا اور موبائل آف کر دیا۔ اس کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار تھے۔

”کیا ہوا سردار......؟ شہنشاہِ جنات نے کیا فرمایا ہے......؟“ قالان نے پوچھا۔

”آں......!“ قماطہ چونکا۔ پھر بولا۔ ”انہوں نے تو بڑی عجیب بات بتائی ہے۔“

”کیا......؟“ قالان بے چین ہو گیا۔

انہوں نے کہا۔ ”ایک ہی انسان ہے، جو ان بدروحوں کو بھگا سکتا ہے......“

”انسان......!“ قالان کے منہ سے نکلا۔

”ہاں...... انسان۔ وہ قصبہ نورس کا رہائشی ہے۔“

”کون ہے وہ......؟“ قالان نے پوچھا۔

”اس کا نام...... چچا تندوری ہے۔“ قماطہ نے بتایا۔

”چچا...... تندوری......!“ قالان کے منہ سے نکلا۔

”ہاں...... چچا تندوری...... شہنشاہِ جنات نے کہا ہے کہ صرف وہی ان بدروحوں کو بھگا سکتا ہے۔ یہ اور کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔“

”لیکن سردار...... ہماری میٹنگ تو خود انسانوں کے خلاف ہے، پھر ہم خود ایک انسان سے مدد لیتے ہوئے اچھے لگیں گے......؟“ قالان نے اعتراض کیا۔

”اب کیا کریں......؟“ قماطہ کے انداز میں بے چارگی تھی۔ ”شہنشاہِ جنات کا حکم ہے...... ماننا پڑے گا۔“

پھر دونوں ہی اپنی اپنی سوچوں میں ڈوب گئے تھے۔ آخر کار قالان نے اس سکوت کو توڑا۔ ”اب مجبوری ہے سردار...... میرا خیال ہے کہ

چچا تندوری کو یہاں لانا پڑے گا۔ کیونکہ ہمارے پاس وقت بھی کم ہے۔"

"ہوں...... تم ٹھیک کہتے ہو......" سردار نے سر ہلایا۔ "میں ابھی بلواتا ہوں چچا تندوری کو......"

☆......☆......☆

ادھر چچا تندوری کا قہقہہ گونجا اور ادھر وہ بدمعاش جھینپ کر اپنے ساتھیوں کی طرف مڑا۔ "کروادی نا بے عزتی......! مل گیا سکون......! پڑ گئی کلیجے میں ٹھنڈک......؟"

"استاد......! ہمارا کیا قصور ہے......؟" اس کا ایک ساتھی منہ بنا کر بولا۔ "یاد ہے......! پرسوں آپ کو کتنا سمجھایا تھا کہ ہمارے اسٹاک میں صرف ایک گولی ہے۔ اسے نہ ماریں...... نہ ماریں...... لیکن آپ نے ایک نہ سنی اور اس بے چارے کو خواہ مخواہ مار ڈالا...... گولی بھی ضائع ہوئی اور فائدہ بھی کچھ نہ ہوا۔"

"کسے مار ڈالا تمہارے استاد نے......؟" حکیم طولانی کے کان کھڑے ہو گئے۔

بوقاف بھی چونکا تھا۔ خود چچا تندوری نے بھی یہ بات سن کر اپنی ہنسی کو بریک لگا لیا تھا۔

"تھا ایک موٹا سا چھچھوندر......" اسی نے بتایا۔ "ہم لوگ منع کر رہے تھے کہ استاد اپنی آخری گولی مت ضائع کرو...... کسی کام ہی آئے گی، چھچھوندر کا کیا ہے......! وہ تو اینٹ سے بھی مر جائے گا۔ لیکن انہوں نے ایک نہ سنی۔"

یہ سنتے ہی ایک بار پھر چچا تندوری کو ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ اب تو حکیم طولانی بھی منہ دبا کر اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ دراصل وہ خوف زدہ بھی تو تھے۔

"اوئے......" دفعتاً استاد گرجا۔ "بند کرواپنے یہ گندے اور پیلے دانت......! ہم کنگ کانگ کے آدمی ہیں۔ کوئی چڑیا گھر کے بندر نہیں ہیں، جو تم ہمیں دیکھ کر ہنس رہے ہو۔"

"کنگ کانگ......!" بوقاف چونک اٹھا۔ "یہ نام پہلے بھی سنا ہے۔"

"اس نام کی گونج تو پورے شہر میں ہے۔ اچھا...... اب باتیں مت بناؤ اور سیدھی طرح ہمارے ساتھ چلو ورنہ بھون کر رکھ دیں گے۔" استاد نے اصل بات کی۔

"خالی پستولوں سے......؟" چچا تندوری نے مضحکہ اڑایا۔

"نہیں......" استاد سنجیدہ تھا۔ "ہم جس گاڑی میں آئے ہیں، اس میں چولہا بھی موجود ہے۔ میری بیوی نے منگوایا تھا۔ اسی مارکیٹ سے خریدا ہے۔"

"کتنے کا خریدا......؟" حکیم طولانی نے رواروی میں پوچھا۔

"دکان دار نے تو بہت مہنگا بتایا تھا۔" استاد نے تفصیل بتائی۔ "لیکن جب ہم لوگوں نے پستول دکھائے تو اس نے ہمیں چولہا تحفے میں

دے دیا۔“

”مالِ مفت......دلِ بے رحم......“ حکیم طولانی دھیرے سے گنگنائے۔

”کیا......کیا کہہ رہے ہو......؟“ استاد چونکا۔

”کک کچھ نہیں......“ حکیم طولانی گڑبڑا گئے۔

”چلو بھئی......پکڑو اس کو......اور اٹھا کر گاڑی میں ڈال دو۔“ استاد نے اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

اشارہ بوقاف کی طرف تھا۔

”یہ میرے ساتھ جائے گا......اسے کوئی نہیں لے جا سکتا۔“ چچا تندوری خم ٹھونک کر آگے بڑھے۔

”ہٹ جاؤ ہمارے راستے سے......کیوں اپنی جان کے دشمن ہو رہے ہو......“

استاد نے سمجھایا۔ ”اپنی حالت دیکھو......اور ہماری تعداد دیکھو......“

”رات کو بستر پر بھی کافی تعداد میں مچھر ہوتے ہیں۔“ چچا تندوری نے آگاہ کیا۔ ”میں انہیں مارتا رہتا ہوں، گنتا نہیں ہوں۔“

”ہمیں مچھر کہہ رہے ہو......؟“ استاد کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ ”تمہاری یہ جرأت......! اسے تو ہم بعد میں اٹھائیں گے...... پہلے تمہاری ٹھکائی کر دیں۔“

یہ کہہ کر استاد نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ فوراً ہی اس کے ساتھی آگے بڑھے۔

حکیم طولانی نے ڈر کے مارے سائیڈ پکڑ لی۔ بوقاف ہکا بکا رہ گیا۔ ادھر بدمعاشوں نے چچا تندوری کے گرد گھیرا ڈال دیا۔

اور اس سے پہلے کہ بوقاف آگے بڑھتا، وہ سارے بدمعاش چچا تندوری پر ٹوٹ پڑے۔ بوقاف کو موقع ہی نہیں مل سکا کہ وہ چچا تندوری کے لئے کچھ کر سکتا......

چچا تندوری تو اب دکھائی ہی نہیں دے رہے تھے۔ ان بدمعاشوں کا گھیرا تھا اور ان کے گھونسے، مکے اور لاتیں چلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔

بوقاف نے بے چین ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ حکیم طولانی رفو چکر ہو چکے تھے اور بدمعاشوں کو دیکھ کر علاقے والے بھی دور سے کھڑے ہوئے صرف تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ درجن بھر بدمعاشوں کا سامنا کر سکیں۔

ٹھیک ٹھاک قسم کی ”چھپا پلیٹ“ جاری تھی۔ بوقاف نے اندازہ کر لیا تھا کہ چند منٹوں کے اندر ہی چچا تندوری کی ”قل شریف“ اور فاتحہ کا انتظام یقینی ہے۔

دفعتاً بدمعاشوں کے درمیان میں سے ایک زوردار اور کڑک دار آواز گونجی۔

”ابے بدبختو......مجھے کیوں مار رہے ہو......“

یہ آواز استاد کی تھی۔ بوقاف نے چونک کر بدمعاشوں کے گھیرے کی طرف دیکھا۔ ادھر سارے بدمعاشوں کے ہاتھ اور پاؤں مشینی انداز

میں رک گئے اور پھر وہ سب گھبرا کر پیچھے ہٹے۔

اور پھر بوقاف نے جو کچھ دیکھا، وہ انتہائی حیرت انگیز تھا۔ چچا تندوری وہاں موجود نہیں تھے، اور ان کی جگہ جس کی درگت اب تک بن رہی تھی۔ وہ ان بدمعاشوں کا استاد تھا۔

چچا تندوری سمجھ نہیں پائے تھے کہ ان کے ساتھ ہوا کیا ہے...... وہ تو حکیم طولانی کے قریب کھڑے ہوئے تھے۔

استاد اور اس کے چیلے چماٹے جب ان کی طرف بڑھے تو عین اسی وقت انہیں ایک زوردار جھٹکا لگا۔ یہ جھٹکا اتنا شدید تھا کہ سہارا لینے کے لئے انہوں نے حکیم طولانی کا کندھا مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اور پھر...... ایک دھند کی چادر تھی، جو ان کی آنکھوں پر چھا گئی تھی۔ انہیں اردگرد کا قطعی ہوش نہ تھا۔

بوقاف...... استاد اور اس کے چیلے...... گویا اس دھند میں کھو کر رہ گئے تھے۔ صرف حکیم طولانی کا کندھا ان کے ہاتھ میں تھا۔ جسے وہ محسوس کر سکتے تھے۔

''یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے......؟'' انہوں نے اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو پھاڑتے ہوئے سوچا۔

لیکن اپنے اس سوال کا جواب نہ ملا۔ دھند...... دھند اور صرف دھند...... اس دھند کا خمار اتنا تھا کہ ان کی پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں۔

''استاد اور اس کے چیلے کہاں ہیں......؟ انہوں نے اب تک میرا بھرکس کیوں نہیں نکال دیا......؟ مار مار کر مجھے دنبہ کیوں نہیں بنا دیا......؟ اور...... اور وہ جھٹکا کیسا تھا......؟''

چچا تندوری یہ سب سوچ ہی رہے تھے کہ ایک اور زوردار جھٹکا لگا۔ ساتھ ہی ان کی آنکھوں کے آگے سے دھند چھٹ گئی۔

آہستہ آہستہ انہیں منظر دکھائی دینے لگا۔ ان کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ پھر بھی انہوں نے آنکھیں پھاڑنے کی بھرپور کوشش کی۔

اور پھر انہیں ایک عجیب سا منظر دکھائی دیا۔ یہ وہ جگہ ہرگز نہیں تھی، جہاں وہ بدمعاشوں سے بھڑے تھے۔

حکیم طولانی آنکھیں بند کئے ہوئے ان کے برابر میں کھڑے تھے اور ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بدبدا رہے تھے۔ ان کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔

یہ ایک کمرہ نما جگہ تھی، جس کے چاروں طرف پردے لگے ہوئے تھے۔ ان پردوں کے عقب میں اگر کوئی دروازہ ہو تو کہا نہیں جا سکتا تھا۔ بہ ظاہر تو ان پردوں کے علاوہ اور کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

چچا تندوری نے حکیم طولانی کو ٹھوکا دیا۔

''اماں...... آنکھیں کھولو حکیم صاحب......''

''نہیں......'' وہ آنکھیں کھولے بغیر بولے۔ ''میں چچا تندوری کو مرغا بنتے نہیں دیکھ سکتا......''

''مرغا......!'' چچا تندوری نے ان کے گال پر ایک جھانپڑ رسید کر دیا۔ ''کچھ اور نہیں سوجھا تمہیں...... مرغے کے علاوہ......!''

حکیم طولانی نے جھانپڑ پڑتے ہی گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ ''مم...... مم...... کک...... کک......'' ان کے منہ سے لایعنی آوازیں نکلیں۔

''یہ کون سی بولی ہے......؟'' چچا تندوری حیرت سے بولے۔ ''میں نے کسی جانور کو بھی یہ کہتے ہوئے نہیں سنا......''

’’اتنی سی بات پر تم نے مجھے جانوروں سے ملا دیا......‘‘ حکیم طولانی برا مان گئے۔ ’’بھئی...... یہ الفاظ اس وقت منہ سے نکلتے ہیں، جب کسی بات پر حیرت ہو رہی ہو۔ دیکھو نا......! میں کتنا بھیانک خواب دیکھ رہا تھا کہ بہت سارے بدمعاش مل کر تمہاری......‘‘

’’اماں...... وہ خواب نہیں تھا۔ سچ مچ کا لفڑا تھا۔‘‘ چچا تندوری نے منہ بنایا۔

’’ایں...... تو پھر...... یہ......‘‘ حکیم طولانی نے چونک کر چاروں طرف دیکھا۔

’’اور یہ کوئی دوسرا لفڑا ہے۔‘‘ چچا تندوری نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔

حکیم طولانی نے ہکا بکا ہو کر ان کی طرف دیکھا۔ عین اسی وقت سامنے والا پردہ ہلا۔ دونوں نے چونک کر ادھر دیکھا اور پھر پردے کے عقب میں سے جو شخصیت سامنے آئی، اسے دیکھ کر حکیم طولانی کے منہ سے دل دوز قسم کی کئی چیخیں نکل گئیں۔

☆......☆......☆

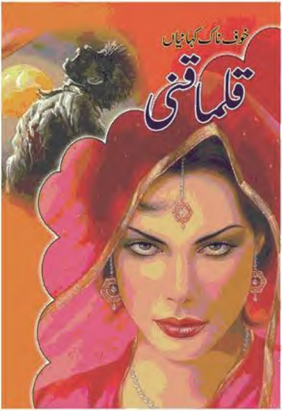

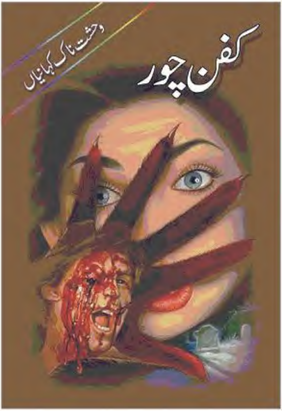

استاد کا بہت برا حال تھا۔ اس کے جسم کے کئی حصوں سے خون نکل رہا تھا، کپڑے بھی پھٹ گئے تھے۔ اس کا تھوبڑا سوجا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے درندہ صفت ساتھیوں نے اس کے بالوں کو بھی نہیں بخشا تھا۔

استاد بہ مشکل کھڑا ہو سکا تھا، جو ٹھکائی ہوئی تھی، اسی کے نتائج چہرے پر بھی تکلیف کی صورت میں نمایاں تھے۔

ادھر اس کے ساتھیوں کے چہرے دھواں دھواں ہو رہے تھے۔ انہیں قطعی نہیں معلوم تھا کہ وہ جسے ''دھونک'' رہے ہیں۔ وہ خود ان کا استاد ہے۔ وہ تو اس سنکی بڈھے پر ٹوٹے تھے...... لیکن وہ سنکی بڈھا گدھے کے سینگوں کی طرح غائب تھا۔

بوقاف اس صورت حال سے کافی محظوظ ہو رہا تھا۔ البتہ اسے چچا تندوری کے متعلق تشویش بھی تھی کہ آخر وہ کہاں گئے......! اب تک تو اسے صرف شک تھا کہ چچا تندوری کوئی بھوت پریت ہیں، لیکن اس موجودہ صورت حال نے اس کے شک کو یقین میں بدل دیا تھا۔

چچا تندوری کا غائب ہو جانا اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ واقعی کوئی بدروح یا آسیب ٹائپ کی کوئی چیز ہیں۔

''اندھے ہو تم لوگ......! دکھائی نہیں دیتا تم لوگوں کو......؟'' دفعتاً بوقاف کو استاد کی کرخت آواز نے خیالوں سے چونکا دیا۔ وہ اپنے ساتھیوں پر برس پڑا تھا۔

''ہمارا کیا قصور ہے استاد......!'' ایک ساتھی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں صفائی پیش کی۔ ''ہم نے تو اس بڈھے کی مرمت کی تھی...... ہمیں کیا معلوم کہ اس کی جگہ خود آپ......''

''بکواس بند کرو......'' استاد پھر گرجا۔ ''اگر میں ہمت کر کے چیختا نہیں تو تم لوگ تو میرا قیمہ ہی بنا دیتے۔''

''آپ نے خود ہی تو ہمیں یہ اصول سکھایا ہے۔'' ایک اور ساتھی بھی بولا۔ ''کہ دشمن کو آنکھیں بند کر کے مارو۔''

''آج سے یہ اصول ختم......'' استاد نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''دوسرا اصول سنو......! آئندہ سے دشمن کی آنکھیں بند کرنا اور اپنی آنکھیں کھلی رکھ کر اسے مارنا...... سمجھ گئے۔''

''بالکل سمجھ گئے استاد......'' اس کے ساتھیوں نے جلدی سے گردنیں ہلائیں۔

اب استاد نے متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور کہیں بھی چچا تندوری کو نہ پا کر، بوقاف پر نظریں گاڑ دیں۔ ''کہاں گیا وہ بڈھا......؟'' استاد بوقاف پر دہاڑا۔ شاید اب اس کا غصہ بوقاف پر اتر رہا تھا۔

''میں کیا جانوں......؟'' بوقاف نے منہ ٹیڑھا کر کے جواب دیا۔ ''ان پر تم لوگ پل پڑے تھے کہ میں......؟ میں تو دور سے تماشہ دیکھ رہا تھا۔''

''ہوں......'' استاد نے گردن ہلائی۔ ''اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر بھاگ نکلا...... ہونہہ...... بزدل چوہا......!''

''بزدل چوہا......؟'' بوقاف نے حیرت سے دہرایا۔ ''ایک اکیلا اور نہتا آدمی اگر درجن بھر بدمعاشوں کو للکارے تو وہ بزدل کہاں

ہوا......؟ میری نظر میں تو اس سے زیادہ دلیر کوئی نہیں ہے۔''

''بکواس مت کرو......'' استاد کے تیور بگڑ گئے۔ ''ہم یہاں تمہارے نظریات پر غور کرنے نہیں آئے۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے ساتھیوں کی طرف مڑا۔ ''چلو بھئی......اسے پکڑ کر گاڑی میں ڈالو......کہیں یہ بھی نہ پھوٹ لے......جلدی کرو......مجھے اپنی بھی مرہم پٹی کروانی ہے۔ اٹھاؤ اس مسٹنڈے کو......اور لے چلو......تاکہ اسے کنگ کانگ کے دربار میں پیش کیا جائے۔''

''کنگ کانگ کا دربار......؟'' بوقاف چونکا۔ ''کیا وہ کوئی بادشاہ ہے؟''

''ہاں......'' استاد نے سر ہلایا۔ ''بے تاج بادشاہ۔''

اب اس کے گرگے، بوقاف کی طرف بڑھے۔ بوقاف چوکنا تھا لیکن ظاہر ہے کہ اب وہ جن نہیں بلکہ انسان تھا۔

چنانچہ تھوڑی دیر کی مزاحمت کے بعد وہ ان بدمعاشوں کے قابو میں آ چکا تھا۔ اسے قریب ہی کھڑی ہوئی ایک وین میں ڈالا گیا۔ پھر سارے بدمعاش اس وین میں سوار ہوئے اور تھوڑی دیر بعد وین اسٹارٹ ہوئی اور دھواں اڑاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

وین کے جاتے ہی علاقے کے لوگ کونے کھدروں سے باہر نکل آئے۔

☆......☆......☆

''خیراتی ہوٹل'' کا کاؤنٹر، اس وقت کمزور دل حضرات کے لئے کافی نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ اس کی وجہ خود شبن خیراتی تھا، کیونکہ اس کا پورا جسم کپڑوں کے بجائے سفید پٹیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ چونکہ دو دفعہ اس کی ٹھیک ٹھاک مرمت ہو چکی تھی، اس لئے اب جسم کا تقاضا تھا کہ جتنے بھی ''ڈمپ'' اور ''ڈیپ'' پڑے تھے، ان کی مرہم پٹی کی جائے۔

چنانچہ شبن صبح ہی صبح ایک ڈاکٹر کے کلینک میں جا دھمکا اور آدھے گھنٹے بعد جب وہ کلینک سے باہر آیا تو پورے جسم پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ بقول ڈاکٹر کے......جسم کے کئی حصے قابل رحم ہو رہے ہیں۔ شبن خیراتی اس حالت میں بھی گھر جانے کے بجائے ہوٹل آ پہنچا تھا اور اب وہ خواہ مخواہ کا تماشہ بن رہا تھا۔ حسب معمول اس نے کاؤنٹر سنبھالا ہوا تھا اور کاؤنٹر کے پیچھے سے وہ اس ''ممی'' کی طرح دکھائی دے رہا تھا، جسے ہزاروں سال بعد تابوت سے نکالا گیا ہو۔ آنکھوں کے علاوہ پورا جسم ''پٹی زدہ'' تھا۔

اس کے ہوٹل میں کام کرنے والے دونوں لڑکے یعنی ماٹے اور چھوٹو تو پہلے پہل اسے دیکھتے ہی ڈر کے مارے چیخ پڑے تھے۔

بڑی مشکل سے شبن انہیں یقین دلا سکا کہ وہ شبن ہے۔ ویسے بھی دونوں مرتبہ ان کے سامنے ہی شبن کی ٹھکائی ہوئی تھی۔

لیکن پھر جب گاہکوں نے ہوٹل میں آنا شروع کیا تو شبن کو ایک اور نئی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ اس وقت کو کوس رہا تھا، جب وہ مرہم پٹی کروا کر سیدھا ہوٹل چلا آیا تھا۔

پرانے سے پرانے گاہک سے بھی اسے اپنا تعارف کرانا پڑ رہا تھا اور پھر گزرنے والے ''حادثوں'' کے متعلق تفصیل سے آگاہی تو لازم ہی ٹھہری تھی۔ وہ آنے والوں کو بتا بتا کر تنگ آ گیا۔ آخر کار اس نے فیصلہ کیا کہ شام سے پہلے ہی ہوٹل کو خیرباد کہہ دے گا اور اس وقت تک ہوٹل نہیں کھولے گا، جب تک کہ وہ پٹیوں سے آزاد نہیں ہو جاتا۔ وہ کاؤنٹر پر براجمان، یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ اس کی آنکھیں خود بخود دروازے کی طرف

اٹھ گئیں۔

اور پھر...... جو کچھ اس کی آنکھوں نے دیکھا، وہ اس کا خون خشک کر دینے کے لئے کافی تھا۔

دو آدمی دروازے سے اندر داخل ہوئے تھے اور بڑے اسٹائل سے چلتے ہوئے کاؤنٹر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ شبن نے دور سے ہی اندازہ کر لیا تھا کہ ان کے تیور خراب ہیں اور وہ شبن کو ہی گھورتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں۔

”یا اللہ رحم......!“ شبن کے منہ سے نکلا اور تو اس کو کچھ نہ سوجھا، البتہ فوراً ہی اٹھ کر کاؤنٹر کے نیچے چھپ گیا۔

اسی ٹائپ کے بندوں کا پچھلے دو مرتبہ کا تجربہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ وہ دم سادھ کر فرش سے چپک گیا۔ آنے والوں نے اس کی یہ حرکت دیکھ لی تھی، چنانچہ کاؤنٹر پر آتے ہی وہ گرجے۔

”باہر آ...... اوئے......!“

”قانون سے چھپتا ہے......؟ او...... اٹھ...... چوکھٹا تو دکھا......“

یہ آوازیں ان کے کانوں میں پڑیں اور وہ چونک اٹھا۔

”قانون......!“ اس نے سوچا۔ ”ارے باپ رے......“

اس کا مطلب یہ تھا کہ آنے والے، سول کپڑوں میں دراصل پولیس والے تھے اور ان سے چھپ کر شبن نے واقعی اپنے تابوت میں آخری کیل ٹھونک لی تھی۔ (ممی تو وہ خود ہی بنا ہوا تھا)

جیسے تیسے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں اسے چبھتی ہوئی نظروں سے گھور رہے تھے۔ جب اس کا حلیہ دیکھا تو وہ دونوں بھی چونک اٹھے۔ ”کون ہے تو...... اور ہمیں دیکھ کر چھپا کیوں......؟“ ایک پولیس والے نے کاؤنٹر پر زور سے مکا مارتے ہوئے پوچھا۔

شبن کا ٹیپ ریکارڈ بھی بند تھا، اس لئے مکے کی گونج پورے ہوٹل میں سنائی دی۔ تمام چونک کر ادھر متوجہ ہو گئے۔

”کیوں چھپ گیا تھا بھئی...... بتا......“ دوسرا پولیس والا بھی کرخت آواز میں بولا۔ ”اور یہ تو نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟“

”اس نے کوئی بہت بھیانک جرم کیا ہے۔“ پہلے پولیس والے نے شبن کی روح تک لرزا دی۔ ”اسی لئے جرم کرنے کے بعد اس نے یہ ڈھونگ رچایا ہے، تاکہ کوئی اس کی شناخت نہ کر سکے۔“

شبن کے منہ سے ابھی تک ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”ایک منٹ...... پہلے میں اپنی تسلی کر لوں۔“ دوسرے پولیس والے نے اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر کہا۔ پھر اس نے کڑی نظروں سے شبن کو گھورا۔

”ہاں بھئی...... تو مصر کے اہرام سے فرار ہونے والی ممی ہے؟“

”نن...... نن...... نہیں......“ شبن نے ہکلا کر گردن ہلائی۔

”اچھا......“ پولیس والے نے گردن ہلائی۔ ”تو پھر...... تو مصر سے فرار نہیں ہوئی بلکہ کوئی اور تجھے اٹھا کر لایا ہے؟“

''نن......نہیں۔'' شبن نے پھر نفی میں گردن ہلائی۔

''اچھا تو پھر......'' پولیس والا سوچ میں ڈوب گیا۔ ''تو اپنے عجائب گھر کی دیسی ممی ہے......؟''

اتنی دیر میں چھوٹو آگے بڑھا۔

''جناب عالی! یہ ممی نہیں ہیں، بلکہ ڈیڈی ہیں، پانچ بچوں کے ڈیڈی۔''

''اوئے......تو چپ کر۔'' پولیس والا جھلا کر بولا۔ ''قانون کے معاملے میں دخل اندازی کرتا ہے......؟ اور......اتنے چھتر ماروں گا کہ یاد کرے گا۔''

چھوٹو سہم کر ایک طرف ہو گیا۔

''ہاں بھئی......تو بتا......!'' پولیس والا اب شبن سے مخاطب تھا۔

''نہیں......میں اپنے ملک کی دیسی ممی بھی نہیں ہوں۔'' شبن نے پھر نفی میں گردن ہلائی۔

''تو پھر......'' اسی پولیس والے نے کاؤنٹر پر زور سے مکا مارا۔ ''بتا تو نے کون سا جرم کیا ہے؟''

''مم......مم......میں نے......کوئی جرم نہیں کیا۔'' شبن نے بمشکل جواب دیا۔

''اور......تو ہمیں دیکھ کر چھپ کیوں گیا تھا؟'' پہلا پولیس والا غرایا۔

''مجھے کیا معلوم......کہ آپ پولیس والے ہیں۔'' شبن نے کہا۔ ''وردی تو ہے نہیں آپ کے جسم پر۔''

''ہماری وردیاں ڈرائی کلین ہونے گئی ہیں۔'' پہلا پولیس والا بولا۔

''تو پھر......خود بتایئے......! میرا کیا قصور ہے......؟ کچھ بدمعاش میرے پیچھے پڑ گئے ہیں، انہوں نے ہی میری یہ حالت کی ہے۔ آنکھوں کے علاوہ جسم کا کوئی حصہ نہیں بچا......ہر جگہ سے چھلا ہوا ہوں۔''

''تو ہے بھی تو اتنا موٹا......'' دوسرا پولیس والا ہنسا۔ ''کسی نے آلو سمجھ کر چھیل دیا ہوگا۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' شبن نے صدق دل سے اقرار کیا۔ ''آپ لوگ ہوٹل میں داخل ہوئے تو میں جب بھی یہی سمجھا کہ دو بدمعاش اور آ گئے، مجھے چھیلنے......''

''کیا......!'' دونوں پولیس والے چونکے۔ ''تو نے ہمیں بدمعاش کہا......؟''

''نن......نہیں جی......'' شبن کی ہوا خراب ہوئی۔ ''میں نے بدمعاش کہا نہیں، میں تو اپنا خیال بتا رہا تھا۔''

''ہم سنتے ہیں تیرے خیال بھی......'' پہلے پولیس والے نے گردن ہلائی۔ ''پہلے ذرا اپنے خیالوں سے تجھے آگاہ کر دیں۔''

یہ کہہ کر اس نے دانت پیسے اور غصے کے عالم میں کاؤنٹر کے اندر کود گیا......اور......آلو پھر چھلنے لگا۔

☆......☆......☆

پردے کے عقب سے دو آدمی برآمد ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کافی نمایاں دکھائی دے رہا تھا۔ حکیم طولانی کے چیخنے کی وجہ یہ تھی کہ ان دونوں کے سروں پر سینگ تھے۔ چچا تندوری کڑی نظروں سے آنے والوں کو دیکھ رہے تھے۔ پھر وہ دونوں قریب آ گئے۔

حکیم طولانی، چچا تندوری کے پیچھے جا چھپے تھے، اور اب آڑ میں سے دونوں کو دیکھ رہے تھے۔

''ڈرنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔'' نمایاں دکھائی دینے والے نے مسکرا کر انہیں مخاطب کیا۔ ''ہم جن ضرور ہیں، لیکن آپ سے یہ ملاقات قطعی دوستانہ ماحول میں ہو رہی ہے۔''

''ڈر کون خبیث رہا ہے......؟'' چچا تندوری نے برا سا منہ بنایا۔

''آپ کا ساتھی۔'' دوسرے جن نے فوراً کہا۔

یہ سن کر حکیم طولانی نے ذرا ہمت پکڑی اور سامنے آ گئے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی ٹانگیں اب بھی 'لیفٹ رائٹ' کر رہی تھیں۔

''تو...... تم لوگ جن ہو......؟'' چچا تندوری نے انہیں غور سے دیکھا۔

''ہاں...... جناب...... میرا نام قماطہ ہے، اور میں اپنے قبیلے کا سردار ہوں، اس کا نام قالان ہے، یہ بھی میرے ہی قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔'' سردار نے بڑے خلوص اور محبت سے اپنا اور اپنے ساتھی کا تعارف کروایا۔

''یہ بتاؤ کہ ہم دونوں ہیں کہاں......؟ ابھی ابھی تو میں اور حکیم صاحب ایک پھڈے میں ٹانگ اڑائے ہوئے تھے۔ کہاں گئے وہ بد معاش......؟''

چچا تندوری نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ابھی...... ابھی......!'' قماطہ بے ساختہ مسکرا کر بولا۔ ''جناب عالی......! آپ دونوں کو وہاں سے نکلے ہوئے پورا ایک دن گزر چکا ہے۔ آج تو دوسرا دن ہے۔''

''ہیں......؟'' چچا تندوری نے آنکھیں مٹکائیں اور اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر بولے۔ ''جب ہی تو میں کہوں کہ بھوک کے مارے برا حال کیوں ہو رہا ہے۔ کیوں حکیم صاحب......؟ تمہیں لگ رہی ہے بھوک......؟''

وہ حکیم طولانی کی طرف مڑے اور حکیم طولانی نے احمقانہ انداز میں سر ہلا دیا۔ وہ کبھی جنوں کی طرف دیکھتے اور کبھی چچا تندوری کی طرف۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔

''کھانے پینے کی تو آپ بالکل فکر نہ کریں۔'' قماطہ مسکرایا۔ ''آپ جس چیز کا بھی آرڈر دیں گے، وہ فوراً حاضر کی جائے گی۔''

''اوہ......'' حکیم طولانی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''کوئی غزلیں سننے والا بھی مل سکتا ہے؟''

''کیا مطلب......؟'' قماطہ اور قالان، دونوں نے چونک کر پوچھا۔

''انہیں ایک بیماری ہے......'' چچا تندوری نے انہیں بتایا۔ ''حالانکہ یہ خود حکیم ہیں، لیکن اس بیماری کا علاج نہیں کر سکتے۔''

”اوہ...... یہ بیمار ہیں، پھر تو انہیں آرام کرنا چاہئے۔“ قماطہ کے لہجے میں تشویش تھی۔ ”میں نے اپنے خادموں کو صرف آپ کو لے کر آنے کے لئے بھیجا تھا، لیکن وہ انہیں بھی اٹھا کر لے آئے۔ میں نے ان سے وجہ پوچھی تو خادموں نے بتایا کہ جہاں آپ لوگ موجود تھے، وہاں اتنی اودھم دھاڑ ہو رہی تھی کہ وہ گھبراہٹ میں فیصلہ نہیں کر پائے کہ آپ دونوں میں سے چچا تندوری کون ہے۔ چنانچہ وہ آپ دونوں کو ہی اٹھا کر لے آئے۔“

”بہت اچھا کیا......“ چچا تندوری نے اطمینان سے سر ہلایا۔ جیسے یہ سب ان کے ایما پر ہوا ہو۔

البتہ حکیم طولانی کچھ بے چین دکھائی دے رہے تھے۔

”ایک اور خاص بات بھی ہوئی ہے۔“ قماطہ مسکرایا۔

”اچھا......! وہ کیا......؟“

”میرے خادموں نے ان ہی بدمعاشوں کا ایک بندہ آگے بھڑا دیا تھا، میرے خیال سے آپ کی جگہ وہی بے چارہ پٹا ہوگا۔“

”اوہ......“ چچا تندوری کے ہونٹوں پر پہلی بار مسکراہٹ تیر گئی۔ پھر وہ سنجیدگی سے بولے۔ ”اب یہ بتاؤ کہ ہمیں یہاں لانے کا مقصد کیا ہے......؟“

”پہلے آپ لوگ کھانا وغیرہ کھالیں...... اس کے بعد باقی باتیں ہوں گی...... آیئے......“

یہ کہہ کر قماطہ نے آگے بڑھ کر پردہ ہٹا دیا۔ ادھر قالان نے بڑے ادب سے چچا تندوری اور حکیم طولانی کو چلنے کا اشارہ کیا۔ پردے کے دوسری جانب کا نظارہ دیکھ کر دونوں کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

یہ ایک کافی بڑا کمرہ تھا۔ جس میں ایک طویل و عریض دسترخوان بچھا ہوا تھا۔ اس دسترخوان پر انواع و اقسام کی ڈشیں، مٹھائیاں اور طرح طرح کے پھل فروٹ اور میوے سجے ہوئے تھے۔ چچا تندوری اور حکیم طولانی مبہوت ہو کر دسترخوان کو گھور رہے تھے۔

”آپ دونوں بیٹھیں...... اور کھانا شروع کریں۔ اگر کسی چیز کی کمی ہو تو ہمیں بے تکلف ہو کر بتائیں۔ ہم حاضر کر دیں گے۔“ قماطہ کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔

”کمی......؟“ چچا تندوری کھوئے کھوئے لہجے میں بولے۔ ”اتنا کھانا تو شاید زندگی بھر میں بھی نہیں کھایا ہوگا...... اتنا کھانا۔“

”آپ مذاق کر رہے ہیں۔“ قماطہ کسرِ نفسی سے بولا۔ ”چلئے...... شروع ہو جایئے......“

دونوں جلدی سے دسترخوان پر بیٹھ گئے۔

”آپ دونوں بھی آئیں......“ حکیم طولانی نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر قماطہ اور قالان کو مخاطب کیا۔

”نہیں......“ قماطہ ہنسا۔ ”ہماری یہ سب خوراک نہیں ہے۔“

دونوں نے سر ہلایا اور بھوکوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ اتنا لذیذ اور عمدہ کھانا زندگی میں کبھی نہیں کھایا تھا۔ معلوم نہیں یہ جن حضرات کہاں سے پکوا کر لائے تھے۔

فروٹ بھی اعلیٰ قسم کے تھے۔ ایسے فروٹ جو سبزی منڈی کا رخ کیے بغیر ہی بیرون ملک روانہ کر دیے جاتے ہیں۔

دونوں نے خوب ہی سیر ہو کر کھایا۔ اس کے باوجود دستر خوان پر کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔

کھانے سے اچھی طرح فراغت کے بعد ان دونوں کو ایک تیسرے کمرے میں لایا گیا، یہاں نفیس قسم کے صوفہ سیٹ رکھے ہوئے تھے۔

قماطہ نے اشارہ کیا اور چچا تندوری جھٹ سے صوفے پر ڈھیر ہو گئے۔ صوفہ اتنا آرام دہ تھا کہ وہ اس میں دھنستے چلے گئے۔ حکیم طولانی نے بھی فوراً ہی ان کی پیروی کی تھی۔

دونوں جن بھی ان کے مقابل بیٹھ گئے۔

''تم لوگوں کی وجہ سے ایک اہم بندہ میرے ہاتھ سے نکل گیا۔'' چچا تندوری کو کچھ یاد آ گیا۔ ''اب نہ جانے وہ کہاں ہوگا......؟''

''کون تھا وہ......؟'' ''اس کی والدہ کا نام بتائیں، ہم اسے یہاں لے آئیں گے۔'' قماطہ نے فوراً کہا۔

''ایک بزرگ نے خود اس کا ہی نام بتا دیا، یہی بڑی بات ہے۔ والدہ کا نام کیسے بتاؤں......؟'' چچا تندوری نے منہ بنایا۔

''بزرگ......!'' حکیم طولانی چونکے۔ ''تمہیں بھی بزرگ ملے تھے......؟'' چچا تندوری نے انہیں تیز نظروں سے گھورا۔

''آخر معاملہ کیا ہے......؟ ہمیں بتائیے......؟'' قماطہ مضطرب ہو رہا تھا۔

''کوئی ایسی بات نہیں ہے۔'' چچا تندوری جلدی سے بولے۔ ''تم اپنا مقصد بیان کرو...... اور ہاں...... یہ بتاؤ کہ ہم اس وقت کہاں ہیں؟''

''شمالی امریکہ میں......'' قماطہ نے سکون سے جواب دیا۔

''شش...... شمالی...... امریکہ......!'' حکیم طولانی نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔

''جی ہاں...... جب ہی تو آپ کو یہاں تک لانے میں پورا ایک دن صرف ہوا......''

''اوہ......'' حکیم طولانی کے ہونٹوں کا دائرہ بن گیا۔ البتہ چچا تندوری لاپروائی سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ پھر دفعتاً وہ چونک کر قماطہ سے مخاطب ہوئے۔

''یار......! چائے تو پلاؤ...... بڑی طلب ہو رہی ہے۔ قسم سے......''

☆......☆......☆

بوقاف کو ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک بڑے ہال نما کمرے میں موجود پایا۔ وین میں سوار ہونے کے بعد پانی کے بہانے ان ظالموں نے نہ جانے بوقاف کو کیا پلا دیا تھا کہ وہ دس منٹ بعد ہی انٹاغفیل ہو گیا تھا۔ چنانچہ ہوش میں آنے کے بعد وہ ہڑ بڑا کر اٹھ کھڑا ہوا اور اس کمرے پر ایک تفصیلی نظر ڈالی۔

وہ خود اب تک ننگے فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اتنے بڑے کمرے میں صرف ایک کونے میں چند کرسیاں اور ان کے درمیان میں ایک بڑی سی میز رکھی ہوئی تھی۔ اس ہال میں چھت کی جانب چھ روشن دان تھے، البتہ دروازہ صرف ایک تھا۔

بوقاف روشن دان کی جانب بڑھ ہی رہا تھا کہ دفعتاً دروازہ کھلا اور آٹھ آدمی اندر داخل ہوئے۔ وہ آٹھوں عجیب وضع قطع کے مالک تھے۔ ان کے جسموں پر صرف شلواریں تھیں، سب کا اوپری دھڑ ننگا تھا۔ وہ سارے کے سارے اتنے کمزور اور دبلے پتلے تھے کہ ان کی پسلیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

ان کی حالت دیکھ کر بوقاف بے ساختہ ہنس پڑا۔

”کیوں......؟“ ایک نے اسے گھورا۔ ”بڑی ہنسی آرہی ہے......کیا بھنگ کے لڈو کھا لئے ہیں؟“

”یہ بھنگ کے لڈو کیا ہوتے ہیں......؟“ بوقاف نے حیرت سے پوچھا۔ پھر لاپروائی سے سر ہلا کر بولا۔ ”بہرحال وہ کچھ بھی ہوں، تم لوگوں کو دیکھ کر جتنی ہنسی آرہی ہے، لڈو دیکھ کر ہرگز نہیں آسکتی۔“

”ابے......لڈو دیکھ کر نہیں بلکہ کھا کر ہنستے ہیں......“ اس نے بوقاف کو سمجھایا۔ پھر چونک کر بولا۔ ”ابے او......! تو ہمیں دیکھ کر ہنس کیوں رہا تھا؟“

”لو......تمہیں یہی نہیں پتا......“ بوقاف نے شکایت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ”بھئی......مذاق اڑا رہا تھا تمہارا......؟“

”کیوں اڑا رہا تھا ہمارا مذاق......؟“ اسی نے آنکھیں نکالیں۔ باقی ساتوں افراد بھی بوقاف کو گھور رہے تھے۔

”اتنے بڑے ہال میں تم لوگوں نے ایک آئینہ بھی نہیں لگوایا۔ ورنہ ابھی بتا دیتا۔“ بوقاف نے منہ بنایا۔

”اوئے......اوئے......ذرا زبان سنبھال کے......“ دوسرا آدمی آگے بڑھ کر بولا۔ اس کے تیور اچھے نہیں تھے۔ ”ہم لوگ کنگ کانگ کے آدمی ہیں۔“

”کنگ کانگ......کنگ کانگ......کنگ کانگ......“ بوقاف چیخا۔ ”یہ نام سن سن کر میرے کان پک گئے ہیں۔ کہاں ہے تمہارا کنگ کانگ......؟“

”فکر مت کرو......وہ آنے ہی والے ہیں۔ تم بہت خوش نصیب ہو، جو وہ تم سے ملاقات کرنے خود آرہے ہیں۔ دراصل وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ان کے آدمی پر ہاتھ اٹھانے والا کون جی دار پیدا ہو گیا۔“ اسی نے بتایا۔

”مجھے پیدا ہوئے تو 128 سال گزر گئے......“ بوقاف نے جواب دیا۔ یہ سن کر وہ سب کے سب ہنس دیئے۔ جیسے بوقاف نے کوئی مزاحیہ جملہ سنا دیا ہو۔

بوقاف حیرت سے ان کی شکلیں تکنے لگا۔

”اپنے پورے خاندان کی عمر بتا رہا ہے یہ......“ کسی نے ہنستے ہوئے جملہ کسا۔ اسی بات نے محفل کو مزید کشت زعفران کر دیا۔

”مت یقین کرو......“ بوقاف نے منہ بنایا۔ ”ویسے بھی ہمارے یہاں خاندان نہیں بلکہ قبیلے ہوتے ہیں۔“

”ابے......کیا تیرا تعلق افریقہ کے جنگلوں سے ہے......؟“ ایک نے ہنس کر کہا۔

”نہیں تو......“ بوقاف نے جلدی سے کہا۔ ”کیوں......کیا ان جنگلوں میں تمہارے رشتے دار رہتے ہیں......؟“

جواباً اس آدمی نے رشتے داروں کی شان میں ایسی گستاخی کی کہ اگر وہ سن لیتے تو یقیناً اس آدمی سے قطع تعلق کر لیتے۔ ”بڑی بات ہے......“ بوقاف نے اس کی بات سن کر سر ہلایا۔ ”ورنہ ادھر اتنی جگہ کہاں ہوتی ہے۔“

”تو تو بہت بول رہا ہے......“ اسی آدمی نے بوقاف کو گھورا۔ ”اگر کنگ کانگ کا آرڈر نہ ہوتا......تو ہم تیری بولتی بند کر دیتے۔“

”مجھے بھی صرف کنگ کانگ کا ہی خیال ہے، ورنہ اب تک تم لوگوں کی چٹنی بنا کر یہاں سے رخصت ہو چکا ہوتا۔ میں دراصل ایک بار اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس کا اتنا نام سنا ہے کہ اب ملنے کی خواہش شدید ہو گئی ہے۔“ بوقاف نے کہا۔

”اس خیال میں مت رہنا کہ تم آرام سے ہماری چٹنی بنا دو گے۔“ ایک نے سخت لہجے میں کہا۔ ”اوپر روشن دان دیکھ رہے ہو...... ہر روشن دان پر ایک اسلحہ بردار آدمی تعینات ہے۔ ادھر تم نے کوئی غلط حرکت کی اور ادھر تمہیں گولیوں سے بھون دیا جائے گا۔ کیا سمجھے......؟“

”اوہ......“ بوقاف کے منہ سے نکلا۔ ”میں تو یہ سمجھا تھا کہ تم لوگوں کو گرمی زیادہ لگتی ہے، اس لئے کمرے کو ٹھنڈا رکھنے کے لئے اتنے سارے روشن دان بنوائے ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم لوگوں کو گرمی زیادہ لگتی ہے، اسی لئے تو اپنی قمیصیں اتار رکھی ہیں۔“

”ابے......احمق......!“ ایک اور ننگا آگے بڑھا۔ ”یہ ہمارا اصول ہے۔ کنگ کانگ کے گروہ میں کئی افراد شامل ہیں اور علاقے کے حساب سے ہر ٹیم کا ایک استاد ہوتا ہے۔ ہم آٹھ کے آٹھ استاد ہیں اور جس جگہ تم اس وقت موجود ہو، یہ ہمارا ہیڈ کوارٹر ہے۔ یہ ہمارا اصول ہے کہ ہم استاد لوگ چار دیواری کے اندر بغیر قمیضوں کے رہتے ہیں۔ ہاں البتہ......اگر کسی مہم پر جانا ہو تو پورا لباس پہن کر جاتے ہیں۔“

”یہ تم لوگ اچھا کرتے ہو۔“ بوقاف نے سر ہلایا۔ ”ورنہ تم لوگوں کی ہڈیاں اور پسلیاں دیکھ کر لوگ خواہ مخواہ ڈر جائیں گے۔“

”زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”اچھا چھوڑو...... یہ بتاؤ کہ یہ کس چیز کا ہیڈ کوارٹر ہے؟“ بوقاف نے سوال کیا۔ ”یہاں کیا ہوتا ہے؟“

”یہ......ہم استاد لوگوں کی رہائش گاہ ہے اور یہاں کنگ کانگ اکثر میٹنگیں کرتے رہتے ہیں، یعنی اگر کوئی اہم مہم درپیش ہو تو باقاعدہ میٹنگ کے ذریعے کنگ کانگ ہمیں اس مہم سے متعلق معلومات فراہم کرتے ہیں۔“

”کیسی مہم......؟“

”ارے......اتنے بھولے رام ہو تم......؟“ وہ ہنسا۔ ”اے بھائی میاں......! مہم یہ ہوتی ہے کہ کس کو لوٹنا ہے؟ کہاں ڈاکے کی واردات کرنی ہے اور کہاں لمبا ہاتھ مارنا ہے۔“

”اوہ......“ بوقاف کے منہ سے نکلا۔ ”تم لوگوں کو پولیس نہیں پکڑتی......؟“

”پولیس......“ وہ حقارت سے ہنسا۔ ”پولیس تو خود ہمارے کنگ کانگ پر ہاتھ ڈالتے ہوئے گھبراتی ہے۔“

”کیا مطلب......؟“ بوقاف چونکا۔

”ہر بات کا مطلب نہیں بتایا جاتا۔“ وہ مکارانہ انداز میں ہنسا۔ ”خاص طور پر بچوں کو......“

”ہوں تو خیر میں بچہ ہی......!“ بوقاف نے اس کی تائید کی۔ ”128 سال کا ہوں، تو کیا ہوا......؟ یہ بات میرے لئے واقعی حیران کن ہے کہ تمہارے کنگ کانگ سے پولیس بھی ڈرتی ہے۔“

”یہی تو بات ہے۔ ابھی تم خود بھی ہمارے کنگ کانگ کے درشن کر لو گے۔“ اس نے بتایا۔

بوقاف نے رواروی کے عالم میں سر ہلایا۔

”اب ہم لوگ جا رہے ہیں۔ تم یہاں کنگ کانگ کا انتظار کرو۔“ ان ہی میں سے ایک نے تھوڑی دیر بعد کہا۔

”کب تک آئے گا وہ......؟“ بوقاف نے پوچھا تھا۔

”مرضی کے مالک ہیں، جب بھی آ جائیں۔“ جواب ملا۔ وہ سب کے سب ابھی تک کھڑے ہوئے تھے۔ ہال نما کمرے کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔

عین اسی وقت ایک بھنورا اڑتا ہوا دروازے سے اندر داخل ہوا اور ان کے قریب آ کر منڈلانے لگا۔

اسے دیکھتے ہی آٹھوں استاد بوکھلا اٹھے۔ پھر ان میں سے ایک نے چیخ کر کہا۔ ”ابے......سب لوگ اپنے کان بند کر لو...... جلدی......“

بوقاف ان کی بوکھلاہٹ پر حیرت زدہ رہ گیا۔

☆......☆......☆

لذیذ اور ذائقے دار چائے کے دور کے بعد، قماطہ اصل موضوع کی طرف لوٹ آیا۔ ”بات دراصل یہ ہے چچا تندوری صاحب......! کہ ہم لوگ ایک گمبھیر قسم کے مسئلے میں گرفتار ہیں۔“

”ذرا آسان اردو بولو بھئی......“ چچا تندوری نے منہ بنا کر ٹوکا۔ ”اپنے کو اسکول سے بھاگنے کی بہت عادت تھی۔“

”اچھا......“ قماطہ نے سمجھ جانے والے انداز میں سر ہلایا۔ پھر بولا۔ ”کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم لوگ ایک مشکل میں پھنس گئے ہیں۔“

”جن ہو کر بھی......؟“ حکیم طولانی نے حیرت سے پوچھا۔

”ہم آسمان سے تھوڑی اترے ہیں۔“ قالان سے رہا نہ گیا۔ ”آپ لوگوں نے ہمیں پتا نہیں کیا تصور کر لیا ہے۔“

”خیر......خیر......اچھا پھر......؟“ چچا تندوری نے قماطہ کو ٹوکا۔

”ہم نے اپنے شہنشاہ جنات سے رابطہ کیا تو انہوں نے بتایا کہ صرف چچا تندوری ہی یہ مسئلہ حل کر سکتے ہیں۔“ قماطہ نے بتایا۔

”وہ مجھے کیسے جانتے ہیں؟“ چچا تندوری نے اسے گھورا۔

”میں کیا جانوں......! البتہ انہوں نے بتایا تھا کہ آپ شمولہ نامی ایک خوفناک قسم کی بلا کو بھاگنے پر مجبور کر چکے ہیں۔ وہ آپ کی بہت تعریفیں کر رہے تھے۔“

”اسے...... وہ بھی کوئی بلا تھی......؟ ہونہہ......“ چچا تندوری نے منہ بنا کر سر کو جھٹکا۔

”بہر حال...... اب میں آپ کو مسئلہ بتاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر قماطہ نے قالان کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کی تفصیل سنا ڈالی۔ اس دوران میں چچا تندوری کا چہرہ تو سپاٹ تھا، البتہ حکیم طولانی کا منہ بار بار کھل کر بند ہوتا رہا۔

”بب...... بب...... بدروحیں......!“ آخر میں حکیم طولانی کے منہ سے نکلا۔ ”جن کے بارے میں شاعر نے کہا ہے کہ:۔

صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

”معاف کیجئے گا......“ قالان نے دخل دیا۔ ”میرا خیال ہے کہ شاعر نے یہ شعر اپنی محبوبہ کے لئے کہا ہے۔“

”ایک ہی بات ہے......“ چچا تندوری نے منہ بنایا۔ ”بعض محبوبائیں، کسی طرح بھی بدروحوں سے کم نہیں ہوتیں۔ جان سے چمٹ جائیں تو پھر کم از کم درجن بھر دیوان چھپوا کر ہی ان سے پیچھا چھوٹتا ہے۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ اتنے دیوان شائع ہونے کے بعد شاعر کی محبت ختم ہو جاتی ہے؟“ قماطہ بھی اس گفتگو میں شامل ہو گیا۔

”وہ بے چارہ خود ہی ختم ہو جاتا ہے۔“ چچا تندوری نے جواب دیا۔ ”اتنے دیوان شائع ہونے کے بعد کون زندہ رہے گا؟“

”اوہ......“ قالان کے منہ سے نکلا۔ ”آپ کے یہاں بے چارے شاعر کا انجام تو بڑا خوفناک ہے۔“

”ہمارے یہاں تو خود شاعر بھی بڑا بھیانک ہوتا ہے، ان ہی کو دیکھ لو......“ یہ کہہ کر چچا تندوری نے حکیم طولانی کی طرف اشارہ کیا۔ ”کوئی بھی ان کی غزلیں سننے کو تیار نہیں ہے۔“

قالان اور قماطہ نے فوراً حکیم طولانی کی طرف دیکھا، انہوں نے مسکین سی صورت بنالی۔

”تم فکر نہ کرو حکیم صاحب......؟“ دفعتاً چچا تندوری نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”چلو اٹھو...... اب تم بدروحوں کو اپنی غزلیں سنانا......“ حکیم طولانی یہ سن کر چونکے اور غور سے چچا تندوری کی طرف دیکھنے لگے۔

☆......☆......☆

سب نے فوراً ہی اپنی اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیں۔ بھنورا اب بھی ان کے گرد منڈلا رہا تھا اور وہ لوگ خوف زدہ انداز میں گردن گھما گھما کر اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”یہ تم لوگ کیا کر رہے ہو......؟“ بوقاف سے رہا نہ گیا۔

”ابے تمہیں نہیں معلوم......؟“ ان میں سے ایک بولا۔ ”یہ کم بخت کان میں گھس جاتا ہے۔ تم بھی کان بند کر لو......“

بے خیالی کے عالم میں خود بوقاف سے بھی وہی حرکت سرزد ہو گئی۔ پھر فوراً ہی شرمندہ سا ہو کر اس نے کانوں میں سے انگلیاں نکالیں۔ ”بہت اچھا ہوگا...... دیکھنا یہ بھنورا تمہارے کان میں گھس جائے گا۔ ہاں......“ اسے فوراً ہی گویا وارننگ ملی۔

”گھسنے دو......“ بوقاف نے لاپروائی سے بھنورے کی طرف دیکھا۔ ”یہ اتنا سا جانور کرے گا کیا......؟ کتنے بزدل ہو تم لوگ......!“

استادوں نے اسے گھور کر دیکھا۔ اتفاق سے اسی وقت بھنورے نے اپنا رخ بدلا اور واپسی ہولیا۔ پھر وہ دروازے سے ہوتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

تمام استادوں نے اطمینان کے سانس لئے اور پھر دوبارہ بوقاف کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان کے تیور فوراً ہی بدلے تھے، اب یوں لگ رہا تھا جیسے بوقاف کی جگہ وہاں ''رضیہ'' موجود ہو۔

بوقاف نے ان کا جارحانہ انداز دیکھ کر برا سا منہ بنایا۔ ''بس رہنے دو تم لوگ اپنی اکڑفوں...... اتنے سے کیڑے نے تو ہوا نکال دی تم سب کی...... ہونہہ......''

اس سے پہلے کہ استادوں میں سے کوئی کچھ کہتا، اسی وقت باہر سے کسی گاڑی کے ہارن کی آواز سنائی دی۔

''لو بھئی...... کنگ کانگ آ گئے......'' کسی کے منہ سے نکلا۔ یہ سن کر بوقاف کا چہرہ تن گیا۔

☆......☆......☆

چچا تندوری اور حکیم طولانی کو غار کے کشادہ دہانے کے قریب تنہا چھوڑ دیا گیا تھا۔ قالان اور قماطہ وہاں سے ہٹ کر کافی فاصلے پر کھڑے ہو گئے تھے۔

چچا تندوری نے نپے تلے قدم آگے بڑھائے تو حکیم طولانی نے ان کا بازو تھام لیا۔ وہ فوراً ہی مڑے اور حکیم طولانی کی طرف استفہامیہ انداز میں دیکھنے لگے۔

''ارے...... کچھ سوچ سمجھ تو لو تندوری......! درانا گھسے جا رہے ہو...... کیا اپنی موت کو خود دعوت دے رہے ہو......؟''

''موت کی بات نہ کرو حکیم صاحب......!'' چچا تندوری عجیب سے انداز میں مسکرائے۔ ''وہ تو ہر صورت میں آ کر رہے گی...... جیسے جسم میں سانس ہے، ویسے ہی جسم کو موت بھی ہے۔''

یہ سن کر حکیم طولانی نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ ''پردیس میں آ کر تو تم بڑی فلسفیانہ باتیں کر رہے ہو......'' حکیم طولانی نے کہا۔ پھر جلدی سے بولے۔ ''میرا یہ مطلب تھا کہ غار میں قدم رکھنے سے پہلے اچھی طرح سوچ سمجھ لو...... ایسا نہ ہو کہ یہ ہمارے لئے کوئی سازش ہو......''

''اماں...... ہم نورس قصبے میں رہنے والے دو ٹکے کے لوگ ہیں۔'' چچا تندوری نے منہ بنایا۔ ''کوئی ہمارے لئے کیا جال بچھائے گا......؟''

''میں تو نہیں ہوں...... دو ٹکے کا......'' حکیم طولانی برا مان گئے۔

''اچھا......!'' چچا تندوری نے حیرت سے کہا۔ ''چلو پھر میری طرف سے اپنے لئے ایک ٹکہ اور بڑھا لو۔ جاؤ...... کیا یاد کرو گے......''

حکیم طولانی کا منہ اور بھی بن گیا۔

''اب لگ رہے ہو نا تم شاعر......'' چچا تندوری ہنسے۔ ''بالکل دھوتر مچھلی کی طرح شکل ہو رہی ہے تمہاری...... اور پھٹکار......! وہ تو اضافی

معاملہ ہے۔“

”بس کرو تندوری...... تم نے تو میرا مشاعرہ ہی نکال دیا۔“

”جنازہ ہوتا ہے وہ تو......“

”اب مشاعرہ بھی جنازے سے کم نہیں ہے۔“ حکیم طولانی نے سرد آہ بھری۔ ”اب اس دور میں اہل ذوق لوگ کہاں رہے......“

”جب ہی تو کہہ رہا ہوں کہ غار کے اندر چلو اور بدروحوں کو اپنا کلام سنا ڈالو۔ کچھ دل ہی ہلکا ہوگا۔“ چچا تندوری نے لاپروائی سے کہا۔

”اور اگر بدروحوں نے وہاں اپنا کلام سنا ڈالا تو......؟“ حکیم طولانی نے ہونٹوں کا دائرہ بنا کر خدشہ ظاہر کیا۔

”تو سن لینا...... چلو اب اندر...... نہ جانے کیوں مجھے اپنی بیوی بہت یاد آ رہی ہے۔“

یہ کہہ کر چچا تندوری نے غار میں قدم رکھ دیا۔

☆......☆......☆

شکنجہ

شکنجہ ناول پاکستان میں ہونے والی تخریب کاری کے پس منظر میں لکھا گیا ہے ہمارے ہاں گذشتہ کچھ سال سے ”ٹریک ٹو ڈپلومیسی“ کا غلغلہ کچھ زیادہ ہی زور شور سے مچایا جارہا ہے۔ باور کیا جاتا ہے کہ محبتوں کے جو زنگ آلود دروازے حکومتیں نہیں کھول سکیں وہ شاید عوام بلکہ عوام بھی نہیں دانشور خواتین وحضرات اپنی مساعی سے کھولنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔

لیکن...... اس ٹریک ڈپلومیسی کی آڑ میں کیا گھناؤنا کھیل رچایا جارہا ہے بھارتی انٹیلی جنس ایجنسیاں ”بھولے بادشاہوں“ کو کس کس طرح اپنے جال میں پھانستی ہیں اور ان سے کیا کام لیا جاتا ہے۔ یہی اس ناول کا موضوع ہے۔

ایک اور بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ پاکستان اپنے ہاں ہونے والے ہر واقعے کی ذمہ داری ”را“ پر ڈال دیتا ہے۔ یہ بات کس حد تک سچ ہے؟ کس حد تک جھوٹ؟ شاید ان سوالات کے جواب بھی آپ کو اس ناول کے مطالعے سے مل جائیں۔ محبتوں کی آڑ میں منافقتوں کا دھندہ کون چلا رہا ہے؟ دشمن کی سازش کیسے انجام پاتی ہے اور اس سازش کا شکار ہم انجانے میں کیسے بن جاتے ہیں میں نے یہی بتانے کی کوشش کی ہے۔ یہ ناول کتاب گھر کے **ایکشن ایڈونچر جاسوسی** سیکشن میں پڑھا جا سکتا ہے۔

چچی نے واقعی پورے محلے میں کہرام مچا رکھا تھا۔ رات بھی چچا تندوری گھر سے غائب رہے تھے اور دوسرا دن گزرنے کے بعد بھی اب تک ان کا کہیں پتا نہیں تھا۔

چچی نے جیسے تیسے رات تو گزار ہی لی تھی لیکن آج علی الصبح سے محلے بھر میں ہر ایک سے ان کے بارے میں پوچھتی پھر رہی تھیں۔ لیکن ابھی تک کسی قسم کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ ہر کوئی لاعلم تھا۔ کسی نے بھی چچا تندوری کو کہیں آتے جاتے اور کسی سے ملتے ملاتے نہیں دیکھا تھا۔ البتہ مشورے ایک سے ایک مل رہے تھے، کوئی کہتا کہ پولیس میں رپورٹ لکھوادو، کوئی اخبار میں اشتہار دینے کا مشورہ دیتا اور کوئی اسے صیہونی سازش کہہ کر چچی کا دل دہلا دیتا۔

جب ملو استاد اور کلو چرسی کو چچا تندوری کی گمشدگی کا علم ہوا تو وہ بھی بھاگے بھاگے چچی کے پاس آئے۔ اتفاق سے چچی اسی وقت تھک ہار کر گھر میں آبیٹھی تھیں۔ ان کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔

‘‘کیا ہوا چچی......؟ ہمارے گناہ گار کانوں نے یہ کیا سنا ہے؟’’ ملو استاد نے آتے ہی سوال کیا۔

‘‘بالکل ٹھیک سنا ہے ملو...... بالکل ٹھیک سنا ہے۔’’ چچی نے متاسف انداز میں گردن ہلائی۔

‘‘یہ آخر چچا کا چکر ہے کیا......؟’’ کلو چرسی کے منہ سے نکلا۔ ‘‘ان کا معاملہ ایک طرف کیوں نہیں ہوتا......؟’’

‘‘کیا مطلب......؟’’ چچی نے اسے گھورا۔

‘‘ہاں نہیں تو......’’ کلو چرسی نے گردن جھٹکی۔ ‘‘خواہ مخواہ تمہیں پریشان کر کے رکھا ہوا ہے۔ تم سمجھاتی نہیں ہو؟’’

‘‘بہت سمجھاتی ہوں۔ پھر بھی......’’

‘‘انہوں نے کوئی دوسری شادی تو نہیں کر رکھی......؟’’ ملو استاد نے محتاط لہجے میں پوچھا۔

‘‘تمہارے منہ میں خاک۔’’ چچی نے منہ بنایا۔ ‘‘نہیں کر رکھی۔’’

‘‘ان کا کسی سے نین مٹکا تو نہیں ہو رہا؟’’ کلو چرسی نے بھی پوچھا۔

‘‘تمہارے بھی منہ میں خاک......’’ چچی بولیں۔ ‘‘نہیں ہو رہا۔’’

‘‘بس...... تو پھر چچا سٹک گئے ہیں۔’’ ملو استاد نے جھنجھلا کر کہا۔ ‘‘کسی اچھے سے ڈاکٹر سے ان کا علاج کرواؤ۔’’

‘‘میرے خیال سے ان کے مطلب کا ڈاکٹر ‘‘کے ایم سی’’ کے دفتر میں ملے گا۔’’ کلو چرسی نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

‘‘کیا تمہارا دماغ خراب ہے......’’ چچی نے اسے گھورا۔ ‘‘وہاں تو کچرا اٹھانے والی گاڑیاں ہوتی ہیں۔’’

‘‘بس...... وہی تو ان کا علاج ہے۔ ان میں سے کوئی بھی گاڑی آئے گی اور ان کو اٹھا کر لے جائے گی۔ نہ دوا نہ انجکشن اور فوری آرام......’’

‘‘چل ہٹ بدبخت......!’’ چچی بھڑک اٹھیں۔ ‘‘تیرا ستیاناس......’’

کلو چرسی بے ڈھنگے پن سے ہنس دیا۔ پھر فوراً ہی سنجیدہ ہو کر بولا۔ ‘‘اچھا...... تم فکر مت کرو چچی......! ہم پتا لگاتے ہیں...... دعا کرو کہ چچا

جلدی مل جائیں۔ بھلے کہیں پڑے ہوئے ہی مل جائیں۔“

اوراس سے پہلے کہ چچی اسے خون خوار نظروں سے گھورتیں، اس نے فوراً ہی ملوا استاد کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔

بہرحال پھر تھوڑی دیر کی دوڑ دھوپ کے بعد ایک اور بات ان کے سامنے آئی جو کافی حیرت انگیز تھی۔ حکیم طولانی بھی علاقے سے لا پتہ تھے اور ان کے غائب ہونے کی مدت بھی تقریباً وہی تھی، جو چچا تندوری کی تھی۔

☆......☆......☆

بوقاف...... ایک بار پھر ہال میں تنہا تھا، اور اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ وہ کنگ کانگ کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ کتنا نام تھا اس کا......؟ لوگوں میں اس کی الگ دھاک تھی اور بقول اس کے آدمیوں کے کہ پولیس بھی اس سے ڈرتی تھی۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ کنگ کانگ کوئی بہت ”دھاکڑ“ اور ”توپ“ قسم کی شخصیت تھی۔ ظاہر ہے کہ جس آدمی کا اتنا رعب اور دبدبہ ہو...... وہ کیسا ہوگا۔

ذہن کے کسی گوشے میں یہ خدشہ بوقاف کو پریشان سا کرنے لگا تھا کہ کہیں کنگ کانگ کو للکار کر اس نے غلطی تو نہیں کی......؟ یہ حقیقت تو اٹل تھی کہ وہ اب اپنے ”جناتی خواص“ سے محروم تھا۔ اب وہ ایک انسان تھا...... عام سا انسان......! اور انسان بننے کے بعد اس نے پنگا بھی لیا تھا تو کس سے......؟ اب تک نادیدہ رہنے والے کنگ کانگ سے...... جس کے نام سے بھی لوگ دہشت کھاتے تھے، ڈرتے تھے اور کانپتے تھے۔

اب بوقاف کو احساس ہو رہا تھا کہ اس نے فلم ”کنگ کانگ“ غور سے کیوں نہ دیکھی۔ کیونکہ پوری فلم کے دوران اس کی نظریں کنگ کانگ کے بجائے اس کی ہیروئن پر ہی جمی رہی تھیں۔ اب اسے افسوس ہو رہا تھا کہ کاش......! وہ ایک نظر اسی پہلے والے کنگ کانگ پر بھی ڈال لیتا تو اس دوسرے کنگ کانگ کے نرغے میں نہ پھنستا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا......؟

اب کسی بھی آن اسے دوسرے کنگ کانگ کا سامنا کرنا تھا۔ اس وقت بوقاف اتنا مضطرب ہوا کہ خواہ مخواہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ شاید اس طرح وہ ذہنی تناؤ کو کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

دفعتاً دروازے پر قدموں کی آہٹیں گونجیں۔ بوقاف نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اسی وقت دروازہ کھلا تھا اور بوقاف کو پرانے چہروں کے ساتھ ایک نیا چہرہ بھی دکھائی دیا۔

یہ نیا چہرہ، ایک نحیف ونزار بوڑھے کا تھا، جسے دونوں جانب سے استادوں نے سنبھال رکھا تھا۔ وہ بوڑھا شخص اتنا عمر رسیدہ اور کمزور تھا کہ اس کا پورا جسم باقاعدہ ہل رہا تھا۔ اس کے قدم بھی بہ مشکل اٹھ رہے تھے۔

اگر اسے استادوں نے پکڑ نہ رکھا ہوتا تو یقیناً وہ بوڑھا فرش پر لمبا لمبا لیٹ چکا ہوتا۔

بوقاف بڑے غور سے بوڑھے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

استادوں کے سہارے کی بنا پر وہ بوڑھا آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور بوقاف کی جانب ایک قہر آلود نگاہ ڈالتے ہوئے کانپتی ہوئی آواز میں دہاڑا۔

''تم......کو......جرأت......کیسے......ہوئی......ہمارے......آ......آ......آدمی پر......ہا......ہاتھ......اٹھا......اٹھانے کی......؟''

یہ سن کر بوقاف چونکا اور پھر بوڑھے پر ایک طائرانہ سی نظر ڈال کر دائیں جانب کھڑے ہوئے ایک استاد سے مخاطب ہوا۔ ''یہ کیا......کنگ کانگ کے دادا جان ہیں......؟''

''بکواس مت کرو۔'' استاد غصے سے دہاڑا۔ ''تم کنگ کانگ کی توہین کر رہے ہو......؟''

''کنگ کانگ کی توہین......؟ کیا مطلب......؟'' بوقاف نے الجھن کے عالم میں اس کی شکل دیکھی۔

''ہاں......یہ دادا نہیں بلکہ خود کنگ کانگ ہیں۔'' استاد نے انکشاف کیا۔

''کیا......!'' بوقاف کے حلق سے برآمد ہونے والی آواز نے پورے کمرے کو دہلا دیا اور پھر بولا۔ ''کنگ کانگ نہیں بلکہ دنیا کا دسواں عجوبہ۔'' یہ لفظ سنتے ہی موجود تمام بدمعاش اور خود کنگ کانگ پلکیں جھپکانا بھول گئے۔

☆......☆......☆

غار میں اندھیرا تھا۔ چچا تندوری نے فوراً ہی قمیض کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ٹارچ نکالی اور اس کا بٹن دبا دیا۔ یہ ٹارچ انہیں قالان نے ہی دی تھی، تا کہ غار میں روشنی کا خاطر خواہ انتظام ہو سکے۔ ٹارچ کافی طاقتور ثابت ہوئی، کیونکہ اگلے ہی لمحے غار روشنی میں نہا گیا تھا۔

حکیم طولانی ڈرے ڈرے انداز میں ان کے عقب میں کھڑے تھے۔ جبکہ چچا تندوری شعلہ بار اور چوکنا آنکھوں سے غار کا جائزہ لے رہے تھے۔

پھر چچا تندوری اور آگے بڑھے، غار میں ہر طرف سکوت اور خاموشی کا راج تھا۔ گھٹاٹوپ اندھیرا جس کا لامتناہی سلسلہ دور تک پھیلا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

''یہاں......یہاں تو کوئی بھی نہیں دکھائی دے رہا۔'' حکیم طولانی کے منہ سے نکلا۔ ان کی آواز کی گونج بھی سنائی دی۔

''بدروحیں دکھائی کب دیتی ہیں؟'' چچا تندوری نے انہیں تیز نظروں سے گھورا۔

''ارے باپ رے باپ......'' حکیم طولانی نے بے ساختہ انگلیاں منہ میں دبالیں۔ ان کے چہرے پر دہشت کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔

''کہاں ہو بھئی بدروحو......! سامنے تو آؤ۔'' چچا تندوری بلند آواز سے بولے۔

کوئی جواب نہ ملا۔ تھوڑی دیر توقف کے بعد چچا تندوری نے اپنا جملہ پھر دہرایا۔ اب بھی اپنے جملے کی گونج کے سوا کچھ سنائی نہ دیا۔ کہیں سے کوئی آواز نہ آئی۔

''لگتا ہے کہ یکدم ہی حملہ کریں گی۔'' حکیم طولانی نے خیال ظاہر کیا۔

''ہوں......'' چچا تندوری نے سر ہلایا۔ ''اور اس سے پہلے کہ وہ حملہ کریں......تم ان پر یلغار کر دو۔''

''یلغار......! اور میں......؟'' حکیم طولانی کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ہاں بھئی......نکالو اپنی غزلیں......اور پکاؤ طبیعت سے......''

''پکاؤ سے مراد......؟'' حکیم طولانی نے ترچھی نگاہوں سے پوچھا۔

''اماں......! بدروحوں کے دماغ کا دہی بنا ڈالو۔'' چچا تندوری نے وضاحت کی۔ ''غزلوں سے اور کیا ہوتا ہے......؟ چلو شروع ہو جاؤ۔''

حکیم طولانی نے فوراً ہی کھنکھار کر اپنا گلہ صاف کیا اور بلند آواز میں اپنی تازہ اور باسی ملی جلی غزلیں ''ٹھوکنے'' لگے۔

غزلوں کا پٹارا کیا کھلا کہ بھانت بھانت کے شعران کے منہ سے نکلنے لگے۔ اس وقت وہ بالکل سڑک کوٹنے والا انجن دکھائی دے رہے تھے۔ فرق صرف دھوئیں کا تھا۔ ورنہ حکیم طولانی کے کھمبے جیسے وجود کی گھن گرج پورے غار کو ہلا ڈال رہی تھی۔

ناحق چچا تندوری کو بھی ''یہ کوفت'' اٹھانی پڑی تھی، ورنہ حکیم طولانی کے اشعار سن کر وہ نہایت سڑے اور بھسے ہوئے منہ بنا رہے تھے۔

آخر کار چچا تندوری سے برداشت نہ ہو سکا۔ حکیم طولانی کا تو یہ عالم تھا کہ گویا وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر اپنی غزلوں میں مگن تھے۔ ان کی آنکھیں نیم وا تھیں اور منہ کے ساتھ ساتھ سر بھی بدستور ''حرکت'' میں تھا۔

چچا تندوری نے ٹارچ وہیں پٹخی اور حکیم طولانی کو اسی حال میں چھوڑ کر غار سے نکل آئے۔ کچھ فاصلے پر قماطہ اور قالان بدستور موجود تھے۔ چچا تندوری کو دیکھتے ہی وہ ان کی جانب لپکے۔

نزدیک پہنچ کر قماطہ نے پرتجسس لہجے میں پوچھا۔ ''کیا ہوا تندوری صاحب......؟''

''کچھ بھی نہیں......'' انہوں نے منہ بنا کر کہا۔ ''بدروح تو دور کی بات ہے، یہاں تو ایک چوہا بھی نہیں ہے۔''

''واقعی......؟'' دونوں کے منہ سے نکلا۔

''ہاں......اور اگر وہاں کوئی موجود بھی ہے تو اس وقت سخت عذاب میں مبتلا ہوگا۔''

''کیوں......؟'' قماطہ نے چونک کر پوچھا۔

''اندر حکیم صاحب اپنی غزلیں سنا رہے ہیں۔'' چچا تندوری نے بتایا۔ ''کون ٹکے وہاں......؟''

''اوہ......'' دونوں کے منہ سے نکلا۔ پھر قماطہ نے کہا۔ ''اکیلا دیکھ کر کہیں کوئی بدروح انہیں کسی قسم کا نقصان نہ پہنچا دے۔''

''کچھ نہیں ہوگا......'' وہ لاپروائی سے بولے۔ ''ابھی اندر چلتے ہیں، ذرا ان کے دل کی بھڑاس نکل جائے۔''

''ہم بھی چلیں......؟'' قماطہ نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں بھئی......جتنا ڈرو گے، اتنا مرو گے۔ یہ بات یاد رکھو اور کبھی بھی رب کے سوا کسی سے نہ ڈرو......پھر سب تم سے ڈریں گے۔'' چچا تندوری نے سنجیدہ لہجے میں نصیحت کی۔

قماطہ نے غور سے ان کی طرف دیکھا اور پرخیال انداز میں سر کو جنبش دی۔ قالان بھی چچا تندوری کی اس بات سے کافی متاثر ہوا تھا۔ اس بات کا یہ اثر ہوا کہ جب چچا تندوری تھوڑی دیر بعد غار میں داخل ہوئے تو قماطہ اور قالان بھی ان کے ہمراہ تھے۔

یہاں وہی عالم تھا۔ حکیم طولانی مدہوش ہو کر اس طرح غزلیں سنا رہے تھے، جیسے ان کے سامنے ہزار ہا سامعین موجود ہوں۔ چچا تندوری آگے بڑھے اور ایک زوردار جھانپڑ ان کی گدی پر رسید کر دیا۔ حکیم طولانی اچھل ہی تو پڑے، گویا ہوش میں آ گئے اور اپنی گردن سہلاتے ہوئے چچا تندوری سے پوچھا۔

''کیا مشاعرہ ختم ہو گیا......؟''

''ہاں......'' چچا تندوری نے سر ہلایا۔ ''شروع ہوئے بغیر ہی ختم ہو گیا۔ اب اپنی زبان کو ذرا آرام دو، ورنہ قیامت والے دن بے چاری تمہیں کوسے گی۔''

یہ سن کر حکیم طولانی گم صم سے ہو گئے۔ ادھر قماطہ اور قالان بڑے غور سے غار کا جائزہ لے رہے تھے۔ ابھی تک کوئی بھی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے غار میں ان کے علاوہ اور کوئی موجود ہی نہیں تھا۔

خاص طور پر قالان کے رویّے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ شرمندگی محسوس کر رہا ہے۔ کیونکہ بدروحوں کا واسطہ بھی اسی سے پڑا تھا۔ اچانک قماطہ نے جھک کر کوئی چیز اٹھالی۔ یہ ایک کاغذ تھا جو ایک چھوٹے سے پتھر کے نیچے دبا ہوا تھا۔

قماطہ نے کاغذ کھولا، اس پر صرف ایک جملہ عبرانی زبان میں تحریر تھا۔ ''ہم لوگ جا رہے ہیں۔ تم نے ہم سے بھی بڑی بلائیں بلوائی ہیں۔''
فقط: خوف زدہ بدروحیں

☆......☆......☆

شبن خیراتی، اپنی دھن میں مگن چلا جا رہا تھا۔ دھیمے سروں میں کوئی پرانا سا گیت گنگناتے ہوئے، اس کا رخ اپنے گھر کی طرف تھا۔ راستے میں ایک میدان پڑتا تھا، ایک طویل و عریض میدان......

شبن نے جیسے ہی میدان میں قدم رکھا، ایک کالے رنگ کا بلا دائیں جانب سے نکل آیا۔ شبن ٹھٹک کر رک گیا۔ ادھر وہ بلا بھی رک گیا۔ شبن نے سوچا کہ بلا جلدی سے گزرے تو وہ کنی کترا کر آگے بڑھے۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ بلی کا راستہ کاٹنا منحوس ہوتا ہے اور خاص طور پر کالی بلی کا۔

چنانچہ وہ کالے بلے کے گزرنے کا منتظر رہا۔ ادھر بلا بھی قسم کھا کر بیٹھا تھا کہ شبن کے ساتھ ساتھ ہی آگے بڑھے گا۔ کافی دیر یونہی گزر گئی، آخر کار خود بلا جھلائے ہوئے لہجے میں بول پڑا۔

''اب گزر بھی چکو...... ہاں نہیں تو......''

شبن حیران رہ گیا۔ بولنے والا بلا اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ ''تم...... تم...... بول بھی سکتے ہو؟''

''کیوں......؟'' کالا بلا تنک کر بولا۔ ''میرے بولنے پر پابندی ہے کیا......؟''

''حیرت ہے......'' شبن بڑبڑایا، پھر چونک کر بولا۔ ''ارے ہاں...... دیر تو مجھے بھی ہو رہی ہے، تم جلدی سے راستہ صاف کرو، تو میں بھی آگے بڑھوں، ورنہ اگر تم نے راستہ کاٹ دیا تو بڑی منحوسیت ہو جائے گی۔ چلو......! آگے بڑھو۔''

"بکواس مت کرو۔" کالا بلا بھنا اٹھا۔ "تم لوگوں نے خواہ مخواہ ہمیں بدنام کر رکھا ہے۔ برے کام تم لوگ کرو اور جب وہ آڑے آئیں تو ہم پر الزام ڈال دو...... خوب! تم انسان کتنے چالاک ہوتے ہو۔"

"لیکن...... لیکن......" شبن بولتے بولتے رک گیا۔

"بھاڑ میں گیا تمہارا لیکن......" کالا بلا غرایا۔ "اب جلدی سے آگے بڑھو...... ورنہ دیتا ہوں ابھی کنپٹی کے نیچے پنجہ......!"

یہ دھمکی سن کر شبن نے کان دبائے اور آگے بڑھ گیا۔ پھر وہ جیسے ہی کھلے میدان میں پہنچا، دھک سے رہ گیا۔

دو، دو آدمیوں کی کئی ٹولیاں تھیں جو اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ وہ جس سمت بھی جاتا، دو آدمی آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیتے۔

شبن کے مساموں سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ دفعتاً ان سب آدمیوں نے تمسخرانہ قہقہے لگانا شروع کر دیئے۔ گویا وہ شبن کا مذاق اڑا رہے تھے۔

"اور کتنا مارو گے مجھے......" شبن زور سے چیخا۔ "بولو......! جواب دو اے منحوس آدمیوں......؟"

"ابے......! ہمیں بھی منحوس کہہ رہا ہے......؟" اسے جواب ملا۔

نہ جانے کس ٹولی نے یہ جواب دیا تھا، اسے اندازہ نہ ہو سکا۔ "اور کیا کہوں......؟" شبن پھر چیخا۔ "تجھے اس کے علاوہ کوئی اور گالی نہیں آتی......؟" جھنجھلا کر کہا گیا۔ "کالا بلا بھی منحوس...... ہم بھی منحوس...... ابے منحوس......! کوئی اور گالی دے دے۔"

"اچھا...... تو پھر یہ لو......" اتنا کہہ کر شبن نے ایک نہایت غلیظ قسم کی گالی دے ڈالی۔

اس گالی کا انتہائی پر اثر ردعمل ہوا۔ تمام کی تمام ٹولیوں کے آدمی غصے میں بھر گئے اور پھر...... شبن کے گرد گھیرا تنگ ہوتا گیا۔ سب کے سب شدید طیش کے عالم میں آگے بڑھے۔

"اتنی گندی گالی......! ٹھہر جا......" کسی نے چلا کر کہا۔

"تم نے ہی تو کہا تھا......" شبن نے مسمسی صورت بنا کر جواب دیا۔

"ابے...... تو چھوٹی موٹی کوئی سی گالی دے دیتا......" کسی نے مشورہ دیا۔

گھیرا مزید تنگ ہو گیا۔ شبن خوف کے عالم میں جدھر بھی گھومتا، اسے دو ہی آدمی دکھائی دیتے۔ دفعتاً ان سب نے چھلانگیں لگائیں اور شبن کو چھاپ بیٹھے۔

شبن کے منہ سے گھٹی گھٹی چیخیں نکلیں، اس کی سانسیں تک رکنے لگی تھیں۔ اب بس...... کوئی گھڑی جا رہی تھی کہ اس کا دم نکل جاتا کہ اچانک ہی ایک آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

"ارے...... کیا ہوا......؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے......؟"

یہ آواز تو اس کی بیوی کی تھی۔ "میری بیوی اتنے آدمیوں کے درمیان کیا کر رہی ہے؟" شبن نے سوچا اور پھر پورے جسم کا زور لگا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ پھنسا ہوا بھی تو کئی آدمیوں میں تھا۔

”ارے......مار ڈالا......“ اس کی بیوی چیخی۔

شبن کو جیسے ہوش آ گیا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا۔

یہ تو اس کا اپنا کمرہ تھا۔ دور دور تک ان ”ٹولیوں والے حرامزدوں“ کا پتہ تک نہ تھا۔ خود شبن اپنے بستر پر موجود تھا۔ پلنگ سے تھوڑے ہی فاصلے پر اس کی بیوی اوندھے منہ پڑی ہوئی کراہ رہی تھی۔

تو......تو کیا وہ خواب دیکھ رہا تھا......؟

”اتنی زور سے دھکا دیا ہے آپ نے......“ دفعتاً اس کی بیوی کراہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تم وہاں کر کیا رہی تھیں......؟“ شبن کے منہ سے نکلا۔ وہ ابھی تک اپنے خواب کے اثر میں تھا۔

”کہاں......؟“ بیوی نے حیرت سے پوچھا۔

”کہیں......کک......کہیں بھی نہیں۔“ شبن گڑبڑا کر بولا۔

بیوی نے اسے غور سے دیکھا۔ شبن اس وقت بھی پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ ”کہیں اب کی بار آپ کے دماغ پر تو چوٹ نہیں لگی تھی......؟“ اس کی بیوی نے محتاط لہجے میں پوچھا۔

شبن نے اسے گھور کر دیکھا اور جلدی سے بولا۔ ”نن......نہیں......“

”تو پھر......؟ آخر آپ کو ہوا کیا تھا۔ میں آپ کے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ پہلے آپ نے گالیاں دیں......گندی گندی گالیاں......اور پھر مجھے زور سے دھکا دیا......اتنی زور سے کہ میں پلنگ سے نیچے جا پڑی۔“

”مم......میں نے......ایک بھیانک خواب دیکھا تھا۔“ شبن نے بتایا۔

”کیا پھر دو آدمی آپ کو مار رہے تھے؟“ اس کی بیوی نے بے ساختہ پوچھا۔

”دو ہوتے تو بھگت بھی لیتا۔“ شبن نے اسے گھورا۔ ”وہ بہت سارے تھے۔“

”یا اللہ......!“ بیوی نے چھت کی طرف دیکھا۔ ”ان کے حال پر رحم کر اور انہیں ان دو آدمیوں سے نجات دلا دے۔“

”کون سے آدمی......!“ شبن نے چونک کر پوچھا۔

”آپ کی کٹ لگانے کے لئے ہوٹل میں کتنے آدمی آتے ہیں؟“ بیوی نے بھی جواباً اسے گھورا۔

”اوہ......ہاں۔“ شبن نے جلدی سے سر ہلایا، پھر چونک کر بولا۔ ”ذرا پانی تو پلا دو......پیاس کے مارے برا حال ہے۔“

”اچھا......ابھی لاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر اس کی بیوی کمرے سے نکل گئی۔

کمرے میں شبن تنہا رہ گیا۔ اس نے ایک طویل سانس لی اور بستر سے کمر ٹکالی۔ پھر وہ آنکھیں بند کر کے آہستہ سے بڑبڑایا۔ ”اب کیا خواب میں بھی میری دھنائی ہوا کرے گی......؟“

☆......☆......☆

بوقاف حیرت کا بت بنا ہوا تھا۔ اس کے ذہن کے کسی تاریک گوشے میں بھی یہ خیال نہیں آسکتا تھا کہ کنگ کانگ ایسا ہوگا۔ اس نے تو کنگ کانگ کے کئی تصوراتی قسم کے بھیانک اور خوف ناک خاکے بنا رکھے تھے۔ کیا کیا نہ سوچا تھا اس نے......؟ لیکن صورت حال اس کے قطعی برعکس تھی۔ بوقاف کے خیالی محلات، مسمار ہو چکے تھے۔

اس کے ذہن میں کنگ کانگ کے لئے کیا تصور تھا......؟ اور کیا اس کے سامنے آیا تھا۔ کتنی ہی دیر تو وہ گم صم رہا۔ یہاں تک کہ ایک استاد نے اسے ٹوکا۔

''کیوں......؟ خوف زدہ ہو گئے ناں...... ہمارے کنگ کانگ صاحب کو دیکھ کر......''

بوقاف نے چونک کر بولنے والے کو دیکھا...... بولا کچھ نہیں۔ ''یہی تو بات ہے کنگ کانگ صاحب کی۔'' ایک اور استاد چہکا۔ ''انہیں دیکھ کر اچھے اچھوں کا پتا پانی ہو جاتا ہے۔''

اتنی دیر میں کنگ کانگ، اپنے آدمیوں کے سہارے ایک کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ وہ اب بھی شعلہ بار آنکھوں سے بوقاف کو دیکھ رہا تھا۔

کنگ کانگ کے آدمی، اسے کرسی پر بٹھا کر دائیں، بائیں مؤدب انداز میں کھڑے ہو گئے تھے۔

''اس کی...... کیا مجال...... کہ......'' کنگ کانگ نے بولنا چاہا۔ لیکن عین اسی وقت اسے زوردار قسم کی کھانسی ہوئی۔

''آپ کے سامنے کچھ بول سکے۔'' کسی استاد نے جملہ پورا کر دیا۔ کنگ کانگ نے کھانستے ہوئے اس جملے کی تائید میں سر ہلانے کی کوشش کی۔ ویسے کھانستے ہوئے اس کا پورا جسم ہل رہا تھا۔ ایک استاد نے آگے بڑھ کر اس کی پیٹھ تھپکی۔ بوقاف، کنگ کانگ کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد کنگ کانگ کی کھانسی تھمی تو ایک استاد نے بوقاف کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''کیوں......؟ ایسا باس کہیں دیکھا ہے؟''

''نہیں......'' بوقاف نے زبان کھولی۔ ''میں نے تو کسی فلم میں بھی ایسا ولن نہیں دیکھا، کبھی نہیں دیکھا......''

''ہاہاہا......'' وہ استاد ہنسا۔ ''اور نہ آئندہ کبھی دیکھو گے...... کنگ کانگ اپنی مثال آپ ہیں۔''

''واقعی......'' بوقاف نے سر ہلایا۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو...... انہیں دیکھ کر کتنی ہی دیر تک تو میں اپنے حواسوں میں نہیں رہا تھا۔''

''چلتے پھرتے 302 کا کیس ہیں ہمارے کنگ کانگ۔'' ایک اور استاد نے فخریہ لہجے میں کہا۔ ''اسی لئے تو پولیس بھی ان سے ڈرتی ہے۔''

وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اب بوقاف کی سمجھ میں آ چکا تھا کہ بے چاری پولیس، کنگ کانگ سے کیوں ڈرتی تھی۔ کنگ کانگ پر تشدد کرنا تو دور کی بات تھی۔ اگر پولیس کا کوئی اہلکار اسے صرف ایک چماٹ ہی رکھ دیتا تو شاید اسی وقت کنگ کانگ کا دم نکل جاتا۔ اس کی روح تو ویسے بھی اس ''قفس کھٹارہ'' سے نکلنے کے لئے ہر وقت بے چینی رہتی ہوگی۔ اسے تو صرف ایک بہانہ چاہئے تھا۔

تو پھر صاف ظاہر تھا کہ اس اوکھلی میں سر کون دیتا......؟ اگر خدانخواستہ کسی پولیس والے کے ایک ہی تھپٹر سے کنگ کانگ جہنم رسید ہو جاتا تو ''اوپر والوں'' کو کیا جواب دیتا......؟ یہی وجہ ہوگی کہ خود پولیس والے بھی اس 302 کے چلتے پھرتے کیس سے ڈرتے ہوں گے۔

پھر بوقاف نے استادوں پر نظر ڈالی، سب کے سب سوکھے سڑے اور ہڈیوں کی مالا تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کنگ کانگ نے اپنے گروہ میں خود اپنے جیسے ہی بندے رکھے ہوئے تھے۔

یہ سب وہ لوگ تھے، جو اپنے اپنے محلوں میں لوگوں کے چست قسم کے فقروں سے دل برداشتہ ہوں گے۔ کوئی انہیں سوکھا چوہا کہتا ہوگا، کوئی سوکھی لکڑی کہتا ہوگا اور کوئی چوسا ہوا آم...... کیا گزرتی ہوگی بے چاروں کے دلوں پر......؟ بوقاف نے سوچا۔ اسے ان کمزور لوگوں پر بے تحاشہ ترس آنے لگا۔

''کیا ہوا......؟'' ایک استاد ہنسا۔ ''تمہاری تو سٹی ہی گم ہوگئی......؟''

''تم نے بالکل ٹھیک کہا......'' بوقاف نے اس کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔ ''مجھے بھی یہی لگ رہا ہے کہ میری سٹی گم ہوگئی ہے۔''

''تو...... کہاں...... گئی......؟'' کنگ کانگ نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس کا جسم بدستور لرز رہا تھا۔ ''تمہاری...... سٹی...... کہاں...... گئی......؟''

''مم...... معلوم نہیں......'' بوقاف کے منہ سے نکلا۔

اب کنگ کانگ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ ''تم...... میں سے...... کسی نے...... اس کی...... سٹی...... چرائی ہے......؟''

''نہیں جی...... ہرگز نہیں......'' وہ یک زبان ہو کر بولے۔ ''قسم لے لیں......؟''

''تو...... پھر...... کہاں گئی......؟'' کنگ کانگ سوچ میں پڑ گیا۔

''ہوسکتا ہے یہ ساتھ لے کر نہ آیا ہو......!'' ایک استاد نے خیال ظاہر کیا۔

بوقاف نے ہونقوں کی طرح اس کی شکل دیکھی، پھر جب استاد نے اسے آنکھ ماری تو وہ جلدی سے بولا۔

''ہاں مسٹر کنگ کانگ......! میرا بھی یہی خیال ہے کہ میں اپنی سٹی گھر پر ہی بھول آیا ہوں۔''

کنگ کانگ نے مطمئن ہو کر ہلتی ہوئی گردن کو مزید جنبش دی۔ ادھر اس استاد نے تشکرانہ انداز میں بوقاف کی طرف دیکھا۔ گویا کہہ رہا ہو۔ ''شکر ہے جو تم نے سٹی سے ہماری جان چھڑوا دی، ورنہ کنگ کانگ ہم سے پوچھ گچھ کرتا۔''

''اب...... تم...... جلدی...... سے...... بتاؤ...... کہ تم نے...... ہمارے...... آدمی پر...... ہاتھ کیوں...... اٹھ...... اٹھایا......؟'' کنگ کانگ اب براہ راست بوقاف سے مخاطب ہوا۔

بوقاف نے چند لمحے کچھ سوچا اور پھر کنگ کانگ کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''مجھ سے بہت بڑی ہوگئی...... مجھے معاف کر دیں۔''

''مم...... مم...... معاف...... معاف......؟'' کنگ کانگ نے زور سے ہلتے ہوئے اپنی آنکھیں نکالیں۔ یہ گویا غصے کا اظہار تھا۔ اس کا جسم اور بھی شدت سے کانپنے لگا۔ ہونٹ لرز رہے تھے۔ شاید وہ کچھ اور بھی کہتا لیکن اسی وقت اس پر دوبارہ سے شدید کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔

یہ دورہ اتنا شدید تھا کہ بوڑھا اور ناتواں کنگ کانگ دوہرا ہوگیا۔ فوراً ہی اس کے ساتھی آگے بڑھے اور انہوں نے کنگ کانگ کی کمر تھپتھپائی۔ لیکن اب کی بار دورہ شدید تھا۔ کنگ کانگ کھانستا رہا، کھانستا رہا۔

''پانی لاؤ...... جلدی سے۔'' کسی نے چیخ کر کہا۔

فوراً ہی پانی لایا گیا۔ بوقاف حیرت سے یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کنگ کانگ کسی بھی لمحے ''انٹاغفیل'' ہو جائے گا۔ جیسے تیسے اس نے پانی کے دو گھونٹ لئے اور پھر دوبارہ کھانسنے لگا۔

''انہیں اسپتال لے چلو......'' کوئی چیخا۔ ''جلدی کرو......''

''ہاں...... ہاں۔ اٹھاؤ......''

پھر تو افراتفری سی مچ گئی۔ کسی نے کنگ کانگ کا ہاتھ پکڑا، کسی نے کمر سے تھاما اور کسی نے ٹانگوں سے۔ فوراً ہی کنگ کانگ کو کمرے سے ''ڈنڈا ڈولی'' کی صورت میں باہر نکالا گیا۔

اب وہاں بوقاف تنہا تھا اور احمقوں کی طرح دروازے کو تک رہا تھا۔ عین اسی وقت ایک استاد دروازے سے نمودار ہوا اور تقریباً دوڑتا ہوا بوقاف کے قریب پہنچ گیا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔

''ہم...... ہم...... کنگ کانگ صاحب کو...... اسپتال لے کر جا رہے ہیں۔'' وہ بہ مشکل اپنی سانسوں پر قابو پا کر بولا۔ ''خبردار......! اگر بھاگنے کی کوشش کی تو...... ہم ہم سے برا کوئی نہ ہوگا...... ہاں۔''

پھر وہ بوقاف کے جواب کا انتظار کئے بغیر سرپٹ دوڑ پڑا تھا۔ بوقاف نے اسے پیچھے سے آواز بھی دی لیکن وہ کمرے سے نکل گیا۔

بوقاف نے ایک طویل سانس لی اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا ذہن حالیہ صورت حال میں الجھ کر رہ گیا تھا۔

بے چارہ کنگ کانگ......! نہ جانے اس کا کیا حشر ہوا ہو......؟ کتنا بڑا اور نامی گرامی گنگسٹر تھا...... اپنی کھانسی کا علاج نہیں کروا سکتا......!

پھر بوقاف کو خیال آیا کہ وہ بے چارہ اتنا بوڑھا بھی تو تھا۔ اس عمر میں کوئی نہ کوئی بیماری جان سے چمٹ ہی جاتی ہے۔ شاید اس کی کھانسی لا علاج ہو......!

وہ ان ہی سوچوں میں گم تھا کہ یکا یک قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ بوقاف نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا، اتنی جلدی تو کنگ کانگ وغیرہ کی واپسی نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر یہ کون آ گیا......؟ اس نے سوالیہ نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا۔

اگلے ہی لمحے چار افراد کمرے میں داخل ہوئے۔ ان چاروں کو دیکھ کر بوقاف حیرت کے مارے کرسی سے اچھل پڑا۔ یہ چاروں گاگے شاہ، برکت صاحب اور چنگا منگا تھے۔

گاگے شاہ کے ہونٹوں پر ایک دلکش قسم کی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

☆......☆......☆

''اس میں کیا لکھا ہے بھئی......؟'' حکیم طولانی نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

''آپ کو عبرانی آتی ہے......؟'' قماطہ نے الٹا سوال کر ڈالا۔

”نہیں...... البتہ فارسی ضرور آتی ہے۔“ حکیم طولانی نے بولے۔

”شکر ہے......“ قماطہ آہستہ سے بڑبڑایا۔ ”ورنہ آپ کو اپنی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا۔“

”کیا...... ! کیا کہہ رہے ہو بھئی...... ذرا زور سے بولو......“ حکیم طولانی نے اپنا کان آگے بڑھایا۔

”تم نے اتنی زور زور سے اور چیخ چیخ کر اپنی غزلیں پڑھیں کہ خود ہی بہرے ہو گئے...... ہیں......؟“ یہ کہہ کر چچا تندوری ہنس پڑے۔

حکیم طولانی نے منہ بنا کر انہیں دیکھا۔ ”میں نے کہاں اتنی غزلیں سنائی ہیں۔ وہ تو بس دو چار ہی......“

”ہیں......؟ دو چار......؟“ چچا تندوری نے آنکھیں پھاڑیں۔ ”دو چار سو کہو...... دو چار سو......“

”ارے کہاں تندوری......“ حکیم طولانی انکسار بھرے لہجے میں بولے۔ ”تمہیں ضرور وہم ہوا ہے۔“

”چلو...... یہ وہم کی بیماری کم از کم تمہاری بیماری سے تو اچھی ہے۔“ چچا تندوری نے لاپروائی کا مظاہرہ کیا۔ حکیم طولانی نے فوراً انہیں نظر انداز کیا اور قماطہ کی طرف گھومے۔

”کیا لکھا تھا اس پرچے میں؟“

”بدروحیں یہاں سے بھاگ چکی ہیں۔“ قماطہ نے اطلاع دی۔ ”پرچے میں ان بدروحوں کی طرف سے یہی پیغام لکھا ہوا ہے۔“

”غزلیں سن کر......؟“ چچا تندوری پھر ہنسے۔

”یہ نہیں لکھا۔“ قماطہ فوراً بولا۔

”وہ غزلوں سے نہیں، بلکہ تمہیں دیکھ کر بھاگی ہوں گی۔“ حکیم طولانی منہ بنا کر چچا تندوری سے مخاطب ہوئے۔ ”مہینوں تو تم نہاتے نہیں ہو۔“

”اچھا...... اس کا مطلب یہ ہوا کہ بدروحیں نہاتی ہیں۔“ چچا تندوری نے سمجھ جانے والے انداز میں سر ہلایا۔ ”پھر تم...... یہ تو بتاؤ کہ وہ کون سا صابن استعمال کرتی ہیں؟“

حکیم طولانی فوراً ہی بغلیں جھانکنے لگے۔ اسی وقت قماطہ نے دخل اندازی کی۔

”وہ کسی طرح بھی بھاگیں...... بہرحال بھاگ گئیں اور ہم یہی چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں ہم آپ دونوں کے شکر گزار بھی ہیں۔“

”بس...... تو پھر جلدی سے ہمیں واپس ہمارے قصبے میں پہنچا دو۔“ حکیم طولانی فوراً بول اٹھے۔

”وہ تو ہم پہنچا دیں گے...... لیکن......“ قماطہ بولتے بولتے رک گیا۔

”لیکن کیا......“ حکیم طولانی نے غور سے اسے دیکھا۔ چچا تندوری بھی اسی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔ رہا قالان...... تو وہ بے چارہ اپنے سردار کی موجودگی کے باعث گم صم اور خاموش ہی تھا۔

”لیکن یہ کہ...... میں ابھی آپ لوگوں کو یہاں سے رخصت نہیں کرنا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ابھی میرے مہمان ہی رہیں۔“

''ہمارے سر پر سینگ نہیں ہیں بھئی...... ہاں......'' چچا تندوری فوراً بولے۔

''وہ تو مجھے بھی معلوم ہے۔'' قماطہ پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ یہاں قالان کی صدارت میں ایک اہم کانفرنس ہونے والی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ دونوں بھی اس کانفرنس میں شریک ہوں۔''

''کون کون ہوگا کانفرنس میں......؟'' حکیم طولانی نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''کئی قبیلوں کے جن سردار اس میں شریک ہوں گے۔'' قماطہ نے بتایا۔

''ارے باپ رے......'' حکیم طولانی کے منہ سے نکلا۔ ''سارے کے سارے جن ہوں گے......؟''

''تو تمہارا کیا خیال ہے......؟ گدھے گھوڑے بھی ہونے چاہئیں......؟'' چچا تندوری نے منہ بنایا۔

''مم......میرا مطلب یہ تھا کہ اتنے جنوں میں ہم دو انسان کیا کریں گے؟'' حکیم طولانی نے وضاحت کی۔

''ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھیں گے۔'' چچا تندوری بولے۔

''کس پر......؟'' حکیم طولانی نے چونک کر پوچھا۔

''اپنے اوپر......اور کیا جنوں پر......؟'' چچا تندوری تنک کر بولے۔ ''اتنی کٹ لگے گی کہ ہڈیاں بھی نہیں ملیں گی، اگر ان پر فاتحہ پڑھی۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' قماطہ نے جلدی سے کہا۔ ''آپ اس خیال کو دل سے نکال دیں۔ میں آپ دونوں کو وہاں جنوں کے ہی روپ میں لے کر چلوں گا۔''

''اماں......ہم انسان تو ٹھیک سے بنے نہیں، اور تم جن بنانے کے چکر میں ہو۔'' چچا تندوری نے پھر منہ بنایا۔ ادھر قالان کا انداز بتا رہا تھا کہ اسے اپنے سردار کی یہ بات پسند نہیں آئی۔ لیکن وہ بولا کچھ نہیں تھا۔

''اب آپ کچھ بھی کہیں......لیکن میری یہی خواہش ہے کہ آپ بھی اس میٹنگ میں شریک ہوں۔'' قماطہ نے پھر کہا۔

''میٹنگ ہے کب......؟''

''پرسوں......''

''لیکن ہمارے گھر والوں کا کیا ہوگا......؟''

''ان کی آپ فکر نہ کریں۔ ہم انہیں خیریت کی اطلاع کروا دیں گے۔ فون تو ہوگا نا آپ لوگوں کے گھروں میں؟''

''ہاں......فون تو ہے......'' حکیم طولانی نے سر ہلایا۔

''میرے گھر میں فون وون نہیں ہے۔'' چچا تندوری نے فوراً ہاتھ ہلایا۔

''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں سب سنبھال لوں گا۔ حکیم صاحب......! آپ اپنے گھر کا فون نمبر بتائیں......؟''

☆......☆......☆

سردار کے دل میں لڈو پھوٹے پڑ رہے تھے کافی دنوں سے اس کے رگ و پے میں جو خواہش خون کی طرح گردش کر رہی تھی، وہ اگلے چند لمحوں میں پوری ہونے والی تھی۔

حالانکہ وہ جنوں کا سردار تھا، خواہش کا لفظ اس کے لئے استعمال کرنا کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ اسے کس چیز کی کمی ہو سکتی تھی......؟ لیکن یہ معاملہ......دل کا معاملہ تھا، جس میں بڑے بڑوں کا پتا، پانی ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ سردار کو ہمت کا دامن تھامنے میں کافی وقت لگا۔

آج لاسنی سے اس کی ملاقات ہونے والی تھی۔ وہ لاسنی......! جو کچھ عرصہ پہلے رقص و آہنگ کی ایک محفل میں آ کر سردار کے حواسوں پر چھا گئی تھی، وہی لاسنی......جو بالکل ایشوریہ رائے لگتی تھی۔

آج ''پارک'' میں وہ پری روش لاسنی کو اپنے دل کی بات سنانے والا تھا۔ پارک میں اس وقت انسانوں کا ہجوم تھا۔ لیکن سردار کو ان سے کیا غرض تھی......؟ وہ تو ایک خالی بنچ پر بیٹھ کر لاسنی کے انتظار میں پہلو بدل رہا تھا۔

ویسے بھی وہ انسانوں کی نظروں سے اوجھل تھا۔ یوں تو حضرت انسان خود بھی اس وقت اتنی موج و مستیوں میں گم تھے کہ اگر سردار انہیں دکھائی دے جاتا تو وہ اس کے سینگوں کو کسی قسم کا ''جوک'' سمجھ کر اسے نظر انداز کر دیتے۔

ہر طرف شور شرابا اپنے عروج پر تھا۔ ہر انسان، بچہ یا جوان......خر مستیوں میں مصروف تھا۔ لیکن سردار ان سب سے گویا برگشتہ ہو کر صرف لاسنی کا منتظر تھا۔

اور پھر اس کے دل کی مراد بر آئی۔ سامنے سے لاسنی چلی آ رہی تھی۔ اس کا رخ سردار ہی کی جانب تھا اور ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ تھی۔ سردار اسے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ لاسنی قریب آئی تو سردار نے لہک کر اس کا استقبال کیا۔ ''کیسی ہو لاسنی......؟''

''بالکل ٹھیک ٹھاک......آپ سنایئے......؟''

''تم سے ملنے سے پہلے تک ٹھیک ٹھاک تھا۔'' سردار نے بتایا۔ ''لیکن جب سے تمہیں رقص کی محفل میں دیکھا ہے......میری خیریت ہی کہیں کھو گئی ہے۔''

یہ سن کر لاسنی نے ایک کھنکتا ہوا قہقہہ لگایا، جس کی بدولت وہ اور بھی خوب صورت دکھائی دینے لگی۔ ''تم تو اپنے ساتھ نہیں لے گئی تھیں؟'' سردار نے پھر کہا۔

''کیا......؟'' وہ چونکی۔

''میری خیریت......'' سردار نے مسمسی صورت بنائی۔

وہ پھر زور سے ہنس پڑی۔ پھر خود پر قابو پا کر بولی۔

''سردار......! آپ مذاق اچھا کر لیتے ہیں۔''

''تم دل کے معاملے کو مذاق کہہ رہی ہو......'' سردار نے آنکھیں نکالیں۔ لاسنی پھر سے ہنسی کے مارے دہری ہو گئی۔ ''خیر......خیر......

اڑالو مذاق...... میرے لئے تو اتنا ہی بہت ہے کہ تم اس وقت میرے روبرو ہو۔"

"آپ سے ملاقات ہونا، اتنا مشکل کام بھی نہیں ہے۔" لاسنی نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "آپ کے فون کالز تو مجھے موصول ہو رہے تھے، لیکن میں بہت مصروف تھی، اسی لئے آپ سے مل نہ سکی۔ آج مجھے بالکل فرصت تھی، اسی لئے میں فوراً چلی آئی۔"

"اوہ...... اچھا...... یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آج میرے ستارے عروج پر ہوں۔" سردار نے مسکرا کر کہا۔ جواباً لاسنی ہنس پڑی۔ پھر دفعتاً وہ چونک کر بولی۔

"ارے ہاں یہ پارک تو الہٰ دین کا ہے۔"

"ہاں...... تو......؟" سردار نے حیرت سے پوچھا۔

"اگر الہٰ دین یہاں آ گیا تو......؟ وہ ویسے بھی ہم لوگوں کا دشمن ہے۔ آپ کو تو معلوم ہی ہوگا کہ دو جن اس نے اپنے قبضے میں کر رکھے تھے۔

"بہت ظالم انسان ہے وہ......!"

"ہاں...... ہے تو وہ ظالم ہی......" سردار نے اس کی تائید کی۔ "لیکن یہ پارک اس کے باپ کی جاگیر نہیں ہے، بلکہ حکومت نے جنوں پر قبضہ کرنے کے صلے میں یہ پارک اس کے نام سے منسوب کیا ہے۔"

"اوہ......" وہ چونکی۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ گورنمنٹ بھی ہم لوگوں کے خلاف ہے۔"

"تو کیا ہوا......؟" سردار لاپروائی سے بولا۔ "ان لوگوں کی گورنمنٹ تو آنی جانی شئے ہے۔ آج ہے تو کل نہیں ہوگی۔"

"ایسا کیوں ہوتا ہے......؟" لاسنی نے پوچھا۔

"یہ عوام...... خود اپنے آپ سے مطمئن نہیں ہے۔" سردار نے جواب دیا۔ پھر وہ چونک کر بولا۔ "ارے ہاں...... یہ ہم لوگ کیا باتیں لے کر بیٹھ گئے......؟ چھوڑو......! آؤ اپنی باتیں کریں۔"

"کون سی اپنی باتیں......؟" وہ پھر ہنسی۔ یہ شاید اس کی عادت تھی۔

"بھئی...... دل لبھانے والی باتیں...... جن کو سن کر من کے جوار بھاٹا میں ہلچل سی مچ جائے......"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ بھی انڈین فلمیں بہت شوق سے دیکھتے ہیں۔" لاسنی نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کون نہیں دیکھتا......؟ اگر یہ الزام ہے تو کیا تم خود اس الزام سے بری ہو......؟"

"نہیں...... میں بھی ایشوریہ رائے سے انسپائر ہوں۔" وہ شرما کر بولی۔

"ہوں...... اس سے کم تو تم بھی نہیں ہو۔" سردار نے گردن ہلا کر کہا۔ لاسنی کا چہرہ کھل اٹھا۔ اسے اپنی تعریف کافی پسند آئی تھی۔ موقع غنیمت جان کر سردار پھر بولا۔

"تم واقعی بہت خوب صورت ہو لاسنی......! بہت خوب صورت ہو...... تم نے اپنے لئے میرے دل میں ایسی جگہ بنالی ہے کہ بس......"

اور اس سے پہلے کہ سردار مزید تعریفوں کے پل باندھ کر ہوائی قلعے کی فصیل تک پہنچتا، عین اسی وقت سردار کا تابعدار سیکریٹری وہاں نازل ہو گیا۔

وہ یک دم ہی سامنے آیا تھا۔ اس وقت سردار، لاسنی کے کافی قریب کھسک چکا تھا۔ سیکریٹری کی اچانک آمد نے لمحہ بھر کے لئے اسے بھی بوکھلا دیا۔ خود لاسنی بھی حیرت سے سیکریٹری کو دیکھ رہی تھی۔

ادھر سیکریٹری موجودہ صورت حال کو دیکھ کر گڑبڑا گیا۔ اس کے چہرے پر عجیب قسم کے تاثرات تھے۔ جن میں حیرت جھنجھلاہٹ، غصہ اور شرمندگی سب ہی کچھ شامل تھا۔ اس کا منہ بھی کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

''منہ بند کرو......'' سردار کسی قدر خود کو سنبھال کر اس سے مخاطب ہوا۔ ''ورنہ کوئی مظلوم مکھی اس میں اپنا گھر بنا لے گی۔''

''اور آنکھیں......سردار......!'' سیکریٹری نے سوال کیا تھا۔ اس کی چبھتی ہوئی نظریں، لاسنی کو دیکھ رہی تھیں۔

''یا تو اپنی ان آنکھوں سے کہو کہ یہ منظر بھول جائیں۔'' سردار کی آواز پروقار تھی۔ ''یا پھر انہیں پھوڑ ڈالو......''

''بھولنے والی ترکیب زیادہ آزمودہ ہے۔'' سیکریٹری فوراً بولا۔ ''میں انہیں سمجھا دوں گا...... یہ بتائیں کہ......آپ یہاں کیا کر رہے ہیں......؟''

''دیکھ نہیں رہے......؟'' سردار گرجا۔

''میں نے اپنی آنکھوں کو آپ کی کہی ہوئی بات سمجھا دی ہے۔'' سیکریٹری کراہ کر بولا۔ ''اب یہ کیسے دیکھیں گی؟ آپ خود ہی بتا دیں۔''

''کافی عقل مند ہو۔'' سردار نے سر ہلایا۔ ''اچھا تو سنو......! میں یہاں ایک اہم میٹنگ میں مصروف ہوں۔''

''اچھا......!'' سیکریٹری نے سعادت مندی سے کہا۔ ''بتانے کا شکریہ۔''

''اب تم یہ بتاؤ کہ منہ اٹھا کر کیوں چلے آئے ہو......؟'' سردار نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''دراصل......آپ کو کچھ یاد دلانا تھا۔''

''کیا......!''

''آپ جلد سے جلد اس میٹنگ سے فارغ ہو جائیں۔'' سیکریٹری نے لاسنی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''کیونکہ آپ کو ایک اور میٹنگ میں شریک ہونا ہے۔''

''کون سی میٹنگ میں......؟''

''آپ بھول بھی گئے......! ارے جناب......! ہمالیہ کی ترائی میں 'انجمن انسداد جن گردی' کی کل میٹنگ ہونے والی ہے اور اس میں آپ کو شریک ہونا ہے۔'' سیکریٹری نے یاد دلایا۔

''اوہ......اوہ......'' سردار چونکا۔ ''میں تو بالکل ہی بھول گیا تھا۔ اچھا ہوا تم نے یاد دلا دیا۔''

”جو چیزیں آپ نے یاد رکھی ہوئی ہیں، وہ بھی اتنی بری تو نہیں ہیں۔“ سیکریٹری نے پھر لاسنی کی طرف دیکھا۔

”بکومت......“ سردار نے اسے گھورا۔ ”یہ بتاؤ کہ میٹنگ کس وقت ہے......؟“

☆......☆......☆

”انجمن انسداد جن گردی“ کے تحت منعقد ہونے والی میٹنگ کا انتظام انتہائی منظم طریقے سے ہوا تھا اور اس کا سارا کریڈٹ......قالان اور اس کے ساتھیوں کو جاتا تھا، جنہوں نے اس میٹنگ کے انعقاد کے لئے ان تھک محنت اور چابکدستی کا مظاہرہ کیا تھا۔ صفائی ستھرائی، ڈیکوریشن، کراکری......غرض ہر چیز سے نفاست ٹپک رہی تھی۔

وادی کے کھلے حصے میں ”لذت وکام ودہن“ کا اہتمام کیا گیا تھا، جبکہ سبز پتوں اور قدرتی بیلوں سے ڈھکی ہوئی جگہ میں میزیں اور کرسیاں بچھا کر ایک لمبی قطار بنادی گئی تھی۔ میٹنگ اسی جگہ تھی۔ ان کرسیوں میں خود قالان کی نشست نمایاں تھی، کیونکہ وہ اس تنظیم کا سربراہ تھا۔

ان تمام انتظامات کے علاوہ قالان نے وادی کے چاروں طرف محافظوں کا جال بھی بچھا رکھا تھا تاکہ کسی بھی غیر ممکنہ خطرے سے فوری طور پر نمٹا جا سکے۔

یہاں خاص الخاص افراد (جنوں کے سردار) مدعو تھے۔ خدانخواستہ اگر انسانوں کے عاملوں کو اس میٹنگ کی بھنک پڑ جاتی......، تو وہ یہاں ”حملہ“ کر سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ قالان نے محافظ بھی تعینات کر دیئے تھے۔

وادی میں پھر کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بدروحیں واقعی بھاگ کھڑی ہوئی تھیں اور ظاہر ہے کہ اس مشکل ترین کام کا سارا کریڈٹ چچا تندوری کو جاتا تھا۔

یہ سب تو قالان کو تسلیم تھا، لیکن اسے یہ بات ہرگز منظور نہیں تھی کہ چچا تندوری اور حکیم طولانی کو بھی اس میٹنگ میں شریک کیا جائے۔ کیونکہ کچھ بھی سہی......آخر کو وہ انسان تھے......ان کا یہاں کیا کام......؟

اپنے سردار کی ضد کے آگے وہ خاموش تو رہا تھا، لیکن دل ہی دل میں کڑھ کر رہ گیا تھا۔ اسے یہ بات قطعی پسند نہیں آئی تھی۔ بہرحال، تمام انتظامات کا سرسری جائزہ لے کر وہ اپنی مخصوص کرسی پر آ بیٹھا۔ اس کے چاروں ساتھی کارکن، یعنی گاسا، جبروش، اشاق اور طوھارا استقبالیہ کی جگہ پر کھڑے ہوئے تھے۔

مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور سب سے پہلے خود قالان کے قبیلے کا سردار قماطہ، دو عدد جنوں کے ساتھ نمودار ہوا۔ دونوں جن اس کے دائیں اور بائیں پہلو سے لگ کر چل رہے تھے۔ ان دونوں کو دیکھ کر نہ جانے کیوں قالان کے ماتھے پر شکنیں ابھریں اور پھر فوراً ہی معدوم ہو گئیں۔

قماطہ کے ساتھ آنے والے ادھر ادھر گردنیں گھما کر گویا معائنہ کر رہے تھے۔ قماطہ نے فوراً ہی انہیں کہنیاں ماریں۔ دونوں سیدھے ہو گئے۔ اب قماطہ آگے بڑھا اور اس نے قالان سے ہاتھ ملا کر اس کے برابر میں رکھی ہوئی کرسی سنبھال لی۔

اس کے دونوں ساتھیوں نے بھی اس کی تقلید کرتے ہوئے دوسری کرسیاں کھسکائیں اور ان پر براجمان ہو گئے۔ ”ذرا......احتیاط سے

......" قماطہ نے جھک کر ان دونوں کے کانوں میں سرگوشی کی۔ "آپ دونوں کوشش کیجیے گا کہ خاموش ہی رہیں...... باقی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

"اچھا...... اچھا۔ ٹھیک ہے۔" ان میں سے ایک نے زور سے گردن ہلائی۔ پھر چونک کر اپنے سینگوں کو ٹٹولنے لگا۔ پھر وہ قماطہ سے مخاطب ہوا تھا۔

"یہ گریں گے تو نہیں نا......؟" اس کا اشارہ سینگوں کی طرف تھا۔

"ارے آپ کیا کر رہے ہیں......؟" قماطہ بوکھلا اٹھا۔ "آپ تو مجھے مروا دیں گے حکیم صاحب......!"

"میں تو صرف پوچھ رہا تھا۔" جن نے مسمسی صورت بنا کر کہا۔ جو در حقیقت حکیم طولانی ہی تھے۔

قالان نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کی تھی۔

"ان سینگوں کو کچھ نہیں ہوگا...... آپ بے فکر رہیں۔" قماطہ نے حکیم طولانی کو دلاسہ دیا۔ "لیکن خدا کے واسطے......! مہمانوں کے سامنے مت ٹٹولنے لگ جائیے گا۔"

"ہرگز نہیں۔ وہ تو میں......" حکیم صاحب نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

"تمہاری گردن تو گر جائے گی حکیم صاحب......!" دوسرا جن بولا۔ جو کہ چچا تندوری تھے۔ "لیکن سینگ نہیں گریں گے۔" حکیم طولانی نے انہیں گھور کر دیکھا۔

دراصل قماطہ نے خود ہی ان دونوں کو جن کا روپ دیا تھا، تا کہ وہ میٹنگ میں شریک ہو سکیں۔ "ایسا کچھ نہیں ہوگا۔" قماطہ بول اٹھا۔ "میں اس بات کی ضمانت دیتا ہوں۔"

اور پھر سب نے خاموشی اختیار کر لی تھی، کیونکہ استقبالیہ کی طرف سے کچھ نئے مہمان ان کی جانب رخ کر رہے تھے۔ آہستہ آہستہ تمام کرسیاں مہمانوں سے پر ہو گئیں۔ یہ تمام کے تمام اپنے اپنے قبیلوں کے سردار تھے۔

پھر قالان اٹھ کھڑا ہوا۔ سب سے پہلے اس نے با آواز بلند تمام لوگوں کا آپس میں تعارف کروایا۔ چچا تندوری اور حکیم طولانی کی طرف جب وہ گھوما تو ان کے لئے بھی اسے دو عدد نئے قبیلے پیدا کرنے پڑے تھے۔

تھوڑی سی رسمی گفتگو کے بعد جب قالان اصل موضوع پر بات چیت شروع کرنے ہی والا تھا کہ اچانک ایک مہمان سردار اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

یہ قد و قامت میں کافی لمبا تڑنگا تھا، اس کا جسم اتنا پھیلا ہوا تھا کہ دیکھ کر کسی سرمئی رنگت والے پہاڑ کا گمان ہوتا تھا۔ اس کا چہرہ بھی کافی کرخت تھا۔ وہ اپنی ناک پر زور دے کر چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

"کیا ہوا......؟ اے قرطابہ قبیلے کے سردار......؟" قالان نے اسے مضطرب دیکھ کر پوچھا۔ "آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔"

"ہاں......" اس کی آواز بھی گرج دار تھی۔ "مجھے آدم بو آ رہی ہے...... آدم بو......!"

☆......☆......☆

بوقاف، شدید حیرت کے عالم میں ایک ایک کی شکل تک رہا تھا۔ گاگے شاہ کی معنی خیز مسکراہٹ، چنگا اور منگا کی ترچھی ترچھی نظروں اور برکت صاحب کے عجیب قسم کے انداز نے اسے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ برکت صاحب کے چہرے سے محبت اور شفقت پھوٹ رہی تھی۔

اچانک وہ نہایت وارفتگی کے عالم میں آگے بڑھے اور بوقاف کے گرد اپنی بانہیں حمائل کرتے ہوئے خوشی سے بھرپور لہجے میں بولے۔ ''ارے...... میرے بوقاف...... کدھر غائب ہوگئے تھے تم......؟ میں نے تمہیں کہاں کہاں نہیں ڈھونڈ؟''

''کک...... کیوں...... آ...... آپ مجھے کیوں ڈھونڈ رہے تھے؟'' بوقاف نے بہ مشکل اپنے آپ کو ان سے علیحدہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''بقر عید کے لئے......'' منگا نے لقمہ دیا۔ ''اس سال بھی جانور بہت مہنگا ہوگا ناں......!''

''کیا کہہ رہے ہو......؟'' چنگا نے اسے گھورا۔ ''اس کا گوشت کھا کر پبلک کو تو ہسپتال دوڑنا پڑے گا۔ کسے ہضم ہوگا یہ......؟''

''تو ضروری ہے کہ اسے ذبح کیا جائے......؟'' منگا نے جواباً اسے گھورا۔ ''کم از کم اس کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈال کر اسے گلیوں میں تو گھمایا جاسکتا ہے......!''

''اپنی بکواس بند کرو تم لوگ..........'' گاگے شاہ دھاڑے۔ ''نہ موقع دیکھتے ہو اور نہ محل..........بس شروع ہوجاتے ہو۔''

''ہم کیا اس وقت کسی محل میں کھڑے ہیں......'' بوقاف نے گاگے شاہ کا جملہ سن کر حیرت سے پوچھا۔

''ابے بھوندو!'' چنگا نے بے تکلفی سے اس کے کاندھے پر ہاتھ مارا۔ ''گاگے شاہ صاحب نے ایک محاورہ بولا ہے۔''

بوقاف نے اس کی حرکت پر اسے گھورا۔ بولا کچھ نہیں پھر اس نے برکت صاحب کو ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا۔ ان کا رویہ اسے الجھن میں مبتلا کر رہا تھا۔ کہاں تو وہ اس کی صورت بھی دیکھنے کے روادار نہ تھے اور کہاں یہ کہ وہ نچھاور ہوئے جارہے تھے۔ دفعتاً بوقاف کو یاد آیا کہ وہ اب جن نہیں بلکہ انسان تھا۔

خود بوقاف میں اتنی بڑی تبدیلی رونما ہوچکی تھی، ہوسکتا تھا کہ برکت صاحب کے خیالات بھی بدل گئے ہوں یہ سوچ کر بوقاف کے دل میں اطمینان کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔

''واہ......واہ......'' برکت صاحب لہک کر بولے۔ ''بغیر سینگوں کے تو تم بالکل ایتابھ بچن لگ رہے ہو۔''

یہ سن کر بوقاف کا سینہ پھول گیا۔ البتہ برکت صاحب کے اس ریمارک نے چنگا اور منگا کو ایک دوسرے کی شکل دیکھنے پر مجبور کردیا۔ ''سنا تم نے......!'' چنگا نے منگا کے کان میں سرگوشی کی۔

''ہاں......صرف تمہارے کان نہیں بجے، میرے بھی بجے ہیں۔'' منگا بھی اسی انداز میں بولا۔

''بڑی اچھی بات ہے کہ یہاں خود ایتابھ موجود نہیں ہے۔'' چنگا نے بوقاف کی طرف دیکھتے ہوئے پھر منگا کے کان میں سرگوشی کی۔ ''ورنہ دوسری مرتبہ اس کے ساتھ ایک بڑا سانحہ ہوجاتا۔''

''پہلا کون سا تھا......؟'' منگا نے حیرت سے پوچھا۔

”جب وہ اپنی فلم ”قلی“ کی شوٹنگ کر رہا تھا“ چنگا نے بتایا۔ ان کی کانا پھوسی سے گاگے شاہ جھلا اٹھے۔

”پھر تم دونوں نے کھسر پھسر شروع کر دی۔ خاموش ہو جاؤ...... ورنہ ابھی قفلِ دہن کا عمل پڑھ کر تم دونوں کے منہ سیل کر دوں گا۔“

یہ دھمکی خاصی کارگر ثابت ہوئی تھی۔ قفلِ دہن کا نام سنتے ہی چنگا اور منگا کے منہ پر واقعی تالے پڑ گئے۔ اس جانب سے فراغت ہوتے ہی گاگے شاہ بوقاف کی طرف گھومے۔

”ہاں بھئی......!“ ان کا انداز نپا تلا تھا۔ ”تم سناؤ...... کیا حال ہے تمہارا......؟ انسان بننے کے بعد کیسی گزر رہی ہے تمہاری زندگی......؟“

”شکل تو بتا رہی ہے کہ بہت بری گزر رہی ہے۔“ منگا نے بوقاف کو غور سے دیکھتے ہوئے پھر لقمہ دیا۔

”تم پھر بولے......؟“ گاگے شاہ نے اسے غصے سے گھورا۔

”اب نہیں بولوں گا۔“ منگا نے گڑبڑا کر شہادت کی انگلی ہونٹوں کے آگے ”الف“ کر لی۔

”تم بتاؤ بھئی......؟“ گاگے شاہ پھر سے بوقاف سے مخاطب ہوئے۔

”مم...... مم...... میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ بوقاف ہکلا کر بولا۔

”کیا خاک ٹھیک ہو......؟“ گاگے شاہ نے منہ بنایا۔ ”اتنے دنوں تک تو تم تندور پر روٹیاں لگاتے رہے اور اب یہاں کنگ کانگ کے چنگل میں آ پھنسے ہو۔“

”تمہیں یہ بھی معلوم ہے......؟“ بوقاف حیرت سے اچھل پڑا۔

”ہم سب کچھ جانتے ہیں۔“ گاگے شاہ اک شانِ ادا سے بولے۔ ”گاگے شاہ حلوائی نام ہے ہمارا......“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم جو کچھ بھی ہو، صرف اپنے نام کی وجہ سے ہو......؟“ بوقاف کے لہجے میں حیرت تھی۔

”بکومت......“ گاگے شاہ نے اسے ڈپٹ دیا۔

”مت ڈانٹیں اسے شاہ صاحب...... مت ڈانٹیں۔“ برکت صاحب نے دخل دیا۔ ”یہ اب صرف بوقاف نہیں ہے، بلکہ فرزندِ ارجمند بوقاف سلمہ ہے۔“

”یہ...... یہ...... باقی سارے نام کس کے ہیں؟“ بوقاف نے بوکھلا کر پوچھا۔

”تمہارے ہی ہیں......“ برکت صاحب مسکرا کر بولے۔ ”ہمارے یہاں شادی سے پہلے دولہا کو سلمہ کہتے ہیں، البتہ شادی کے بعد اسے ”ہولو“ کہا جاتا ہے۔“

”شش...... شادی...... کس کی شادی......؟“ بوقاف ہکلایا۔

”بھئی تمہاری شادی...... اور کس کی......؟“

”کس سے......؟“ بوقاف اب بھی الجھن میں تھا۔

’’مہ پارہ سے......‘‘ برکت صاحب نے انکشاف کیا۔ بوقاف کی آنکھیں پھٹ کر رہ گئیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی ’’لائن‘‘ اتنی آسانی سے ’’کلیئر‘‘ ہو جائے گی۔

جو کچھ اس نے رومینٹک فلموں میں دیکھا تھا، یہ معاملہ ان کے بالکل برعکس تھا۔ بے چارے ہیرو کو، مشکلات کے ان گنت پہاڑ توڑنے پڑتے ہیں۔ ظالم سماج اور ہیروئن کا ’’ہٹلر زدہ‘‘ باپ...... دونوں مل کر ہیرو کی زندگی عذاب کر دیتے ہیں۔ مہ پارہ کا باپ کتنا اچھا تھا......؟ اسی لمحے بوقاف کو یہ احساس بھی ہوا کہ جب وہ جن تھا تو اس نے برکت صاحب سے کتنی بدتمیزی کی تھی۔ انہیں خوب ’’بڈھا، بڈھا‘‘ بولا تھا اور کس طرح انہیں اس نے ستایا تھا۔

دل ہی دل میں وہ برکت صاحب کے اعلیٰ کردار کا معترف ہو گیا۔ کیا ہی بات تھی برکت صاحب کی...... واہ......!

’’تت...... تت...... تو کیا...... واقعی آپ مہ پارہ کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیں گے؟‘‘ بوقاف نے بدقت تمام، جملہ پورا کیا۔

برکت صاحب نے دھیرے سے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ خوشی کے مارے بوقاف کی باچھیں کھل اٹھیں۔

’’خالی ہاتھ لے کر کیا کرو گے......؟‘‘ چنگا نے حیران ہو کر بوقاف سے پوچھا۔

’’اپنے منہ پر رسید کرے گا شاید......‘‘ بوقاف کے بجائے منگا نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

’’ہم یہاں اسی لئے آئے ہیں۔‘‘ گاگے شاہ نے چنگا اور منگا کو نظر انداز کرتے ہوئے بوقاف سے کہا۔ ’’تاکہ تمہیں یہاں سے لے جائیں اور پھر جلد سے جلد تمہارے سر پر سہرے کے پھول کھل سکیں۔‘‘

’’اس کا سر ہے یا کوئی کھیت ہے......!‘‘ چنگا نے بوقاف کے سر کو ٹٹولا۔

’’پیچھے ہٹو......‘‘ گاگے شاہ جھلائے۔ ’’تم دونوں کو کتنی بار سمجھایا ہے کہ جب کام کی باتیں ہو رہی ہوں تو خاموش رہا کرو۔‘‘

’’کبھی کبھی تو ہوتی ہیں کام کی باتیں......‘‘ چنگا نے منہ بنایا۔ ’’اس لئے عادت ہی نہیں ہے...... خاموش رہنے کی۔‘‘

’’آپ یہ بتائیں کہ آپ کو کس طرح معلوم ہوا کہ میں یہاں موجود ہوں۔‘‘ بوقاف نے اب برکت صاحب کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

’’میں تو بھئی تمہارے سلسلے میں بہت پریشان تھا۔‘‘ برکت صاحب نے بتایا۔ ’’کافی دنوں تک تو میں یہ سوچتا رہا کہ کہیں تمہارے سردار نے غصے میں آ کر تمہیں بندر...... بن مانس یا کوئی اور جانور تو نہیں بنا دیا۔ اس چکر میں، میں نے چڑیا گھر کا بھی ایک چکر لگا لیا کہ شاید تم سے ملاقات ہو جائے۔‘‘

’’جی......!‘‘ بوقاف نے حیران ہو کر کہا۔

’’ہاں بھئی......‘‘ برکت صاحب نے سر ہلایا۔ ’’وہ تو بھلا ہو شاہ صاحب کا......! جب ان کو میری پریشانی کا علم ہوا تو یہ اپنے گاؤں سے بھاگے بھاگے آئے اور اپنے علم کے ذریعے تمہارا پتہ لگا لیا۔‘‘

’’میں اس وقت کنگ کانگ کے قبضے میں ہوں۔‘‘ بوقاف نے بتایا۔ ’’ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی اس کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ اس کے کارندے اسے ہسپتال لے کر گئے ہیں۔‘‘

''موقع اچھا تھا.......... تم یہاں سے بھاگے کیوں نہیں......؟'' برکت صاحب نے سوال کیا۔

''کیا مجھے بھاگ جانا چاہئے تھا......؟'' بوقاف نے احمقانہ انداز میں پوچھا۔

''لو......تو اور کیا...... بھاگ کھڑے ہوتے......'' برکت صاحب نے کہا۔

''دراصل...... میں تو یہ سوچ کر رہ گیا کہ کنگ کانگ بے چارہ بوڑھا آدمی ہے، اگر ہسپتال سے واپسی پر میں اسے نہ ملا تو کہیں اس کا دل نہ ٹوٹ جائے۔ ویسے ہی بے چارہ اتنا لاغر اور کمزور ہے۔ معلوم نہیں یہ صدمہ اس سے برداشت ہو کہ نہ ہو۔'' بوقاف نے جواب دیا۔

''بس...... یہی وجہ ہے کہ کنگ کانگ پورے علاقے میں دندناتا پھرتا ہے۔'' برکت صاحب نے منہ بنایا۔ ''ہر کوئی اس پر ترس کھا کر اسے بخش دیتا ہے۔ کم بخت پر پولیس بھی ہاتھ نہیں ڈالتی۔''

برکت صاحب نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ باہر سے گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی اور چند ہی لمحوں بعد بھاری جوتوں کی آواز سے فضا گونج اٹھی۔ ''یہ پولیس والے ہیں۔'' گاگے شاہ نے سب کو اطلاع دی۔

سب نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا اور پھر واقعی گاگے شاہ کی بات سچ ثابت ہوئی کیونکہ اسی وقت ایک تھانیدار اپنے چند کانسٹیبلوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔

ان سب کے ہاتھوں میں اسلحہ تھا۔ تھانیدار نے گاگے شاہ وغیرہ کی طرف دیکھا اور گرج کر بولا۔

''خبردار......! اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ...... تم لوگ......''

☆......☆......☆

کئی گھنٹے مارے مارے پھرنے کے بعد جب ملو استاد اور کلو چرسی دوبارہ چچا تندوری کے گھر پہنچے تو چچی کا ہشاش بشاش چہرہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ تو انہیں روتا دھوتا چھوڑ کر گئے تھے...... پھر اس دوران میں آخر کیا ہوا......؟

''چچی......!'' ملو استاد نے انہیں غور سے دیکھ کر کہا۔ ''بڑی خوش دکھائی دے رہی ہو...... کیا چچا تندوری مل گئے؟''

''نہیں......'' ان کا مختصر سا جواب تھا۔

''ایں......!'' وہ چونکا۔ ''تو پھر...... کیا ان جیسا کوئی اور مل گیا......؟''

''چپ بے غیرت......!'' چچی بھنا اٹھیں۔ ''کبھی تو منہ سے کوئی ڈھنگ کی بات نکال لیا کرو...... تم دونوں کی جیسی شکلیں ہیں...... ویسی ہی باتیں ہیں۔ ارے بدبختوں! حکیم صاحب کے گھر پر ان کا فون آیا تھا۔ وہ اور حکیم صاحب اس وقت شمالی امریکہ میں موجود ہیں اور بالکل خیریت سے ہیں۔''

''کیا......؟'' دونوں اچھل پڑے۔ ''کہاں ہیں وہ دونوں......؟''

''شمالی امریکہ میں......'' چچی نے لاپروائی سے کہا۔

''تم جانتی بھی ہو کہ شمالی امریکہ کہاں ہے......؟'' ملو استاد نے انہیں گھورا۔

"میں کیا جانوں......؟ ہوگا کہیں نہ کہیں۔" ان کا انداز اب بھی وہی تھا۔

"ایسے کہہ رہی ہو جیسے گلی میں بکری کا بچہ گم ہوگیا ہو......ارے......! سمندر پار ہے شمالی امریکہ......ہاں......" ملو استاد نے سمجھایا۔

"ارے بھاڑ میں جائے......" وہ جھنجھلا گئیں۔ "چولہے کی جڑ میں ہے شمالی امریکہ......میری بلا سے......"

"اب تم سے کون مغز ماری کرے......" ملو استاد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "ہم نے خواہ مخواہ اتنی کتا خواری کی......کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا چچا تندوری کو......"

"ہاں......اور کیا......" کلو چرسی فوراً بولا۔ "کے ایم سی کے دفتر گئے......کئی گٹروں کے ڈھکنے اٹھا اٹھا کر دیکھے......ندی نالوں میں بھی جھانکنا پڑا۔"

"نالے میں منہ نہیں دھویا تم نے......؟" چچی نے اسے گھورا۔ "کچھ تو انسانوں والی شکل نکل آتی۔"

"اسے چھوڑو چچی......" ملو استاد بول اٹھا۔ "یہ بتاؤ کہ اب چچا کا ہوگا کیا......؟ کیا کرنا ہے ان کے لئے......؟"

"کچھ بھی مت کرو......آرام سے اپنی پان کی دکان کھولو......اور کیا کرو گے......! وہ واپس آئیں گے اور ضرور آئیں گے۔ بے فکر رہو۔"

☆......☆......☆

چچا تندوری پر اس بات کا کوئی اثر ہوا ہو، یا نہ ہوا ہو......البتہ قرطابہ قبیلے کے سردار کی بات سن کر جو کچھ حال حکیم طولانی کا ہوا تھا، وہ خود ان کا دل ہی جانتا تھا۔ اس وقت وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھال پائے تھے، ورنہ کرسی سے گر پڑے ہوتے۔

وہ "آدم بو" کا مطلب اچھی طرح سمجھتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ جن حضرات صرف سونگھ کر ہی انسانوں کا پتا لگا لیتے ہیں۔

حکیم طولانی نے کئی الف لیلوی کہانیوں اور ڈراموں میں دیکھا تھا کہ یہ مخلوق فوراً ہی آدم زاد کے وجود کو محسوس کر لیتے ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ قرطابہ کے سردار نے چچا تندوری اور خود ان کی موجودگی کو محسوس کر لیا تھا۔

مانا کہ وہ دونوں بھی جنوں کے روپ میں تھے، لیکن ظاہر ہے کہ جسمانی طور پر تو وہ انسان ہی تھے۔ اب حکیم طولانی کا عالم یہ تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ ان کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

انہوں نے بہ مشکل تمام ذرا سی ترچھی نگاہ کی اور قرطابہ کے سردار کا سرسری سا جائزہ لیا۔

دیوہیکل جسم تھا اس سردار کا......اگر چچا تندوری اور حکیم طولانی کو اوپر تلے لٹا کر وہ صرف اپنا ایک پاؤں ہی رکھ دیتا، تو بیک وقت دونوں جہانِ فانی سے کوچ کر جاتے۔

اور اب......راز فاش ہونے والا تھا......حکیم طولانی کا دل ڈوبنے لگا۔ قماطہ نے انہیں مروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ کاش......! وہ اس کی بات نہ مانتے۔ دفعتاً حالیہ سچویشن کے مطابق ایک تازہ شعر ان کے ذہن میں گھومنے لگا۔

تو نے مروا دیا ظالم......!
ہمیں جن کھا گیا سالم

یہ تو حال تھا حکیم طولانی کا۔ ادھر قماطہ اور قالان بھی لحہ بھر کے لئے گھبرا گئے تھے۔ قماطہ نے سوالیہ نظروں سے قالان کی طرف دیکھا۔ شاید وہ کہنا چاہ رہا تھا کہ اب کیا کریں......؟

قالان نے فوری طور پر خود کو سنبھالا اور قرطابہ کے سردار سے مخاطب ہوا۔ ’’یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ آدم بو یہاں کہاں......؟ یہاں تو نہ بندہ ہے اور نہ بندے کی ذات۔‘‘

’’نہیں...... میری ناک دھوکا نہیں کھا سکتی......‘‘ وہ چاروں طرف کا جائزہ لے رہا تھا۔ ’’یہاں کچھ انسان بھی موجود ہیں۔ ہاں......‘‘

’’افوہ بھئی......‘‘ قالان نے جھلاہٹ کی ایکٹنگ کی۔ ’’یہاں کسی انسان کا کیا کام......؟ یہ میٹنگ صرف جنوں کی ہے اور جن بھی سب کے سب خاص الخاص ہیں، عام جن ہرگز نہیں ہیں۔‘‘

قرطابہ کے سردار نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ میٹنگ میں شریک تمام سردار اس کی طرف متوجہ تھے۔ ظاہر ہے کہ اس نے بات ہی ایسی کی تھی۔

قرطابہ کے سردار نے باری باری تمام لوگوں کا جائزہ لیا۔ اس کی تیز نگاہوں کی زد میں چچا تندوری اور حکیم طولانی بھی آئے تھے۔ ایک بار پھر حکیم طولانی کا دل دھڑک اٹھا۔ لیکن اس سردار کی نظریں ان پر ٹکی نہیں تھیں، بلکہ آگے بڑھ گئی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد دائرہ مکمل کر کے اس کی آنکھیں دوبارہ قالان پہ آ کر رک گئیں، ساتھ ہی وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ ’’میرا دل نہیں مان رہا۔ یہاں ضرور ایک آدھ آدم زاد موجود ہے۔‘‘

’’اپنے دل کو سمجھاؤ......‘‘ قالان کا انداز بزرگانہ تھا۔ ’’ہوسکتا ہے کہ یہاں آنے سے قبل تم کسی انسان سے ملے ہو، اور اس کی بو تمہارے ذہن میں بس گئی ہو۔‘‘

یہ کہہ کر قالان سب کی طرف دیکھتے ہوئے سوالیہ انداز میں بولا۔ ’’آپ لوگوں کا کیا خیال ہے......؟‘‘

فوراً ہی سب نے تائید کرتے ہوئے گردنیں ہلا دیں۔ قماطہ نے تعریفی انداز سے قالان کو دیکھا۔ ’’ہاں...... یہ بھی ہوسکتا ہے۔‘‘ قماطہ چپ نہ رہ سکا۔

’’ہاں بھئی یاد کرو......‘‘ ایک اور بزرگ قسم کے سردار نے قرطابہ کے سردار کو مخاطب کیا۔ ’’ہوسکتا ہے کہ تم کسی انسان سے ملاقات کرنے کے بعد یہاں آئے ہو......‘‘

لحہ بھر کے لئے قرطابہ کے سردار کے چہرے پر ہچکچاہٹ کے آثار دکھائی دیے، پھر وہ حسب عادت ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔

’’یہ...... یہ بات تو خیر درست ہے۔ میں...... اس میٹنگ میں شریک ہونے سے ایک گھنٹہ قبل، سینما میں فلم کا شو دیکھ رہا تھا۔‘‘

’’ہائیں...... ہائیں......‘‘ بزرگ جن نے آنکھیں نکالیں۔ ’’تم فلم دیکھ رہے تھے......؟‘‘

’’ج...... جی ہاں......؟‘‘ وہ پھر ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔

’’بھلا...... کون سی فلم تھی؟‘‘ بزرگ جن نے یک بیک نرم انداز میں پوچھا۔

''دلیپ کمار صاحب کی ''آدمی''......'' اس نے سر جھکا کر بتایا۔

''واہ......واہ......'' بزرگ جن نے پسندیدگی سے سر ہلایا۔ پھر وہ نصیحت آمیز انداز میں اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''ارے میاں......! جب فلم ''آدمی'' دیکھو گے......تو تمہیں آدم بو تو آنی ہی ہے۔ نہ تم آدمی دیکھتے، اور نہ تمہیں آدم بو محسوس ہوتی......!'' بزرگ جن نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''اور کیا......!'' قالان جلدی سے ان کی تائید میں بولا۔ لاجواب ہو کر قرطابہ کے سردار نے اپنے سینگ کھجانا شروع کر دیئے، اور منہ بسور کر رہ گیا۔

پھر کسی جانب سے کوئی اعتراض نہ اٹھا تھا۔ قماطہ نے اطمینان کی ایک طویل سانس لی۔ قالان کی بروقت حاضر دماغی سے ایک گھمبیر مسئلہ، چٹکی بجاتے ہی حل ہو گیا تھا۔

ورنہ اگر دوسروں کو بھی شک ہو جاتا تو بے چارے حکیم طولانی اور چچا تندوری کی ''فاتحہ'' پڑھنے والا واقعی یہاں کوئی نہ ہوتا۔ اس جانب سے فارغ ہو کر قالان اٹھ کھڑا ہوا اور تمام حاضر سرداران جنات پر طائرانہ نظر ڈال کر گویا ہوا۔

''اور اب......میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ آج یہاں......! یعنی ہمالیہ کی ترائی میں ہم سب کی موجودگی اس بات کی دلیل ہے کہ ہم لوگوں میں اتحاد اور اتفاق بدرجہ اتم موجود ہے اور یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم اپنے درپیش مسائل کا حل چاہتے ہیں۔

ہم سب، حضرت انسان سے سخت عاجز ہیں۔ ہماری تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اس مخلوق نے صدیوں سے ہم لوگوں پر ظلم اور جبر کی ریت قائم کر رکھی ہے۔''

''بالکل......بالکل......'' کسی نے چیخ کر کہا۔ ''اور اس ظلم و جبر کو ان ظالموں نے اردو کلاسک کا درجہ دے رکھا ہے۔''

''آپ کی مراد ''طلسم ہوشربا'' تو نہیں ہے۔'' قالان نے چونک کر پوچھا۔

''وہی......وہی......'' سر ہلا کر کہا گیا۔ ''اس کی ساتوں جلدوں میں ہمارے خلاف زہریلا مواد بھرا ہوا ہے اور وہ......کم بخت......عمرو عیار......ہونہہ......''

''اس کا تو نام ہی مت لیں۔'' ایک دبلے پتلے سے جن نے کراہ کر کہا۔ ''نام سن کر ہی مجھے بخار چڑھ جاتا ہے۔''

''لیکن ایک بات ہے۔'' کوئی اور بولا۔ ''طلسم ہوشربا کی ساتوں جلدیں جس نے بھی لکھی ہیں، خوب ہی لکھی ہیں۔ میں نے پہلی جلد پڑھی تو پھر تمام جلدیں ہی ختم کر کے چھوڑیں۔''

کچھ اور سرداروں نے بھی اس ریمارکس کی تائید کی۔ قالان جلدی سے بولا۔ ''ہم یہاں اردو کلاسک کی خوبیاں بیان کرنے کے لئے جمع نہیں ہوئے۔ ہاں تو......بات یہ ہو رہی تھی کہ انسان عرصہ دراز سے ہمارا دشمن بنا ہوا ہے۔ پہلے دور میں بادشاہ اور شاہزادوں کے مظالم عام تھے اور اب جدید دور میں عاملوں نے ہمارا ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ اب آپ لوگ بتایئے......! کہ اس سلسلے میں کیا اقدامات اٹھائے جائیں؟ اور ہم لوگوں کو کیا کرنا چاہیئے۔''

یہ کہہ کر قالان نے حاضرین پر گہری نظریں ڈالیں، اس کا انداز جواب طلب تھا۔ تمام سرداروں کو خاموشی نے گھیر لیا۔ شاید سب ہی اپنی اپنی سوچوں میں ڈوب گئے تھے۔ پوری کانفرنس پر سکوت طاری ہو گیا تھا۔

قالان ٹکر ٹکر سب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً ایک آواز نے اس سناٹے کو چیر ڈالا۔ ''اگر اجازت ہو تو...... میں کچھ کہوں......؟''

قالان نے چونک کر دیکھا اور حیرت زدہ رہ گیا۔ بولنے والے چچا تندوری تھے۔ اور پھر سب کی نظریں چچا تندوری پر مرتکز ہو گئیں۔

☆......☆......☆

گاگے شاہ کے علاوہ سب نے ہی اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دیئے تھے۔ غیر ارادی طور پر بوقاف بھی اس میں شامل تھا۔

تھانیدار نے تیز نظروں سے گاگے شاہ کو گھورا، جو مطمئن انداز میں گردن اکڑائے کھڑے تھے۔ وہ قطعی اس کی جانب متوجہ نہیں تھے۔ ''تم نے ہاتھ کیوں نہیں اٹھائے......؟'' تھانیدار گرجا۔

''یہ کسی پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔'' گاگے شاہ کے بجائے چنگا بول پڑا۔ ''صرف پھونک مار دیتے ہیں، وہ کافی ہوتی ہے۔''

اب تھانیدار اور آگے بڑھا۔ پھر جب اس نے غور سے گاگے شاہ کی شکل دیکھی تو اچھل پڑا۔ اس کا تنا ہوا رائفل جھک گیا۔ ''ارے...... شاہ صاحب......! آپ اور یہاں؟'' فرط عقیدت سے وہ مچل اٹھا اور بڑھ کر والہانہ انداز میں ان سے لپٹ گیا۔ گاگے شاہ مزید پھول گئے۔ تھانیدار کے ساتھ آنے والے سپاہی حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

گاگے شاہ سے گلے ملنے کے بعد تھانیدار نے رائفل ایک سپاہی کو تھمائی اور ان سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اوئے......! ہتھیار سیدھے کرو تم لوگ...... اپنے شاہ صاحب ہیں یہ......''

فوراً ہی سپاہیوں نے رائفلیں گھما لیں۔ اب تھانیدار نے بڑی عقیدت سے گاگے شاہ کے ہاتھ تھام لئے۔ ''آپ یہاں کیسے شاہ صاحب......؟''

''کیوں......؟ کیا یہاں صرف تم آ سکتے ہو؟'' گاگے شاہ نے اسے گھورا۔

''ارے...... نہیں......'' وہ خوشامدانہ انداز میں ہاتھ ملتے ہوئے ہنسا۔ ''م...... میرا مطلب یہ تھا جناب...... یہ تو کنگ کانگ جیسے بدمعاش کا ڈیرہ ہے، یہاں آپ جیسے اہل نظر کا کیا کام؟''

''واقعی...... ہمیں اپنی نظریں ہی تو کھلی رکھنی پڑتی ہیں...... دراصل کنگ کانگ نے میرا ایک بندہ یہاں قید کر رکھا تھا، میں اسی کو آزاد کروانے آیا تھا۔'' یہ کہہ کر گاگے شاہ نے بوقاف کی طرف اشارہ کیا۔

تھانیدار نے چونک کر بوقاف کی طرف دیکھا۔

''ارے...... تو یہ سب آپ ہی کے ساتھ ہیں......؟''

''ہاں بھئی......'' انہوں نے سر ہلایا۔

”تو ان لوگوں نے خواہ مخواہ ہاتھ اٹھا رکھے ہیں۔“ تھانیدار نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”ہاتھ نیچے کر لو بھئی تم لوگ......“

”تم تھانیدار ہو یا پی ٹی ماسٹر......؟“ چنگا نے ہاتھ گراتے ہوئے برا سامنہ بنا کر کہا۔

”ہی ہی ہی......“ تھانیدار پھر بے ڈھب انداز میں ہنسا۔ ”معاف کرنا بھئی...... میں تم لوگوں کو کنگ کانگ کے آدمی سمجھا تھا۔“

”اللہ نہ کرے......“ برکت صاحب کے منہ سے نکلا۔ ”ہم کیوں ہونے لگے اس کے آدمی...... وہ تو نامی گرامی بدمعاش ہے۔“

”بدمعاش تھا......“ تھانیدار نے ٹوکا۔ ”وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ ہسپتال پہنچتے ہی اس نے دم توڑ دیا تھا۔“

”اوہ......!“ ان سب کے منہ سے نکلا۔

”ہاں...... اب ہم لوگ یہاں اسی لئے آئے تھے کہ اس کے باقی ماندہ ساتھی اگر یہاں موجود ہوں، تو ہم انہیں بھی گرفتار کر لیں۔ ہسپتال میں تو جتنے بھی موجود تھے، وہ اب جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہیں۔“

”چلو...... خس کم جہاں پاک...... اچھا ہی ہوا...... ورنہ کنگ کانگ نہ جانے اور کتنے جرائم کرتا۔“ گاگے شاہ نے سر ہلایا۔ باقی لوگ خاموش رہ کر اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔ دفعتاً تھانیدار بڑی لجاجت سے گاگے شاہ سے مخاطب ہوا۔

”وہ...... شاہ صاحب...... پچھلے ہفتے جو سفوف آپ نے پانی میں گھول کر پینے کے لئے دیا تھا، اس سے تو میرے پیٹ میں مروڑ کی شکایت ہو گئی...... قسم سے...... دو دن تک تو رات رات بھر نہ سو سکا۔ آپ کے حضور آنا تھا...... لیکن ٹائم ہی نہ مل سکا۔ ڈر کے مارے میں نے وہ سفوف دوبارہ نہیں پیا۔“

یہ سن کر گاگے شاہ چنگا کی طرف گھومے۔ ”کیوں بھئی چنگا...... یہ کیا چکر ہے......؟ تم نے کون سے سفوف کی پڑیاں بنائی تھیں؟“

”وہ...... وہ جی...... نیلی شیشی والا سفوف...... وہی دیا تھا۔“ چنگا نے گردن کھجاتے ہوئے جواب دیا۔

”نیلی شیشی......“ گاگے شاہ کی آنکھیں سوچ میں ڈوب گئیں، پھر وہ چونکے۔ ”ابے بدبخت......! وہ تو خارش کی دوا تھی۔ تو نے سفوف سمجھ کر وہ دوا دے دی...... گدھے......!“

یہ سن کر تھانیدار کو ابکائی آ گئی۔ فوراً ہی سپاہیوں نے آگے بڑھ کر اسے سنبھالا۔ ادھر چنگا نظریں چرا رہا تھا۔ گاگے شاہ پھر اس پر برس پڑے۔

”تیرا دھیان کہاں رہتا ہے......؟ کہاں جھک مارتا رہتا ہے تو سارا دن......؟“

”میں بتاؤں شاہ صاحب......“ منگا بول پڑا۔ ”یہ کچھ دنوں سے خسرو چاچا کی لڑکی کے ساتھ جھک مار رہا ہے۔“

”ابے جھک نہیں مار رہا۔“ چنگا نے اسے گھورا۔ ”عشق کر رہا ہوں...... عشق......“

گاگے شاہ کھا جانے والی نظروں سے چنگا کو گھورتے رہے۔ پھر وہ تھانیدار کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس کی حالت کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔ ”تم شام کو میرے پاس آنا...... فکر مت کرو...... تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔“

”ہاں......“ منگا نے لمبی سانس لے کر چھت کی طرف دیکھا۔ ”جسے مولیٰ رکھے، اسے کون چکھے۔“

اس ریمارکس پر تھانیدار اسے گھور کر رہ گیا۔ تھانیدار کے ساتھی، حیرت سے ان سب کی شکلیں دیکھ رہے تھے۔

''بس......'' گاگے شاہ نے ہاتھ اٹھایا۔ ''زیادہ اپنی اوقات دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ چنگا اور منگا......! تم دونوں بوقاف کو ڈیرے پر لے کر چلو...... میں ذرا...... برکت کے گھر سے ہو کر آتا ہوں۔''

''ہم دونوں اسے اپنے ساتھ لے جائیں......؟'' چنگا نے آنکھیں پھاڑیں۔

''ہاں بھئی...... اور ہاں...... اسے پیٹ بھر کر کھانا بھی دینا اور خبردار...... اگر مجھے کسی قسم کی کوئی شکایت ملی تو......'' گاگے شاہ نے انہیں تنبیہہ کرنا چاہی۔

''ہمیں معلوم ہے......'' چنگا نے سر ہلا کر ان کی بات کاٹی۔ ''تو...... آپ سے برا کوئی نہ ہوگا۔''

''بکواس مت کرو......'' گاگے شاہ کو غصہ آ گیا۔ ''اور بوقاف کو لے کر یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔''

چنگا اور منگا نے فوراً ہی بوقاف کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔

بوقاف نے برکت صاحب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''ہاں...... ہاں...... جاؤ بھئی......'' وہ سر ہلا کر بولے۔ ''یہ تو بہت ضروری ہے۔''

''کیوں......؟'' بوقاف نے سوال کیا۔

''بھئی...... تمہاری بارات...... شاہ صاحب کی طرف سے ہی تو آئے گی۔'' برکت صاحب دھیرے سے مسکرائے۔

''اوہ......'' بوقاف کے منہ سے نکلا۔

''اب تم جاؤ...... چنگا منگا کے ساتھ۔'' گاگے شاہ اس سے مخاطب ہوئے۔ ''تم سے اب وہیں ملاقات ہوگی۔ مجھے ذرا...... برکت کے گھر جانا ہے۔''

''شاہ صاحب......! چلیں...... میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔'' تھانیدار نے پیش کش کی۔

''یہ اور بھی اچھا ہے۔'' گاگے شاہ خوش ہو گئے۔ ''پولیس موبائل کافی کھلی ہوئی ہوتی ہے۔ میرے پھنسنے کا قطعی چانس نہ ہوگا۔ کیوں ٹھیک ہے ناں!''

☆......☆......☆

بوقاف کے قبیلے کا سردار بھی اس وقت کانفرنس میں موجود تھا۔ جس وقت سب لوگوں کی توجہ چچا تندوری کی جانب مبذول ہوئی، اس نے موقع غنیمت جان کر قمیض کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کوکا کولا کی ڈسپوزبل بوتل باہر نکال لی۔

پھر اس نے جلدی سے ادھر ادھر دیکھا اور بوتل کا ڈھکنا کھول کر بوتل منہ سے لگا لی۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے......؟'' دفعتاً کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔

وہ چونک کر گھوما۔ اس کے برابر میں وہی بزرگ جن بیٹھے ہوئے اسے گھور رہے تھے، جو کچھ دیر قبل قرطابہ کے سردار کو سمجھا رہے تھے۔''

وو......وہ......وہ جی......میں کوک......کوکا کولا پی رہا ہوں۔'' سردار گڑبڑا کر بولا۔

''ہوں......'' بزرگ جن نے اسے گھورتے ہوئے ہنکارا بھرا۔ ''کوکا کولا پی رہے ہو......اور وہ بھی اکیلے اکیلے......ہمیں بھی پلاؤ۔''

سردار کی جان میں جان آئی۔ اس نے جلدی سے دو چار گھونٹ بھرے اور بوتل ان کی طرف بڑھا دی۔

''آ......آپ بھی......یعنی کہ......'' سردار نے سرگوشی میں کہنا چاہا۔

''لو......یہ بھی کوئی پوچھنے والی ہے۔ میں تو عاشق ہوں، اس مشروب کا۔'' یہ کہہ کر بزرگ جن نے دوسروں کی نظر بچا کر بوتل ہونٹوں سے لگالی۔ عین اسی وقت ان کے کندھے پر بھی کسی نے ہاتھ رکھ دیا۔

☆......☆......☆

حکیم طولانی بھی دم بہ خود رہ گئے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو پھنستے پھنستے رہ گئے تھے اور اب خود چچا تندوری نے شیر کے منہ میں ہاتھ ڈال دیا تھا بلکہ وہ مثال صادق تھی کہ آ بیل، مجھے مار۔

بہر حال، اب تو جو ہونا تھا، وہ تو ہونا ہی تھا۔ دل ہی دل میں انہوں نے ''جل تو جلال تو'' کا ورد شروع کر دیا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اب چند ہی لمحوں میں چچا تندوری کا بھاڑ جیسا منہ کھلنے والا ہے۔ اور پھر واقعی، چچا تندوری کی آواز گونجنے لگی۔ وہ نہایت اطمینان اور پرسکون لہجے میں گویا ہوئے۔ ''اس میٹنگ کا مقصد میری سمجھ میں نہیں آیا۔''

''کیا مطلب......؟'' قالان نے سوالیہ انداز میں ان سے پوچھا۔ سب ہی چچا تندوری کی طرف متوجہ تھے۔

''میرا مطلب یہ ہے کہ یہ پنچائیت کس چکر میں لگی ہے؟'' چچا تندوری اپنی بولی پر اتر آئے۔

''پنچائیت......؟'' کئی سرداروں کے منہ سے حیرت زدہ انداز میں نکلا۔

''بات دراصل یہ ہے جناب کہ ہم یہاں انسانوں کے خلاف......'' قالان نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہنا چاہا۔

دراصل اسے ڈر تھا کہ چچا تندوری اپنا بھانڈا خود نہ پھوڑ لیں۔ ''ارے کیا خاک انسانوں کے خلاف......'' چچا تندوری نے جھلا کر اس کی بات کاٹی۔ ''وہ......ادھر دیکھو......! مزے لے لے کر کوکا کولا پی جا رہی ہے۔ تم خود ہی دیکھ لو......''

قالان نے فوراً اس جانب دیکھا، جہاں چچا تندوری نے اشارہ کیا تھا۔ واقعی ایک سردار کے ہاتھ میں کوکا کولا کی بوتل موجود تھی، جسے اس نے فوری طور پر چھپانے کی ناکام کوشش کی تھی۔

یہ دیکھ کر قالان ہکا بکا رہ گیا۔ کوکا کولا پینے والا سردار اب نظریں چرا رہا تھا۔

''دیکھ لیا تم نے......؟'' چچا تندوری نے قالان کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تم......انسانوں کے خلاف کیا کرو گے......؟ انسانوں کی بنائی ہوئی فلمیں تو بڑے شوق سے دیکھتے ہو، یہ کوکا کولا بھی انسان نے بنائی ہے۔ اس وقت انسان دشمنی یاد نہیں آتی جب سینما میں بیٹھ کر مزے اڑا رہے ہوتے ہو......؟ بولو جواب دو......؟ تمہارے لئے مزے مزے کی مٹھائیاں کون بناتا ہے......؟ گاگے شاہ جیسے کتنے حلوائی ہیں، جو جنو

ں کی خدمت کر رہے ہیں...... کون ہیں یہ سب......؟ انسان ہی تو ہیں......؟ اور ہم آج ان کے ہی خلاف محاذ قائم کر رہے ہیں۔ کیوں......؟''

اتنا کہہ کر چچا تندوری خاموش ہو گئے۔ میٹنگ میں شریک ہر ایک فرد اس وقت ان کے الفاظوں میں کھویا ہوا تھا۔ سب کو چپ لگی ہوئی تھی۔ قماطہ تعریفی انداز میں چچا تندوری کو دیکھ رہا تھا۔ جبکہ حکیم طولانی اور قالان گم صم ہو کر ان کی شکل تک رہے تھے۔ ''یہ...... یہ تو...... بالکل درست...... سو فی صد......'' دفعتاً مجمع میں سے کئی آوازیں ابھریں۔ چند سردار فوراً ہی قائل ہو گئے تھے۔

''رہی یہ بات کہ انسان جنوں کے لئے، یا جن انسانوں کے لئے مشکلوں اور مصیبتوں کا باعث بنے ہوئے ہیں۔'' چچا تندوری دوبارہ گویا ہوئے۔ ''تو یہ بات تو ہمیشہ رہے گی۔ برتن تو آپس میں کھڑ کھڑاتے ہی ہیں۔ کبھی وزن ادھر...... تو کبھی ادھر...... بات دراصل یہ ہے کہ ہم سب، رب العزت کی بنائی ہوئی مخلوقات ہیں۔ سب کی اہمیت اپنی جگہ پر ہے۔''

''لیکن انسان تو اشرف المخلوقات ہے......'' قالان نے اعتراض کیا۔ ''وہ تو ہم سے افضل ہے۔''

''ارے...... تو یہ بھی تو دیکھو کہ وہ بے چارہ کن مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے اپنی زندگی گزارتا ہے۔'' چچا تندوری نے پر سکون انداز میں جواب دیا۔ ''نہ تو اس کے سر پر سینگ ہیں اور نہ وہ اڑ کر سفر کر سکتا ہے۔ اور نہ ہی اپنے آپ کو دوسروں کی نظروں سے پوشیدہ کر سکتا ہے۔ جبکہ جنوں میں یہ خوبیاں ہیں۔ اسے جو بھی کام کرنا ہے، اپنی محنت، عقل اور زور بازو سے کرنا ہے۔''

یہ سن کر قالان کی گردن جھک گئی۔ دفعتاً کسی نے تالی بجائی اور پھر تو جیسے تالیوں کا ایک طوفان اُمڈ پڑا۔ ہر کوئی دیوانہ وار تالیاں بجا رہا تھا۔ چچا تندوری دوبارہ کچھ بول رہے تھے، لیکن تالیوں کی گونج میں خود ان کی آواز دب کر رہ گئی تھی۔

☆......☆......☆

مقید خاک

ساحر جمیل سید کا ایک اور شاہکار ناول...... مقیدِ خاک...... سرزمین فراعنہ کی آغوش سے جنم لینے والی ایک تحیّر خیز داستان۔

ڈاکٹر شکیل ظفر:- ایک ہارٹ اسپیشلسٹ، جو مردہ صدیوں کی دھڑکنیں ٹٹولنے نکلا تھا...... یوساف بے:- وہ ساڑھے چار ہزار سال سے مضطرب شیطانی روحوں کے عذاب کا شکار ہوا تھا...... بیوسا:- ایک حرماں نصیب ماں، جسکی بیٹی کو زندہ ہی حنوط کر دیا گیا...... مریاقس:- اسکی روح صدیوں سے اس کے جسدِ خاکی میں مُقیّد تھی...... شیلندر رائے ہریچہ:- ایک پرائیویٹ ڈیٹکٹر، اسے صدیوں پرانی ممی کی تلاش تھی...... مہرجی:- پرکالۂ آفت، انسانی قالب میں ڈھلی ایک آسمانی بجلی...... ایکشن، سسپنس اور تھرل کا ایک نہ رکنے والا طوفان......

یہ ناول کتاب گھر پر جلد آ رہا ہے، جسے ایکشن ایڈونچر مہم جوئی ناول سیکشن میں پڑھا جا سکے گا۔

گاگے شاہ اس وقت برکت صاحب کے ساتھ ان کے گھر میں موجود تھے۔ یہ مہ پارہ کا کمرہ تھا۔ مہ پارہ اور گل بانو بھی یہاں موجود تھیں۔ مہ پارہ گاگے شاہ کے سامنے آنکھیں بند کیے، دوزانو بیٹھی ہوئی تھی۔ اور خود گاگے شاہ کوئی عمل پڑھ رہے تھے۔ دفعتاً گاگے شاہ نے اس کے چہرے پر ایک زوردار پھونک ماری۔

مہ پارہ نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں اور چاروں طرف حیرت سے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے ایسا ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ طویل نیند سے جاگی ہو۔

”لو بھئی...... برکت......!“ گاگے شاہ نے ایک طویل سانس لی۔ ”تمہاری بیٹی تو نکل آئی جن کے اثر سے......“

”کیا واقعی......؟“ برکت صاحب کے ساتھ ساتھ گل بانو بھی بول پڑیں۔ انہوں نے حسب دستور گاگے شاہ سے دوپٹے کی آڑ کر رکھی تھی۔

”ہاں بھئی......“ وہ سر ہلا کر بولے۔ ”میں نے کہا تھا نا کہ مہ پارہ ابھی تک بوقاف کی گرفت میں ہے...... ٹھہرو...... میں ابھی آپ لوگوں کی تسلی کرواتا ہوں۔ پھر آپ دونوں کو یقین ہو جائے گا کہ میں ٹھیک کہہ رہا تھا۔“

”ہائے...... ہائے......“ گل بانو نے کلیجہ تھام لیا۔ ”وہ کم بخت جن تھا یا ملیریا کا جراثیم، موأ...... اپنے اثرات ہی چھوڑ گیا۔“

برکت صاحب نے رواروی میں ان کی طرف دیکھا اور دوبارہ گاگے شاہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ”اس سے بھی خطرناک...... میں ابھی ثابت کرتا ہوں۔“ گاگے شاہ نے گردن ہلا کر کہا اور مہ پارہ کی طرف گھوم گئے۔

”بیٹی مہ پارہ......! کیا تم بوقاف سے واقف ہو؟“

”بوقاف......! کون بوقاف......؟“ مہ پارہ اپنے کانوں پر سے بال ہٹاتے ہوئے چونک کر بولی۔

”وہی بوقاف...... جو تم پر سوار تھا اور پھر بعد میں تم اس پر سوار ہو گئی تھیں۔“ گاگے شاہ جھونک میں بول گئے۔

”کک...... کیا کہہ رہے ہیں......؟“ برکت صاحب نے حیران ہو کر دخل دیا۔

”اوہ...... مم...... میرا مطلب یہ تھا کہ بعد میں تمہیں اس سے محبت ہو گئی تھی۔“ وہ سنبھل کر بولے۔

”آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ مہ پارہ الجھ گئی۔ ”میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، میں کسی بوقاف کو نہیں جانتی۔“

اس کی بات سن کر برکت صاحب اور گل بانو کچھ کم حیرت زدہ نہیں تھے۔ گاگے شاہ نے معنی خیز انداز میں ان دونوں کی طرف دیکھا۔ ادھر مہ پارہ شدید الجھن کے عالم میں گاگے شاہ کو تک رہی تھی۔ پھر وہ گل بانو کی طرف مڑی۔

”امی جان...... آپ ہی بتائیں...... کون ہے یہ بوقاف......؟“

”ارے ہوگا کوئی...... خاک ڈالو اس پر...... تم یہ بتاؤ کہ اب تم بالکل ٹھیک ہو نا؟“ گل بانو نے جلدی سے پوچھا۔

”ہاں امی جان...... میں اب ٹھیک ہوں۔ بس...... چھت پر تھی، تو مجھے چکر سے آ رہے تھے...... اب تو ٹھیک ہوں۔“ اس نے سر ہلا کر کہا۔ پھر چونک کر بولی۔ ”اور ہاں...... یہ شاہ صاحب کب آئے......؟ کافی سالوں بعد چکر لگا ہے ان کا......“

گاگے شاہ غور سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے برکت صاحب کی طرف جھکتے ہوئے ان کے کان میں سرگوشی کی۔ ''دیکھ لیا تم نے......؟ اب یہ بالکل اپنے ہوش میں ہے۔ جس دن بوقاف نے اپنے سحر میں اسے لیا تھا اس وقت سے لے کر اب تک کا اسے بالکل ہوش نہیں ہے۔ بوقاف کون ہے......؟ کیا ہے......؟ کب راتوں کو اس نے بوقاف سے ملاقاتیں کی ہیں......؟ اسے کچھ بھی نہیں معلوم۔ یہ درپردہ اس کی معمول بن گئی تھی۔ اب یہ اس کے اثر سے نکل چکی ہے۔ سمجھے تم سے......؟''

برکت صاحب نے حیرت زدہ انداز میں گردن ہلا دی۔ ''اور اب......'' گاگے شاہ دلکش انداز میں مسکرائے۔ ''تم مجھے سلیم کے گھر لے کر چلو۔''

''کون سلیم......؟'' برکت صاحب چونکے۔

''وہی سلیم...... جو مہ پارہ کا امیدوار بن کر آیا تھا۔'' گاگے شاہ نے جواب دیا۔ برکت صاحب نے غور سے گاگے شاہ کی طرف دیکھا۔

ادھر گل بانو نے اب مہ پارہ کو اپنے آپ سے لپٹا لیا تھا اور اسے پیار کر رہی تھیں۔

☆......☆......☆

قالان سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی بنیاد رکھی ہوئی عمارت کے پرخچے اس کی آنکھوں کے سامنے اڑ رہے تھے۔ کس کس طرح اس نے دور دراز کا سفر کر کے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنایا تھا۔ کتنے مرحلوں سے گزرتے ہوئے اس میٹنگ کا انعقاد کیا تھا۔

تالیوں کی گونج میں اس نے اپنے مضبوط ارادوں کا پل ٹوٹتے ہوئے دیکھا۔ اس کی بنائی ہوئی تنظیم تہہ و بالا ہو رہی تھی۔ جن کے روپ میں ایک انسان نے اسے لاجواب کر کے رکھ دیا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ تمام جن بھی اس کے طرفدار ہو گئے تھے۔

تالیوں کا شور تھما، تو چچا تندوری ایک بار پھر بولنے کے لئے ''پر'' تولنے لگے۔ وہ تو حکیم طولانی نے ان کی شلوار گھسیٹ کر انہیں بیٹھنے کا اشارہ کر دیا، ورنہ وہ تو بے لگام ہو رہے تھے۔ اتنے سارے جنوں میں انہیں کسی قسم کا ذرا بھی خوف نہ تھا۔ عجیب مست ملنگ قسم کے قلندر آدمی تھے۔

مجبوراً قالان کو اٹھنا پڑا۔ اس نے ایک نظر مجمع پر ڈالی اور طویل سانس لے کر بولا۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہماری یہ میٹنگ ناکام ہو گئی۔''

''ناکام کیسے ہو گئی بھئی......؟'' اب حکیم طولانی جوش میں کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔ ''یہ تو کامیابی کی نشانی ہے اس سے بڑی کامیابی اور کیا ہو گی کہ ہمیں یہ سبق ملا ہے کہ تمام مخلوقات اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ہیں۔ ہمیں قطعی یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم ان کے خلاف محاذ قائم کر لیں۔''

''چاہے وہ ہم پر ظلم ڈھاتے رہیں......؟'' قالان نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''یہ کوئی بات نہیں ہوئی۔'' حکیم طولانی نے منہ بنایا۔ ''جو جیسا کرتا ہے، ویسا بھرتا ہے۔ اگر چیونٹی کو بھی پاؤں تلے دباؤ گے تو وہ پلٹ کر کاٹے گی، حالانکہ وہ قطعی بے ضرر مخلوق ہے۔ کچھ نہ کچھ تو تم لوگ بھی...... مم...... میرا مطلب ہے کہ کچھ نہ کچھ تو ہم لوگ بھی کرتے ہیں، جس کی وجہ سے انسان ہمارے خلاف کارروائی کرتے ہیں۔'' حکیم طولانی نے مدلل جواب دیا۔

ایک بار پھر فضا تالیوں سے گونج اٹھی۔ اچانک قماطہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ساتھ ہی اس نے چچا تندوری اور حکیم طولانی کو بھی اٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں بھی کھڑے ہو گئے۔ قماطہ نے ان دونوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھا اور باآواز بلند کہنے لگا۔ ''پس...... تو ثابت ہوا کہ آج سے ہم اپنے آپ میں

خوش رہیں گے اور انسان اپنے آپ میں مگن...... کیوں دوستو......؟‘‘

’’بالکل...... بالکل......‘‘ مجمع بول اٹھا۔

’’تو پھر...... اس خوشی میں ہو جائے ایک کوکا کولا کا دور......؟‘‘ قالان نے ترنگ میں آ کر پوچھا۔

’’اوہ...... یس...... خوش آمدید...... خوش آمدید۔‘‘ ایک بار پھر مجمع چلا اٹھا۔

قماطہ نے بڑی دلکش مسکراہٹ سے قالان کی طرف دیکھا جواباً قالان کے ہونٹوں پر ایک تھکی تھکی سی مسکراہٹ عود کر آئی۔ ’’اب تم جلدی سے کوکا کولا کے کریٹ منگوا لو۔‘‘ قماطہ نے قالان کے کان میں سرگوشی کی۔

’’اور...... اور وہ...... شربتِ خاص کی جو ٹنکیاں بھری ہوئی ہیں......؟‘‘ قالان نے خود کو سنبھالتے ہوئے شکایت بھرے لہجے میں پوچھا۔

’’وہ......‘‘ قماطہ نے سوچ میں ڈوب کر کان کھجایا، پھر چونک کر بولا۔ ’’یہ بھی کوئی مسئلہ ہے......؟ ارے ہم سارا شربتِ خاص ایدھی سینٹر پہنچا دیں گے۔ کیوں......؟ کیسی رہی......؟‘‘

☆......☆......☆

پھر گاگے شاہ اور برکت صاحب، سلیم کے گھر بھی گئے تھے۔ وہاں تقریباً دو گھنٹے گزارنے کے بعد گاگے شاہ نے وہیں برکت صاحب کو الوداع کہا اور اپنے ڈیرے کی طرف روانہ ہو گئے۔

وہاں پہنچ کر انہوں نے ایک اور ہی تماشہ دیکھا۔ دکان کے اندرونی حصے میں ایک سفید رنگ کے کپڑے کی بڑی سی بوری رکھی ہوئی تھی۔ سفید رنگ کی بوری کوئی تعجب انگیز شے نہیں تھی۔ عجیب تو وہ منظر تھا، جو بوری کے قریب ہی انہیں دکھائی دیا۔

بوقاف ننگے فرش پر سر کے بل کھڑا ہوا تھا اور چنگا اس کے دائیں جانب جبکہ منگا بائیں جانب آلتی پالتی مار کر بیٹھے ہوئے تھے۔ آنکھیں تینوں کی بند تھیں، البتہ چنگا اور منگا کے ہونٹ اس طرح ہل رہے تھے، جیسے وہ کسی قسم کا ورد کر رہے ہوں۔

وہ تینوں ہی گاگے شاہ کی آمد سے بے خبر تھے۔ گاگے شاہ نے پہلے تو حیرت زدہ ہو کر آہستہ سے پوچھا۔ ’’یہ کیا ہو رہا ہے......؟‘‘

لیکن کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ پھر وہ زور سے دھاڑے۔ ’’ابے...... میں پوچھ رہا ہوں، کیا ہو رہا ہے یہ......؟‘‘

فوراً ہی وہاں ہلچل سی مچ گئی۔ بوقاف سیدھا ہونے کی کوشش میں منگا کے اوپر آ گرا۔ منگا نے خود کو بچانے کے لئے چنگا کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ نتیجہ یہ کہ تینوں اوپر تلے ایک دوسرے پر آ گرے۔

اس ہڑبونگ نے گاگے شاہ کے جلال کو مزید بھڑکا دیا۔

’’ابے کیا پاگل ہو گئے ہو تم لوگ......؟‘‘

’’نہیں...... یہ جلالی عمل تھوڑی تھا شاہ صاحب......!‘‘ چنگا پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔ سب سے نیچے وہی دبا ہوا تھا۔

’’ہائیں......‘‘ گاگے شاہ نے آنکھیں نکالیں۔ ’’عمل کر رہے تھے تم لوگ...... بتاؤ بدبختوں کون سا عمل تھا یہ......؟‘‘

''آپ ہی کا عمل تھا......'' چنگا نے منہ بنایا۔ ''آپ کو تو کبھی کسی نے اس لقب سے نہیں نوازا......!''

''بکواس بند کرو......فوراً سیدھے ہو جاؤ'' گاگے شاہ نے نتھنے پھلائے۔ ''اور جلدی سے بتاؤ کہ کون سا عمل کر رہے تھے تم لوگ؟''

یہ سن کر بوقاف فوراً ہی ان دونوں کے اوپر سے ہٹ گیا۔ چنانچہ چنگا اور منگا کو ڈھنگ کی حالت میں آجانے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ گاگے شاہ نے ایک ایک کو گھورا اور سوالیہ نظریں چنگا پر گاڑ دیں۔

''وہ......وہ......شاہ صاحب......'' چنگا اپنا کالر سیدھا کرتے ہوئے ہکلایا۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ ہم بوقاف کو آپ کی شان اور کرامتوں سے آگاہ کر رہے تھے۔''

''اچھا......تو پھر......!'' گاگے شاہ تھوڑا سا اکڑ گئے۔

''پھر یہ کہ آپ کے اس شعبدے کا بھی ذکر ہوا......کہ جس میں آپ منگا کو معمول بنا کر الٹا کھڑا کرتے ہیں اور کہیں بھی پہنچا دیتے ہیں۔''

''ابے......وہ شعبدہ ہے......؟'' گاگے شاہ نے آنکھیں نکالیں۔

''ارے......'' چنگا چونکا۔ ''تت......تو کیا وہ بھی کرامت ہے شاہ صاحب......؟''

''تو اور کیا......!'' انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اوہ......'' چنگا حیرت زدہ رہ گیا۔ ''واقعی......ہم لوگ آپ کے مقابلے میں کتنے کم عقل ہیں......؟''

''وہ تو ظاہر ہے۔'' گاگے شاہ نے کندھے اچکائے۔ ''اب آگے بکو......؟''

''اچھا......ہاں......تو پھر یہ سنتے ہی بوقاف نے کہا کہ مجھے بھی الٹا کر کے اپنے قبیلے پہنچا دو......ذرا اپنے گھر کا حال دیکھ آؤں گا۔''

''اور تم دونوں نے اسے الٹا کر دیا......؟'' گاگے شاہ حیرت سے بولے۔

''نہیں شاہ صاحب......'' منگا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''الٹا تو یہ خود ہی ہوا تھا۔ ہم نے تھوڑی کیا تھا۔''

''تم دونوں ہی گدھے ہو۔'' وہ جھنجھلا اٹھے۔

''میرا مطلب یہ ہے کہ وہ عمل تو صرف مجھے آتا ہے۔ پھر تم دونوں منہ ہی منہ میں کیا پڑھ رہے تھے......؟''

''وہ تو ہم یونہی ٹشن مار رہے تھے۔'' منگا ہنسا۔ ''یہ ضد کر رہا تھا، ہم نے سوچا کہ چلو......اس کا ذرا دل بہلا دیں۔''

''ہوں......'' گاگے شاہ نے دونوں کو گھور کر سر ہلایا۔ ''دکان پر کون ہے؟''

''کک......کوئی نہیں۔'' منگا گڑبڑایا۔ پھر چونک کر بولا۔ ''ارے ہاں......آپ کے مؤکل ہوں گے نا......؟''

''وہ آج چھٹی پر ہیں۔'' گاگے شاہ اطمینان سے بولے۔ پھر گرج کر کہا۔ ''تم دونوں فوراً دکان پر دفع ہو جاؤ۔ دکان خالی پڑی ہے اور تم دونوں یہاں مستیاں کر رہے ہو۔ جاؤ......''

دونوں کان دبا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ چند لمحوں بعد وہاں صرف بوقاف اور گاگے شاہ رہ گئے۔ ''کیوں......؟'' گاگے شاہ نے اسے

گھورا۔ ''اپنا قبیلہ ابھی سے یاد آ رہا ہے ابھی تمہیں انسان بنے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں......؟''

''قبیلہ نہیں..........'' بوقاف نے طویل سانس لی۔ ''صرف ماں اور باپ کی یاد آ رہی ہے۔''

''اس وقت ان کا خیال نہیں آیا، جب تم نے آدم زادیوں پر ڈورے ڈالے تھے......؟'' گاگے شاہ کا لہجہ طنزیہ تھا۔

''شیطان صرف تم ہی لوگوں کو تو نہیں بہکاتا......'' بوقاف نے منہ بنایا۔ ''یہ اعزاز ہماری قوم کو بھی حاصل ہے۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں اپنی بداعمالیوں کا احساس ہو چکا ہے اور تم اپنے جرائم کا اعتراف کر رہے ہو۔'' گاگے شاہ نے اسے بہ غور دیکھا۔

''ہاں......'' بوقاف نے سر ہلایا۔ ''لیکن ایک جرم کے علاوہ...... کیونکہ وہ جرم میں نے دل کی گہرائیوں سے کیا ہے۔''

''ہوں......'' گاگے شاہ نے طویل سانس لے کر گردن ہلائی۔ ''اس جرم کا احساس بھی تمہیں جلد ہو جائے گا۔''

''شاید مر کر بھی ایسا نہ ہو۔'' بوقاف جذباتی لہجے میں بولا۔ ''اس جرم کی خاطر میں نے اپنا سب کچھ گنوا دیا۔ قبیلہ، ماں، باپ......اور...... خود اپنا پن بھی...... محبت کی معراج یہی تو ہے کہ محبوب کے رنگ میں رنگ جاؤ۔ دیکھ لو...... میں محبت کی منزلت کی خاطر جن سے انسان بن گیا۔''

گاگے شاہ خاموشی سے سنتے رہے۔ دفعتاً ان کی نظریں سفید رنگ کی بوری پر پڑیں۔ وہ دکان کی طرف منہ کر کے بلند آواز میں چلائے۔''
چنگا......منگا......ارے......اس بوری میں کیا ہے؟''

فوراً ہی منگا بھاگتا ہوا نمودار ہوا اور بولا۔ ''یہ کوئی بوری ووری نہیں ہے جی...... یہ تو ایک موٹا سا بندہ ہے۔ جو آپ سے ملنے کے لئے آیا تھا اور انتظار کرتے کرتے ادھر ہی سو گیا۔''

''ایں...... یہ کوئی بندہ ہے۔'' گاگے شاہ چونکے۔ عین اسی وقت اس کپڑے کی بوری میں حرکت ہوئی۔

☆......☆......☆

ٹائیں ٹائیں فش

کتاب گھر پر پیش کیا جانے والا، گل نوخیز اختر کا مقبول ترین ناول، جسے پاک و ہند کے قارئین نے سند قبولیت بخشی۔ اُردو کا پہلا مکمل مزاحیہ ناول، ہمارا دعویٰ ہے کہ آپ اس ناول کو ایک بار شروع کر کے ختم کیے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔ ٹائیں ٹائیں فش کہانی ہے ایک غریب گھر کے سادہ لوح نوجوان کی جسے حالات ایک ارب پتی لڑکی کا کرائے کا شوہر بنا دیتے ہیں۔ اس کاغذی شادی سے پہلے اور بعد میں کمال عرف کمالے کی سادہ لوحی اور حماقتیں کیا گل کھلاتی ہیں، جاننے کیلئے پڑھیے ٹائیں ٹائیں فش۔ اسے ناول سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اور پھر الوداعی گھڑیاں آن پہنچیں۔ حکیم طولانی اور چچا تندوری کے وہاں سے رخصت ہونے کا وقت آ گیا۔

قماطہ کے ساتھ قالان بھی اس وقت وہاں موجود تھا۔ دو عدد خادم بھی تھے، جو چچا تندوری اور حکیم طولانی کو اپنے کندھوں پر بٹھا کر انہیں واپس ان کے قصبے میں چھوڑ کر آنے کے لئے تیار کھڑے تھے۔

چچا تندوری کی وجہ سے میٹنگ تو ''تمت بالخیر'' ہو ہی گئی تھی لیکن ساتھ ساتھ قالان کی بنائی ہوئی تنظیم کا بھی خاتمہ ہو گیا تھا۔

چچا تندوری کی تقریر کے بعد اس تنظیم کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی اور مزے کی بات یہ تھی کہ سب کے ساتھ ساتھ خود قالان بھی ان کی باتوں سے قائل ہو گیا تھا۔

البتہ یہ راز، راز ہی رہا کہ اس میٹنگ میں اتنے سارے جنوں کے درمیان، دو انسان بھی موجود تھے۔

اس بات کے گواہ صرف قماطہ اور قالان تھے۔ ہو سکتا تھا کہ یہ راز کھل جاتا، لیکن قالان کی بروقت ذہانت نے اس راز سے پردہ نہ اٹھنے دیا۔

چچا تندوری اور حکیم طولانی نے ان دونوں سے ہاتھ ملایا۔ نہ جانے کیوں قماطہ کی آنکھوں میں اداسی نمودار ہو گئی۔

پھر وہ ضبط نہ کر سکا، آگے بڑھا اور چچا تندور کو گلے سے لگا لیا۔ ''اماں...... کیا کر رہے ہو بھئی......؟ میری پسلیاں بہت کمزور ہیں۔'' چچا تندوری نے ہانک لگائی۔

وہ اور حکیم طولانی اب اپنی اصل حالت میں تھے، کیونکہ تمام مہمان پہلے ہی رخصت ہو چکے تھے۔ ''نہیں چچا تندوری...... نہیں...... میں نہیں مان سکتا۔'' قماطہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تم سے زیادہ مضبوط آدمی میں نے کبھی زندگی میں نہیں دیکھا۔''

''پھر تم نے آدمی ہی نہ دیکھے ہوں گے۔'' چچا تندوری نے جواب دیا۔ ''کبھی ہمارے یہاں کے پہلوانوں کی وراسٹائل کشتی دیکھو...... پھر تمہیں معلوم ہو گا۔''

''وہ صرف دکھاوے کی جان ہوتی ہے...... کمرشل جان......'' قماطہ نے ان سے الگ ہوتے ہوئے کہا۔ ''تم اندرونی طور پر مضبوط ہو۔''

''بھئی...... سنکی ایسے ہی ہوتے ہیں۔'' حکیم طولانی نے اسے سمجھایا۔

''بالکل......'' چچا تندوری فوراً بولے۔ ''اور جو پاگل ہوتے ہیں، وہ شاعری کرتے ہیں۔''

حکیم طولانی جھینپ کر خاموش ہو گئے۔ اسی وقت قماطہ نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک خوب صورت سی انگوٹھی نکال کر چچا تندوری کی طرف بڑھا دی۔ ''یہ کیا ہے بھئی......؟'' چچا تندوری نے انگوٹھی کو ٹٹولا۔

''میری طرف سے آپ کے لئے ایک چھوٹا سا تحفہ......'' قماطہ مسکرایا۔ ''یہ انگوٹھی آپ کو میری یاد دلاتی رہے گی۔ اس انگوٹھی کی خاص بات یہ ہے کہ جب آپ اس کو رگڑیں گے، تو فوراً ہی ایک پری نمودار ہو گی۔ آپ کی جو بھی خواہش ہو، آپ اس پری سے بیان کر دیں، وہ فوراً ہی آپ کی فرمائش پوری کر دے گی۔''

''اوہ...... اچھا۔'' حکیم طولانی نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ چچا تندوری نے لاپروائی سے انگوٹھی کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور اسے اپنے ہاتھ کی

انگلی میں پہن لیا۔

’’اچھا بھئی......اب ہمیں واپس بھجوادو......اپنا گھر بہت یاد آ رہا ہے۔‘‘ چند لمحے بعد وہ قماطہ سے مخاطب ہوئے۔

’’بالکل......بالکل......اب آپ جایئے......اس شکریئے کے ساتھ کہ آپ نے بدروحوں کو بھگانے کے لئے ہماری مدد کی۔‘‘

اتنا کہہ کر قماطہ نے خادموں کو اشارہ کیا۔ دونوں خادم فوراً ہی چچا تندوری اور حکیم طولانی کو اٹھانے کے لئے آگے بڑھے۔ اگلے ہی لمحے، دونوں ان کے کندھوں پر سوار تھے۔ ایک بار پھر سب نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلائے۔

☆......☆......☆

اب تو بوری سے باقاعدہ کراہیں بلند ہو رہی تھیں۔ گاگے شاہ حیرت زدہ انداز میں اسے دیکھ رہے تھے۔ بوقاف کا بھی یہی حال تھا۔ پھر وہ بوری اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اب انہیں معلوم ہو سکا کہ یہ ایک بھاری ڈیل ڈول والا آدمی تھا، جو سر سے پاؤں تک پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔

’’تم، کون سی مخلوق ہو بھئی......؟‘‘ گاگے شاہ کے منہ سے نکلا۔

’’آپ ہی کا بھائی بند ہوں۔‘‘ بوری نے منہ کھولا۔ ’’شبن خیراتی نام ہے میرا......‘‘

’’شبن خیراتی............!‘‘ دونوں کے منہ سے نکلا۔ بوقاف تو چونکا بھی تھا۔

’’ہاں شبن خیراتی......‘‘ اس نے سر ہلایا۔ ’’قصبہ نورس میں میرا ہوٹل ہے۔‘‘

’’اوہ......‘‘ بوقاف کے منہ سے نکلا۔

’’تم کچھ دیکھے بھالے سے لگ رہے ہو بھائی؟‘‘ شبن نے اسے گھورا۔ ’’تم کون ہو؟ نام کیا ہے تمہارا......؟‘‘

’’سلیم نام ہے اس کا......‘‘ گاگے شاہ جلدی سے بولے۔ ’’کیا تم اسے جانتے ہو......؟‘‘

’’سلیم......!‘‘ شبن کا لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔ ’’نہیں......میں تو بوقاف کو جانتا ہوں......وہ اسی شکل کا تھا......اور اس نے میرے ہوٹل کے تندور پر کام کیا تھا۔‘‘

’’اسے غرق کرو......‘‘ گاگے شاہ نے بوقاف کی طرف دیکھ کر ایک آنکھ دبائی۔ ’’وہ کوئی اور ہوگا۔‘‘

’’ہاں......اور کیا......وہ کوئی اور ہوگا۔‘‘ بوقاف نے بھی گردن ہلائی۔ پھر زیر لب بڑبڑایا۔ ’’انسان بننے کے بعد میرا پہلا جھوٹ......‘‘

یہ جملہ ان دونوں نے نہیں سنا۔ پھر گاگے شاہ، شبن سے مخاطب ہوئے۔ ’’ہاں بھئی......تم بتاؤ......تمہارا کیا مسئلہ ہے؟ تمہارا یہ حال کیسے ہوا......؟‘‘

’’یہ ایک لمبی کہانی ہے......‘‘ شبن نے ایک طویل اور یخ ٹھنڈی سانس بھری۔ ’’اصل بات یہ ہے کہ دو آدمی میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔‘‘

’’دو آدمی......کون دو آدمی......؟‘‘ گاگے شاہ نے حیرت کا اظہار کیا۔ پھر وہ جلدی سے گھومے۔ ’’ابے او چنگا......منگا......جلدی سے ادھر آؤ۔‘‘

فوراً ہی وہ دونوں نمودار ہو گئے۔

''جی شاہ صاحب......!'' ان کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

''تم بتاؤ بھئی......!'' گاگے شاہ ان کے بجائے شبن سے مخاطب ہوئے۔ ''کیا ان دونوں نے تمہیں پریشان کیا تھا......؟ یہ بات ہے تو میں ابھی ان کی مرمت کرتا ہوں۔''

''ارے......نہیں......'' شبن نے کراہ کر ہاتھ اٹھایا۔ ''مرمت کے تو نام سے ہی میری جان نکلتی ہے۔''

''اچھا......تو پھر ٹھکائی کروں گا......بس......'' گاگے شاہ نے گویا اسے تسلی دی۔

''نہیں............'' وہ روہانسا ہو گیا۔ ''یہ لفظ بھی بہت خطرناک ہے۔ ہائے......''

''ارے......تو کیا میں انہیں پیار کروں؟'' گاگے شاہ جھنجلا گئے۔ ''یہ تمہیں خواہ مخواہ پریشان کریں اور میں انہیں گود میں بٹھا کر انہیں خوب شاباش دوں۔ واہ بھئی......!''

''قسم لے لیں شاہ صاحب......'' منگا آگے بڑھا۔ ''میں نے ان کے ساتھ کچھ بھی نہیں کیا...... جب یہ آئے تھے تو یہ دونوں نے مٹھائی کی دکان پر تھے اور میں نے بڑی عزت سے انہیں اسی کمرے میں لا کر بٹھا دیا تھا۔''

''ہوں......'' گاگے شاہ نے گردن ہلائی۔ پھر انہوں نے سوالیہ نظروں سے شبن کی طرف دیکھا۔ ''پھر وہ کون ہیں بھئی......؟''

''میں آپ کو وہی بتانا چاہ رہا تھا۔'' شبن نے شاید منہ بنایا تھا۔ ''آپ خواہ مخواہ ان بے چاروں کے پیچھے لگ گئے۔''

''یہ دونوں ہیں ہی ایسے......'' گاگے شاہ نے اس سے بھی برا منہ بنایا۔ ''ان کے پیچھے خواہ مخواہ لگنے کا بھی دل چاہتا ہے۔'' یہ سن کر چنگا اور منگا منہ دبا کر ہنسنے لگے۔ بوقاف نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

''دراصل......دو آدمی ہیں......وہ مسلسل میری مرمت اور ٹھکائی کر رہے ہیں۔'' شبن نے بتایا۔

''کہاں ہیں......؟ نظر تو نہیں آ رہے......'' منگا نے حیرت زدہ انداز میں شبن کے ارد گرد دیکھا۔

''آدمی نہیں......موکل ہوں گے......'' چنگا نے سر ہلایا۔ ''کیوں شاہ صاحب......؟''

جواباً گاگے شاہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا کر رہ گئے۔ انداز جھلاہٹ لئے ہوئے تھا۔

''کیا وہ دونوں اس وقت بھی تمہیں مار رہے ہیں؟'' منگا نے شبن سے پرتشویش لہجے میں پوچھا۔

''نہیں بھئی......'' شبن جھنجلا اٹھا۔ ''وہ یہاں نہیں ہیں۔''

''دکان سنبھالو تم دونوں......'' گاگے شاہ نے چنگا اور منگا کو للکارا۔ ''الٹی سیدھی ہانکتے رہتے ہو......جاؤ......''

وہ دونوں چلے گئے۔ فوراً ہی شبن خیراتی نے جلدی جلدی اپنی الم ناک داستان سنانی شروع کر دی کہ کس طرح وہ اپنے ہوٹل کے کاؤنٹر پر وقفے وقفے سے دو آدمیوں کے ہاتھوں پٹ کر اس حال کو پہنچا تھا۔

ایک واقعہ تو خود بوقاف کے سامنے ہی پیش آچکا تھا۔ جس کا وہ چشم دید گواہ تھا۔ لیکن وہ خاموش رہا۔ گاگے شاہ نے شمن کے سامنے اس کی اصلیت پوشیدہ رکھی تھی۔ اگر وہ بول پڑتا تو بھانڈا پھوٹ جاتا۔

گاگے شاہ بڑے غور سے شمن کی آپ بیتی سن رہے تھے۔ آخر میں شمن نے کہا۔ ''اور اب...... یہ حال ہے کہ میں سوتے سوتے ہڑبڑا کر اٹھ جاتا ہوں۔ خواب میں بھی دو دو کر کے مجھے اب تک سینکڑوں آدمی مار چکے ہیں۔ اف......''

بوقاف بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روک سکا تھا۔ وہ جلدی سے پہلو بدل کر بیٹھ گیا۔ پیٹ میں گول گپے تو بڑے کرارے پھوٹے تھے۔

''ہوں...... اچھا۔'' گاگے شاہ نے گردن ہلائی۔ ''تو یہ بات ہے......''

''جی جناب......'' شمن نے کہا۔ ''اسی لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ آپ کی کرامتوں کی بڑی دھوم ہے...... خدا کے واسطے...... مجھے اس عذاب سے چھٹکارا دلوائیں، تاکہ میں سکون سے اپنا ہوٹل کھول سکوں۔''

''مل جائے گا...... تمہیں چھٹکارا مل جائے گا۔'' گاگے شاہ نے سر ہلا کر کہا۔ پھر وہ رازدارانہ انداز میں شمن کی طرف جھکے۔ ''بس...... ذرا...... خرچہ ہوگا۔''

''اس کی آپ فکر نہ کریں۔'' شمن جوش میں بولا۔ ''خرچہ تو آپ جتنا بھی کہیں گے، کردوں گا...... بس آپ مجھے اس عذاب سے چھٹکارا دلوا دیں۔''

''ہوں...... آہم......'' گاگے شاہ نے ہنکارا بھرا۔ ''ابھی لو...... اور دیکھو گاگے شاہ کا کمال......''

یہ کہہ کر وہ بوقاف کی طرف گھومے۔ ''بو...... مم...... میرا مطلب ہے سلیم میاں...... تم دکان سنبھالو...... اور چنگا منگا کو یہاں بھیج دو۔''

''مم...... میں دکان کیسے سنبھالوں......؟'' وہ ہکلایا۔

''اوہو بھئی...... مکھیاں بھگاتے رہنا...... کوئی گاہک آئے تو مجھے آواز دے لینا۔''

انہوں نے سمجھایا، پھر آہستہ سے سرگوشی کی۔ ''اور ہاں...... ان دونوں کو اپنا نیا نام بتا دینا...... سمجھے......'' بوقاف سر ہلا کر وہاں سے چلا گیا۔

☆......☆......☆

چچی، جائے نماز پر بیٹھی ہوئی دعا مانگ رہی تھیں کہ اچانک ہی چچا تندوری دروازے میں نمودار ہوئے۔ چچی نے فوراً ہی چہرے پر دونوں ہاتھ پھیرے اور جائے نماز لپیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ پھر وہ فوراً ہی چچا تندوری کی طرف لپکی تھیں۔

''آ گئے تم...... لیکن آئے خالی ہاتھ ہو......'' ان کا لہجہ شکایت بھرا تھا۔

''میں باغ میں تھوڑی گیا تھا، جو تمہارے لئے کچی کیریاں توڑ لاتا۔'' چچا تندوری نے حسبِ عادت منہ بنا کر کہا۔

''آخر گئے کہاں تھے......؟ سنا ہے شمالی امریکہ تو بہت دور ہے...... لیکن نہ تو تمہارے کپڑوں پر گرد ہے اور نہ بال مٹی سے اٹے ہوئے ہیں۔''

''کیوں...... کیا وہاں گدھے لوٹتے ہیں جو میں دھول مٹی میں اٹ جاؤں گا۔'' چچا تندوری تنک کر بولے۔

”ارے آپ کے منہ میں خنجر...... مم میرا مطلب ہے کہ میں نے یہ کب کہا ہے کہ تم گدھوں کے ساتھ لوٹ لگا کر آ رہے ہو...... پھر بھی ...... اتنی دور سے آدمی واپس آتا ہے تو کچھ نہ کچھ تو گھر لے کر جاتا ہے۔“

”اپنی مرضی سے تھوڑی گیا تھا......“ چچا تندوری کا جواب تھا۔ پھر وہ دھم سے پلنگ پر بیٹھ گئے اور چچی کی طرف دیکھ کر بولے۔ ”سب پر خاک ڈالو...... ذرا جلدی سے چائے بنا دو...... تمہارے ہاتھ کی چائے کب سے نہیں پی......“

چچی نے لمحہ بھر ان کی شکل دیکھی اور کچھ بڑبڑاتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چل دیں۔ ان کے جاتے ہی فوراً چچا تندوری نے قماطہ کی دی ہوئی انگوٹھی کو انگلی سے نکالا اور فرش پر بیٹھ کر اسے رگڑنے لگے۔

فوراً ہی ایک نہایت خوب صورت پری ان کے سامنے نمودار ہوگئی۔ اس نے سبز رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ گمان ہوتا تھا جیسے سرخ رنگ کے کھلے ہوئے گلاب کے گرد ہری بھری ٹہنیوں نے گھیرا ڈال رکھا ہے۔

”کیا حکم ہے میرے آقا......؟“ اس کی آواز بھی کانوں میں شہد گھول رہی تھی۔

”میں جو حکم دوں گا...... پورا کرو گی......؟“ چچا تندوری نے اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”حکم کریں آقا......!“ اس نے سر کو خم کیا۔

”بس...... تو پھر جلدی سے مجھے اس مرغی کا پتا بتا دو جو جنگل میں بیٹھ کر ایسے انڈے دے رہی ہے، جن سے بانگ دینے والے مرغے پیدا ہو رہے ہیں۔“ چچا تندوری نے فرمائش کر دی۔

لمحہ بھر کے لئے پری کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔ پھر وہ خود کو سنبھال کر بڑے ادب سے چچا تندوری سے مخاطب ہوئی۔ ”نہ آپ نے کوئی خزانہ مانگا، نہ دولت مانگی اور نہ گاڑی نہ بنگلہ، آپ نے مانگا بھی تو کیا مانگا...... حیرت ہے......!“

”تمہیں اس سے کوئی سروکار نہ ہونا چاہئے۔ میں کچھ بھی مانگوں۔“ چچا تندوری نے منہ بنایا۔ ”میں حلال روٹی کماتا ہوں اور حلال روٹی کمانے والے کی خواہشیں اتنی بڑی بڑی نہیں ہوتیں۔ آئی سمجھ......!“

”وہ تو سب ٹھیک ہے۔“ پری نے کہا۔ ”لیکن آپ کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی۔“

”کیوں......؟“ چچا تندوری کا تھوبڑا اتر چھا ہو گیا۔

”کیونکہ ایسی کسی مرغی کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔“

”کیسے نہیں ہے............؟“ چچا تندوری تنک کر بولے۔ ”مجھے کسی نے یہ بات بتائی ہے۔“

”اس نے آپ کو بے وقوف بنایا ہے۔“

”اچھا......!“ چچا تندوری کے منہ سے نکلا، وہ سوچ میں ڈوب گئے تھے، پھر اچانک ان کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔ پری غور سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''تم بانگ دے کر مجھے منہ چڑانے والے مرغوں کو ختم کر سکتی ہو......؟'' چچا تندوری نے امید بھرے لہجے میں پوچھا۔

''میں کوئی مرغی نہیں ہوں، جو بانگ دوں گی۔'' پری برا مان گئی۔

''اوہو...... میرا مطلب ہے کہ جو مرغے بانگ دے کر مجھے چھیڑتے ہیں، تم ان کا ٹینٹوا دبا سکتی ہو......؟'' چچا تندوری نے سمجھایا۔

''میں یہ بھی نہیں کر سکتی......'' پری نے انکار میں سر ہلایا۔ ''دنیا بھر میں سارے ہی مرغے بانگ دیتے ہیں...... میں کس کس کو مارتی پھروں گی......؟''

''نہ تم وہ کر سکتی ہو، نہ یہ کر سکتی ہو......'' چچا تندوری کا موڈ بگڑ گیا۔ ''تم پھر ہو کس کام کی؟ ایسا کرو کہ تم دوبارہ انگوٹھی میں فٹ ہو جاؤ...... اب جو تمہیں بلائے، وہ گدھے کا بچہ......!''

''یہ بھی آپ کی خواہش ہے......؟'' پری نے چونک کر پوچھا۔

''کون سی خواہش......؟'' چچا تندوری چونکے۔

''یہی...... کہ اب جو مجھے بلانے کی کوشش کرے گا، وہ گدھے کا بچہ ہوگا؟'' پری نے دریافت کیا۔

''ہاں...... یہی سمجھ لو......'' چچا تندوری تنک کر بولے۔

''جو حکم میرے آقا......'' یہ کہہ کر پری غائب ہو گئی۔

عین اسی وقت برتنوں کی بڑے گرنے کا ایک زوردار دھماکہ سنائی دیا۔ چچا تندوری نے چونک کر ادھر دیکھا۔ سامنے چچی کھڑی ہوئی انہیں خون خوار نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ برتنوں کی ٹرے ان ہی کے ہاتھ سے چھوٹی تھی۔

☆......☆......☆

چنگا اور منگا فوراً ہی حاضر ہو گئے اور سوالیہ نظروں سے گاگے شاہ کی طرف دیکھنے لگے۔ جیسے پوچھ رہے ہوں، کیا کرنا ہے شاہ صاحب......؟''

''تم دونوں...... اس آدمی کو دیکھ رہے ہو......؟'' گاگے شاہ نے خود ہی انہیں مخاطب کیا۔

''ہاں...... دیکھ تو رہے ہیں شاہ صاحب......'' چنگا نے شبن کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔ ''اگر آپ حکم دیں گے تو نہیں دیکھیں گے۔''

''گدھے ہو تم......'' منگا جھلا کر بولا۔ ''شاہ صاحب کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس آدمی کو عبرت کی نگاہ سے دیکھیں اور برے کاموں سے توبہ کریں۔ کیوں شاہ صاحب......!''

''بکومت......'' گاگے شاہ نے اسے ڈانٹا۔ ''یہ آدمی ہے، کسی ملک کے ناپسندیدہ صدر کا پتلا نہیں ہے کہ جسے آگ لگا کر عبرت حاصل کی جائے۔''

''ارے ہاں شاہ صاحب......!'' منگا چونک کر بولا۔ ''کسی کے خلاف جب احتجاج ہوتا ہے اور اس کا پتلا جلایا جاتا ہے تو اس آگ سے اصل آدمی کے جسم میں بھی جلن ہوتی ہے یا نہیں......؟''

یہ سن کر گاگے شاہ نے اسے گھور کر دیکھا۔ ''یہ تم طنز کر رہے ہو یا پھر واقعی تم نے یہ سوال کیا ہے......؟'' انہوں نے پوچھا۔

”سوال کر رہا ہوں، شاہ صاحب...... کیونکہ ہمارے یہاں اکثر غیر ملکی سربراہان کے پتلے جلتے رہتے ہیں۔“ منگا نے سر ہلا کر کہا۔

”اچھا......“ گاگے شاہ نے طویل سانس لی۔ ”اگر یہ سوال ہے تو پھر یہ بتاؤ کہ ٹائر جلانے اور احتجاجی مظاہروں سے کوئی فائدہ ہوتا ہے......؟“

”نہیں......“ منگا نے نفی میں سر ہلایا۔

”ابے احمق...... تو پھر پتلے جلانے سے کون سا معجزہ ہو جائے گا......؟ تم الٹے سیدھے سوال مت پوچھا کرو...... سمجھے......؟“

”جج...... جی سمجھ گیا۔“ منگا گڑبڑا کر بولا۔

”اور اب سنو...... یہ جو آدمی ہے نا...... اس کا نام شبن خیراتی ہے...... ہمیں اس کا کام کرنا ہے۔ بہت پریشان ہے بے چارہ۔“

”معاملے کی بات طے کر لی ہے آپ نے......؟“ منگا کا لہجہ معنی خیز تھا۔

”ہاں...... وہ ہو گئی......“ گاگے شاہ جلدی سے بولے۔

”دیکھ لیں...... نام تو اس کا خیراتی ہے۔ یہ کچھ دے بھی سکے گا۔“ منگا نے غور سے شبن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں انگلا کنگلا نہیں ہوں۔“ شبن اس کا مطلب سمجھتے ہوئے ہاتھ ہلا کر بولا۔ ”ہوٹل کا مالک ہوں میں......“

”کون سا ہوٹل ہے تمہارا......؟“ چنگا نے دلچسپی سے پوچھا۔

”قصبہ نورس کا مشہور ہوٹل...... ”خیراتی ہوٹل“ شبن نے فخریہ لہجے میں کہا۔

”نام سے ہی لگ رہا ہے کہ وہاں صرف پتلی دال اور چپاتی ملتی ہوگی اور وہ بھی لائن لگا کر......“ منگا نے برا سا منہ بنایا۔

اس سے پہلے کہ شبن کچھ کہتا، گاگے شاہ نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”بہت بکواس ہو چکی منگا......! اب اپنی زبان کو لگام دو...... اور غور سے سنو......! تم دونوں شبن سے ہمدردی کرو، خوب پچکارو اور گلے لگا لگا کر بھینچو...... یہ کام تم دونوں نے ایک گھنٹے تک کرنا ہے۔“

”جی......!“ چنگا اور منگا کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

”ہاں...... یہی اس آدمی کی پریشانی کا توڑ ہے۔ میں ایک وظیفہ بھی پڑھوں گا...... لیکن تم دونوں کا پیار اور محبت اس کی مصیبتوں کی اصل کاٹ ہیں۔ چلو...... شروع ہو جاؤ۔“

”لیکن...... شاہ صاحب......!“ منگا نے احتجاج کرنا چاہا۔

گاگے شاہ نے آنکھیں نکالیں۔ ”کیسے مرید ہو تم......؟ شرم نہیں آتی......؟“

چاروناچار وہ دونوں شبن کی طرف بڑھے۔ مقصد ظاہر ہے کہ وہی تھا جو گاگے شاہ کا فرمان تھا۔ لیکن ان کے چہروں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ جیسے وہ شبن کی ”چمپا پلیٹ“ کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ ایک لمحے کے لئے تو شبن بھی چونک اٹھا۔

”اماں بھائی...... مارو گے تو نہیں تم دونوں مجھے......؟ میں تو ویسے ہی ہر جگہ سے چھلا ہوا ہوں۔ ہیں......؟“

''فکر مت کرو۔'' منگا نے اسے تسلی دی۔ ''ہم تمہیں واقعی پیار کریں گے۔ شاہ صاحب کا حکم جو ہے......''

اور پھر چنگا اور منگا واقعی اس سے چمٹ گئے۔ اسے خوب چمکارا...... اس کی ''بلائیں'' لیں اور اس کو گلے سے لگا لیا۔ اچانک منگا بھڑک کر پیچھے ہٹا۔ اس نے اپنی ناک پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔

''کیا ہوا......؟'' گاگے شاہ نے چونک کر پوچھا۔

''اس کے منہ سے نسوار کی بدبو آ رہی ہے۔''

''منہ سے نسوار کی بدبو......؟'' گاگے شاہ نے حیرت سے دہرایا۔ پھر بوکھلا کر بولے۔ ''ارے بھئی...... اب اتنا زیادہ پیار بھی نہ کرو...... چھوڑ دو منہ کو...... تم بھی حد کرتے ہو......''

''اچھا......'' منگا کے لہجے میں مایوسی تھی۔ ''آپ کی جو مرضی......''

اور پھر دوبارہ وہ چنگا کے ساتھ شبن پر ''جت'' گیا۔ گاگے شاہ تھوڑی دیر تک یہ منظر دیکھتے رہے اور پھر دکان کی طرف گھوم گئے۔ وہاں بوقاف اکیلا جو تھا......

☆......☆......☆

''کہاں ہے وہ کلموہی......؟'' چچی وہیں سے دھاڑیں۔

''کون...... کلموہی......؟'' چچا تندوری نے حیرت سے پہلے انہیں دیکھا اور پھر ٹرے کے ٹوٹے ہوئے برتنوں کو...... سب کچھ فرش پر بکھر گیا تھا۔

''وہی...... جس سے ابھی تم پیار بھری باتیں کر رہے تھے...... کہاں گئی وہ......؟''

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میں تو کسی سے بھی پیار بھری باتیں نہیں کر رہا تھا......'' چچا تندوری فوراً بولے۔

''ٹھہرو...... تمہیں تو میں بعد میں بتاؤں گی...... پہلے اس حرام زادی کو......'' چچی غصے کے مارے جملہ بھی پورا نہ کر سکیں۔ پھر وہ تیزی سے آگے بڑھیں اور پلنگ کی چادر اٹھا دی۔ فوراً ہی اکڑوں بیٹھ کر انہوں نے پلنگ کے نیچے جھانکا تھا۔

لیکن ''حرام زادی'' وہاں نہیں تھی۔ انہوں نے اٹھ کر پورے کمرے میں نظریں دوڑائیں، یہاں تک کہ کونے میں رکھے ہوئے پرانے اسٹول پر بھی لات مار کر اسے گرا دیا۔

''اس وقت تو تم بالکل تجاوزات ہٹانے والا بلڈوزر لگ رہی ہو، بیگم......!'' چچا تندوری نے انہیں چھیڑا۔

''مجھے باتوں میں ٹالنے کی کوشش نہ کرو......'' چچی ان کی طرف دیکھ کر پھنکاریں۔ ''جلدی سے بتاؤ...... کہاں گئی وہ......؟''

''کون......؟ اور جائے گی کہاں؟ تم اپنے ہوش میں تو ہو......؟'' اب کی بار چچا تندوری نے بھی آنکھیں نکالیں۔

''میں نے خود دیکھا ہے...... تم اس سے باتیں کر رہے تھے اور پھر تم نے اسے کہیں چھپا دیا۔''

”میں نے کسی کو نہیں چھپایا بیگم......؟ کیا ہو گیا ہے تمہیں......؟“

”ملوا استاد اور کلو چرسی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔“ چچی نے جیسے ان کی بات سنی ہی نہیں۔

”کیا کہا تھا ان بدبختوں نے......؟“ چچا تندوری چونکے۔

”یہی کہ یا تو تم نے دوسری شادی کر لی ہے یا پھر تمہارا کسی سے نین مٹکا چل رہا ہے۔“

”بکواس کرتے ہیں دونوں......“ چچا تندوری طیش میں آ کر بولے۔ ”بھلا اس عمر میں، میں یہ سب کرتا پھروں گا......؟“

”اے لو......تو برائی کیا ہے تم میں......؟“ چچی نے ہاتھ مٹکائے۔ ”خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ اب بھی بہت دم خم ہیں تم میں......“

”تم بھی کیا بات کرتی ہو!!“ چچا تندوری جھینپ گئے۔

”اچھا......اب تم بھی مجھے باتوں میں نہ لگاؤ اور جلدی سے اس حرافہ کو سامنے لے آؤ۔“

”تم خواہ مخواہ کسی کو گالیاں دے کر اپنے اوپر عذاب لے رہی ہو۔“

”میں لے رہی ہوں نا......! تمہیں کیا تکلیف ہو رہی ہے......؟“

”بس تو پھر خود ہی اس عذاب میں مبتلا رہو......چائے تو تم نے غارت کر دی......اس لئے اب میں سو رہا ہوں۔ میری نیند خراب نہ کرنا۔“

یہ کہہ کر چچا تندوری بستر پر ڈھیر ہو گئے، ساتھ ہی انہوں نے منہ پھاڑ کر ایک ”جٹ“ قسم کی جماہی لی تھی۔ چچی تیز قسم کی نظروں سے انہیں گھورتی رہیں، پھر وہ پاؤں پٹخ کر وہاں سے ہٹ گئی تھیں۔ چند ہی لمحوں بعد کمرے میں چچا تندوری کے خراٹے گونجنے لگے۔

☆......☆......☆

دیوانہ ابلیس

عشق کا قاف اور **پکار** جیسے خوبصورت ناول لکھنے والے مصنف سرفراز احمد راہی کے قلم سے حیرت انگیز اور پراسرار واقعات سے بھرپور، سفلی علم کی سیاہ کاریوں اور نورانی علم کی ضوفشانیوں سے مزین، ایک دلچسپ ناول۔ جو قارئین کو اپنی گرفت میں لے کر ایک ان دیکھی دُنیا کی سیر کروائے گا۔ سرفراز احمد راہی نے ایک دلچسپ کہانی بیان کرتے ہوئے ہمیں ایک بھولی کہانی بھی یاد دلا دی ہے کہ گمراہی اور اَن دیکھی قباحتوں میں گھرے انسان کے لئے واحد سہارا خدا کی ذات اور اس کی یاد ہے۔

گاگے شاہ کا عمل ختم ہو چکا تھا۔ ادھر چنگا اور منگا کا حال بھی برا تھا۔ شبن سے چٹ چٹ کر ان کی ہڈیاں پسلیاں ایک ہو چکی تھیں۔ فوراً ہی گاگے شاہ نے بوقاف کو بھیج کر ان کے لئے لسی منگوائی۔ دونوں ہی لسی پر ٹوٹ پڑے تھے۔

"ہاہ......" منگا نے لسی پی کر چسکارہ بھرا۔ "مزا آ گیا شاہ صاحب......! کیا یہ عمل صرف شبن صاحب کے ساتھ ہی کرنا تھا......؟"

"تو اور......؟" گاگے شاہ نے اسے گھورا۔ پھر مزید کچھ کہے بغیر وہ شبن کی طرف متوجہ ہو گئے۔ "ہاں بھئی......تم سناؤ......! تمہارا اب کیا حال ہے......؟"

"میں تو خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا ہوں۔ واقعی......آپ نے تو کمال ہی کر دیا۔"

"یہ کمال نہیں ہے......کرامت ہے۔ ایسے ہی دور دور سے لوگ میرے پاس نہیں آتے......گاگے شاہ حلوائی نام ہے میرا......ہاں......اب تم بالکل فکر نہ کرو۔ کسی قسم کے بھی دو آدمی آ کر تمہاری کٹائی نہیں کریں گے۔ تمہارے زخم بھی جلد ہی بھر جائیں گے۔ ایک مرہم دوں گا، وہ لگانا......"

شبن نے خوشی خوشی سر ہلا دیا۔ پھر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور کئی نوٹ گن کر گاگے شاہ کی طرف بڑھا دیئے۔

"یہ تو تم منگا کو دو بھئی......" گاگے شاہ نے منہ بنایا۔ "یہ کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔ پھر......یہ بھی مشہور ہو جائے گا کہ گاگے شاہ پیسے لیتا ہے......میں تو یہاں پر لوگوں کی خدمت کے لئے بیٹھا ہوا ہوں۔"

یہ سن کر شبن کا رخ منگا کی طرف ہو گیا۔ اس نے جلدی سے نوٹ جھپٹ لئے۔

"دے دے بابا......! مولیٰ تیرا بھلا کرے گا۔" اس نے ساتھ ہی ساتھ صدا بھی لگائی تھی اور پھر وہ نوٹ لے کر گن ہی رہا تھا کہ گاگے شاہ نے نوٹ اس کے ہاتھ سے چھین لئے۔

"بے وقوف......! گننے سے کم ہو جاتے ہیں......لاؤ۔" یہ کہہ کر انہوں نے نوٹوں کو اپنی جیب میں ٹھونس لیا۔

بوقاف حیرت سے ان کی یہ حرکت دیکھ رہا تھا، بولا کچھ نہیں۔ "جاؤ چنگا اور منگا......پہلے ان کو 'طلسمی' مرہم دو......اور پھر کسی سواری کا بھی انتظام کرو......تا کہ یہ گھر جا سکیں۔"

پھر وہ بوقاف کی طرف گھومے تھے۔ "سلیم میاں اب بالکل فراغت ہے۔ ارے ہاں......تم نے کھانا کھایا؟"

"کھانا......! اف......" منگا بول پڑا۔ "جنوں بھوتوں کی طرح کھاتا ہے یہ شاہ صاحب......! میں تو روٹی اور سالن کی گریبی لا لا کر تھک گیا تھا۔ آخری مرتبہ تو ہوٹل والے نے میرے ہاتھ پر چمچہ ہی مار دیا تھا۔"

"اس کی یہ جرأت......؟" گاگے شاہ غضب ناک ہو گئے۔ "اس کی ہمت کیسے ہوئی گاگے شاہ کے مرید پر ہاتھ اٹھانے کی......؟ خیر......اس سے تو میں نمٹ لوں گا۔ تم جاؤ......اور شبن صاحب کے لئے فائنل ٹچ مارو......جاؤ۔"

ایک بار پھر وہ بوقاف کی طرف متوجہ ہو گئے۔ چنگا اور منگا وہاں سے چلے گئے تھے۔

"بتاؤ بھئی......پیٹ بھر کر کھایا تھا نا......؟"

''ہاں......بس......بھر ہی گیا تھا پیٹ......'' بوقاف نے جواب دیا۔

''وہ بھی بہت کھاتا تھا......'' شبن بول اٹھا۔

''کون......؟'' گاگے شاہ نے پوچھا۔

''بوقاف......'' شبن نے جواب دیا۔ ''میرے خیال سے اس کے پیٹ میں کیڑے تھے۔''

''اچھا......!'' بوقاف نے ہاتھ نچایا۔ ''اگر کوئی جن......مم......میرا مطلب ہے کہ اگر کوئی بندہ خوش خوراک ہے، تو کیا اس کے پیٹ میں کیڑے ہوں گے......واہ......''

گاگے شاہ نے جلدی سے شبن کی نظر بچا کر اس کا ہاتھ دبا دیا۔ ''ہاں......ہو بھی سکتے ہیں......کیوں نہیں ہو سکتے؟'' بوقاف نے فوراً ہی پینترا بدلتے ہوئے سر ہلا کر خود اپنی ہی بات رد کر دی۔

شبن غور سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا، پھر وہ بولا۔ ''پتا نہیں کیوں......میرا دل بار بار کہہ رہا ہے کہ تم ہی بوقاف ہو......''

''اپنے دل کو سمجھاؤ......'' گاگے شاہ بولے۔ ''ورنہ اگر اس نے اٹیک کر دیا تو تمہیں انگریزی میں ہارٹ اٹیک ہو جائے گا۔ اپنے دل سے کہہ دو کہ یہ بوقاف نہیں بلکہ سلیم ہے۔''

''میں کوشش کرتا ہوں......'' شبن نے سر ہلایا۔

''کس بات کی کوشش......!'' گاگے شاہ چونکے۔

''اپنے دل کو سمجھانے کی......'' جواب ملا۔

''اوہ......اچھا۔'' گاگے شاہ مطمئن ہو گئے۔ پھر وہ بوقاف کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس سے مخاطب ہوئے۔

''ہاں بھئی......تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ چونکہ اب فرصت ہے اور تمہاری شادی بھی سر پر ہے۔ تو کیوں نا مارکیٹ کا ایک چکر لگایا جائے۔''

''کس لئے......؟'' بوقاف نے پوچھا۔

''ارے بھئی......شادی کے لئے کپڑوں وغیرہ کی خریداری کرنی ہے۔ کیا ایسے ہی منہ اٹھا کر چل دو گے، دلہن کے گھر......؟''

☆......☆......☆

صبح ہی صبح حکیم طولانی گھر سے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ ان کا رخ، اپنے مطب کے بجائے چچا تندوری کے گھر کی طرف تھا۔ راستے بھر وہ ذہن میں پلان بناتے ہوئے آئے تھے، وہ جانتے تھے کہ جنوں کے سردار کی دی ہوئی انگوٹھی حاصل کر لینا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ کسی قیمت پر بھی چچا تندوری انہیں وہ انگوٹھی نہیں دیتے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ وہ ایک جن کا دیا ہوا طلسماتی تحفہ تھا، وہ بھلا کیوں اسے حکیم صاحب کے ہاتھ پر رکھ دیتے۔

حکیم طولانی سوچتے رہے......سوچتے رہے۔ بالآخر ایک زبردست قسم کی ترکیب ان کے ذہن میں آ ہی گئی اور پھر اس ترکیب کو عملی جامہ

پہنانے کے لئے ان کے قدم مزید تیزی سے اٹھنے لگے۔ دروازہ چچا تندوری نے ہی کھولا تھا۔ انہوں نے سوالیہ نظروں سے حکیم طولانی کی طرف دیکھا۔

’’کیا ہوا حکیم صاحب...... خیریت تو ہے......؟‘‘ چچا تندوری نے اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے پوچھا۔

’’ہاں...... ہاں...... سب...... سب خیریت ہے۔‘‘ وہ جلدی سے سر ہلا کر بولے۔

’’صبح ہی صبح تم نے اپنا تھوبڑا دکھا دیا۔‘‘ چچا تندوری کے انداز میں لاپروائی تھی۔ ’’لیکن پھر بھی چلو...... دن تو گزر ہی جائے گا۔‘‘

حکیم طولانی جھینپ کر مسکرا دیئے۔ جب چچا تندوری نے ٹھوڑی کھجائی تھی تو انہوں نے چچا تندوری کے ہاتھ میں انگوٹھی دیکھ کر اطمینان کر لیا تھا۔

وہ انگوٹھی اب بھی چچا تندوری کے ہاتھ میں تھی۔ فوراً ہی حکیم طولانی نے اپنی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کر لیا۔

’’تم بھی حد کرتے ہو تندوری...... ! میری شکل اتنی بری تو نہیں ہے۔‘‘ حکیم طولانی نے اپنے ’’شیوزدہ‘‘ چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

’’یعنی تم نے مان لیا کہ کچھ نہ کچھ بری ضرور ہے۔ کیوں......؟‘‘ چچا تندوری دلآویز انداز میں مسکرائے۔

’’میری شکل پر خاک ڈالو...... اور فوراً میرے ساتھ میرے مطب چلو۔‘‘

’’کیوں بھئی......؟‘‘ چچا تندوری نے سوالیہ انداز میں گردن ہلائی۔ ’’کیا صبح ہی صبح تم نے کوئی غزل کہہ دی ہے۔‘‘

’’لاحول ولا......‘‘ حکیم طولانی بھنا گئے۔ ’’غزل کی نہیں جاتی، بلکہ ہو جاتی ہے۔‘‘

’’رات کو جلاب لیا تھا کیا......؟‘‘ چچا تندوری نے محتاط انداز میں پوچھا۔

’’ارے نہیں بھئی......‘‘ حکیم طولانی جھنجھلا کر بولے۔ ’’ایسا کچھ نہیں ہے۔ کوئی غزل وزل نہیں ہوئی۔ تم سے ذرا کام ہے، تم چلو تو......!‘‘

’’اچھا......‘‘ چچا تندوری نے ایک طویل سانس لی۔ ’’چلو پھر......‘‘

’’تم کہیں نہیں جاؤ گے...... اور خاص طور پر حکیم صاحب کے ساتھ۔‘‘ اندر سے چچی کی آواز آئی۔

چچا تندوری جلدی سے پلٹے۔ حکیم طولانی نے بھی حیرت سے دروازے کے عقب میں جھانکنے کی کوشش کی۔

’’کیوں بھئی...... کیوں نہیں جاؤں گا......؟ کیا رات میں تم نے میرے پیروں میں مہندی لگائی تھی......؟‘‘ چچا تندوری تیز لہجے میں چچی سے مخاطب ہوئے، جو ان کے قریب ہی کھڑی ہوئی تھیں۔

’’بس...... میں نے کہہ دیا نا......!‘‘ وہ تنک کر بولیں۔ ’’مجھے حکیم صاحب کے لچھن کچھ ٹھیک نہیں لگتے۔‘‘

’’ارے بھابی...... یہ تم کیا کہہ رہی ہو......؟‘‘ حکیم صاحب بھونچکے رہ گئے۔ ان کی آنکھیں پھٹ پڑی تھیں۔

’’ٹھیک کہہ رہی ہوں...... آپ پھر انہیں ہفتے بھر کے لئے کہیں لے جائیں گے۔ منہ تو یہ دھو لیتے ہیں۔ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کالا کیا تھا یا سفید۔‘‘ چچی کا لہجہ اب بھی بگڑا ہوا تھا۔

’’ویسے اگر یہ منہ دھو لیں، تو ان کے چہرے پر کوئی فرق تو نہیں پڑتا۔‘‘ حکیم طولانی نے چچا تندوری کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ’’لیکن بھابی

......آپ نے یہ کہہ کر میرا دل توڑ دیا۔''

''کیوں......؟'' وہ پھٹ سے بولیں۔ ''آپ کا دل ہے یا شیشے کا مرتبان......؟ خواہ مخواہ ٹوٹ گیا......؟ میں کہہ دیتی ہوں۔ انہیں کہیں نہیں جانے دوں گی......ہاں......!''

''تم نے شادی کے بعد تو مجھے ویسے بھی کہیں کا نہیں رکھا......خواہ مخواہ مجھے مرغوں کا دشمن بنا دیا۔'' چچا تندوری کے منہ سے نکل گیا۔

''مرغوں کا دشمن تمہیں بھابی نے بنایا ہے......؟'' حکیم طولانی چونکے۔

''مرغ دشمنی'' کی اصل وجہ انہیں بھی معلوم نہیں تھی۔ کبھی معلوم ہی نہیں ہوا تھا۔

''میری وجہ سے کیوں......؟'' چچی تنک کر بولیں۔ ''تم خود ہی بھاگے پھرے تھے ان کے پیچھے......میں نے کب کہا تھا......؟''

''کیوں بھاگے تھے بھئی تم......؟'' حکیم طولانی اب چچا تندوری کی طرف گھومے۔ ان کے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔ ایک اہم ترین راز سے پردہ اٹھنے والا تھا۔

''یہ بتانے والی بات ہرگز نہیں ہے کہ میں کیوں اور کب پہلی مرتبہ مرغوں کے پیچھے بھاگا تھا، اور اب تک بھاگ رہا ہوں۔'' چچا تندوری فوراً بولے۔

''بتادو بھئی......'' حکیم طولانی نے ضد کی۔ ''مجھے بتادو......میں کسی کو بھی نہیں بتاؤں گا۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' چچا تندوری نے انکار میں سر ہلایا۔ ''صرف انڈا پیدا ہوتا ہے......''

''بتادو نا بھئی......تمہیں میری قسم......'' حکیم طولانی ضد پہ اڑتے ہوئے بولے، پھر فوراً ہی گنگنائے۔

اے صنم آج یہ قسم کھائیں
فاصلے پیار کے مٹا ڈالیں
اور دنیا سے دور ہو جائیں

''بس......بس......میرے پاس اتنا فالتو دماغ ہرگز نہیں ہے۔'' چچا تندوری نے فوراً ہاتھ اٹھا کر انہیں خاموش کروا دیا۔

''اماں......کیا کہہ رہے ہو......؟ تم تو بالکل ہی بدذوق ہو......! ارے بھئی......یہ طلعت محمود اور لتا کا کلاسیکل ڈوئیٹ گانا ہے۔''

''ہوگا......'' وہ لاپروائی سے بولے۔ ''ملی نغمہ تو نہیں ہے ناں......!''

''اچھا......اب جلدی سے چلو......دیر ہو رہی ہے۔'' حکیم طولانی فوراً ہی اصل موضوع کی طرف آ گئے۔

''کہاں......؟'' چچی نے فوراً آنکھیں نکالیں۔

''میں انہیں ذرا مطب تک لئے جا رہا ہوں اور کہیں بھی نہیں لئے جا رہا۔'' انہوں نے بتایا۔

''خدا نہ کرے یہ آپ کے مطب پہ جائیں......اچھے بھلے تو ہیں۔'' چچی نے فوراً چچا تندوری کے سراپے کا جائزہ لیا۔

''اوہو بھئی...... مجھے کام ہے! اسی لئے لے کر جا رہا ہوں۔'' بہر حال بڑی مشکل سے یہ مرحلہ طے ہوا تھا۔ چچی نے جلد واپسی کا مطالبہ کیا تھا۔

☆......☆......☆

مہ پارہ اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی کہ گل بانو اندر داخل ہوئیں۔ مہ پارہ فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''لیٹی رہو مہ پارہ...... اٹھ کیوں گئیں......؟'' گل بانو اس کے قریب ہی بیٹھ گئیں۔

دراصل جب سے مہ پارہ ''بیماری'' سے اٹھی تھی، گل بانو اس کے آرام کا بہت خیال رکھ رہی تھیں۔ گھر کا کام بھی وہ سارے کا سارا خود ہی کرتی تھیں۔ کوئی ہلکا پھلکا کام مہ پارہ سے کروالیا تو کروالیا۔ ورنہ زیادہ تر ان کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ وہ ابھی مہ پارہ کو کام کاج سے دور ہی رکھیں۔ انہیں سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ مہ پارہ یکسر ہی بوقاف کو بھلا چکی تھی، اس کے ذہن کے کسی بھی گوشے میں اس ''خبیث جن'' کا کوئی تصور نہ تھا اور یہ ایک خوش آئند بات تھی۔ اور اس میں کافی حد تک گاگے شاہ کا بھی کمال شامل تھا۔ اگر وہ بوقاف کے ''اثرات'' دور نہ کرتے تو......!

''آرام کر کر کے بھی میں تھک گئی ہوں امی......!'' مہ پارہ نے شکوہ کیا۔ ''یہ آرام بھی کچھ کم خطرناک کام نہیں ہے اور اوپر سے حکیم صاحب کی طاقت والی دوائیں کھا کھا کر تو جسم بالکل ہی ٹوٹ کر رہ گیا ہے۔''

''یہ تمہارے ابا کے کرتوت ہیں۔'' گل بانو پھڑک کر بولیں۔ ''وہ تو شکر کرو کہ کتنی دوائیں تو میں کچرے کے ڈبے میں ڈال دیتی ہوں...... ورنہ تمہیں وہ بھی حلق سے اتارنی پڑیں۔''

''ابو مجھے اتنی دوائیں کیوں کھلا رہے ہیں......؟''

''میرے خیال سے......'' گل بانو کی آنکھیں سوچ میں ڈوب گئیں۔ ''یونانی دواؤں پر ایک عرصے سے ایک پہلوان کی تصویر آ رہی ہے، ہوسکتا ہے کہ تمہارے ابا چاہ رہے ہوں، اب ان دواؤں پر تمہاری تصویر چھپے۔''

مہ پارہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''امی جان......! آپ بھی بس...... حد کرتی ہیں۔''

''ایک تو یہ جملہ میرا پیچھا نہیں چھوڑتا......'' وہ منہ بنا کر بولیں۔ ''ہر کوئی مجھ سے یہی کہتا ہے۔''

''یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ آپ کے بارے میں سب کی ایک ہی رائے ہے۔''

''چھوڑو...... بھاڑ میں گئی سب کی رائے...... میں اس وقت تم سے ایک اہم بات کہنے آئی ہوں۔'' وہ سنجیدہ ہو کر بولیں۔

''جی...... فرمائیے؟'' مہ پارہ ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''بات دراصل یہ ہے مہ پارہ کہ...... ہم لوگ تمہاری شادی کر رہے ہیں۔'' انہوں نے بتایا۔

''جی......؟ میری شادی......؟'' مہ پارہ چونکی۔

''ہاں بیٹی...... اور جس قدر جلد یہ کام ہو جائے، اتنا ہی اچھا ہے۔ اسی لئے ہم نے سوچا ہے کہ...... اسی ہفتے تمہاری شادی کر دی جائے۔''

''اسی ہفتے......؟ کیا مذاق کر رہی ہیں......؟'' مہ پارہ حیران تھی۔

''میں قطعی مذاق نہیں کر رہی...... لڑکا ہمارا دیکھا بھالا ہے...... ماشاء اللہ سے خوب صورت ہے، ہونہار ہے اور...... اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ بھی تمہیں پسند کرتا ہے۔''

''وہ ہے کون...... اور مجھ سے کب ملا......؟''

''جب تم بیمار تھیں...... وہ اور اس کے گھر والے تمہیں دیکھ کر اور پسند کر کے جا چکے ہیں۔'' گل بانو نے بتایا۔

''کمال ہے......! مجھے تو معلوم ہی نہیں......'' مہ پارہ بڑبڑائی۔

''ہے تو واقعی کمال کی بات......'' گل بانو نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''کہ تم، تم نہ رہی تھیں، خوب ہی بیماری تھی تمہاری بھی۔''

''لیکن...... لیکن...... میں نے تو اسے دیکھا بھی نہیں۔'' مہ پارہ نے شرم آلود انداز میں شکوہ کیا۔

''لو...... اب دیکھ لو......'' گل بانو مسکرائیں اور جھٹ سے ہاتھ میں دبی ہوئی کوئی چیز اس کی طرف بڑھا دی۔

مہ پارہ نے دیکھا، وہ ایک خوش شکل نوجوان کی تصویر تھی۔ جس کے ہونٹوں پر ایک کھلنڈری سی مسکراہٹ ثبت تھی۔ لمحہ بھر کے لئے مہ پارہ کو ایسا لگا جیسے وہ مسکراہٹ اس سے کچھ کہہ رہی ہو...... یہ کہ......

''مہ پارہ...... تم...... میری ہو......''

☆......☆......☆

پھر دوبارہ چچا تندوری نے بھول کر بھی مرغوں کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ حالانکہ راستے میں حکیم طولانی نے ایک آدھ بار انہیں چھیڑا بھی، لیکن چچا تندوری نے چپ سادھ لی تھی۔

پھر حکیم طولانی نے بھی زیادہ زور نہیں دیا، کیونکہ ان کے سر پر تو اس وقت انگوٹھی کی پری سوار تھی۔ ویسے انہیں افسوس ضرور تھا کہ چچا تندوری کے ایک اہم راز سے پردہ اٹھتے اٹھتے رہ گیا۔ بہرحال اتنا تو معلوم ہو گیا تھا کہ اس راز کا تعلق چچی سے وابستہ ہے۔

دفعتاً ایک خیال ان کے ذہن میں کوندا۔ ''کیوں نہ پری کے ذریعے یہ راز بھی معلوم کیا جائے......؟'' بے خیالی میں انہوں نے چلتے چلتے ایک زوردار چٹکی بھی بجا ڈالی، یہ اس خیال کا اثر تھا۔

''کیوں بھئی......'' چچا تندوری نے اس حرکت پر انہیں گھورا۔ ''کیا اب گنگنانے کے ساتھ ساتھ ناچنے بھی لگے ہو......؟''

''ارے نہیں......؟'' وہ جھینپ کر ہنسے۔ ''بس یوں ہی ایک خیال آ گیا تھا۔''

''کسی اوٹ پٹانگ غزل کا مرکزی خیال......؟'' چچا تندوری کا انداز مذاق اڑانے والا تھا۔

''نہ مانو تم مجھے شاعر......'' حکیم طولانی نے منہ بنایا۔ ''دیکھنا...... ایک دن دنیا مجھے بڑا شاعر تسلیم کرے گی۔''

''مرنے کے بعد تسلیم کیا تو کیا کیا......؟'' چچا تندوری کا جواب تھا۔ ''چھوٹے موٹے شاعروں کی ان کے مرنے کے بعد ہی برسیاں منائی

جاتی ہیں۔"

"لعنت بھیجو شاعری پر...... یہ بتاؤ کہ...... تم نے پری سے کوئی کام بھی لیا......؟" حکیم طولانی کا انداز سرسری تھا۔

جواباً چچا تندوری خاموش رہے تھے، جس کی وجہ سے حکیم طولانی کا ذوقِ تجسس اور بھی بھڑک اٹھا۔ جس بات پر چچا تندوری خاموش ہو جائیں، اسے ان کے منہ سے اگلوانا بھی جوئے شیر لانے کے مماثل تھا۔ اتنی دیر میں وہ دونوں مطب جا پہنچے۔ حکیم طولانی نے جلدی سے دکان کا شٹر کھولا اور چچا تندوری کو اندر آنے کی دعوت دی۔ اندر پہنچ کر حکیم طولانی نے اپنی مخصوص کرسی سنبھال لی۔ چچا تندوری ان کے سامنے بنچ پر براجمان ہو گئے۔

"میں نے کچھ پوچھا تھا تندوری......؟" حکیم طولانی نے کہنی میز پر ٹکاتے ہوئے دوبارہ انہیں کریدا۔

"ہاں...... کوشش تو کی تھی......" چچا تندوری لاپروائی سے بولے۔

"اچھا...... تو پھر......؟"

"پھر کیا......؟" چچا تندوری نے منہ بنایا۔ "کچھ بھی نہیں......!"

"تو اس نے تمہارا کام نہیں کیا......؟"

"کیا مطلب......؟" چچا تندوری نے انہیں گھورا۔

"میرا مطلب ہے کہ تم نے اسے جو کام بتایا، اس نے نہیں کیا؟" وہ جلدی سے بولے۔

"یہی سمجھ لو......" چچا تندوری نے کندھے اچکائے۔

"بتا دیا ہو گا تم نے اسے کوئی الٹا سیدھا کام......!" حکیم طولانی نے منہ بنایا۔

عین اسی وقت مطب کے سامنے سے خیراتی ہوٹل کا بیرا گزرا۔ اس کے ہاتھ میں چائے کے خالی برتن تھے۔

نہ جانے کیوں حکیم طولانی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ انہوں نے جلدی سے اسے آواز دی۔

"ارے چھوٹو...... ارے او چھوٹو......!"

"جی حکیم صاحب......؟" چھوٹو رک گیا۔

"ذرا دو کڑک سی دودھ پتی پکڑ لانا...... فٹافٹ......" حکیم طولانی نے آرڈر دیا۔

"اچھا صاب...... ابھی لایا......" یہ کہہ کر چھوٹو آگے بڑھ گیا۔

"خیریت تو ہے...... دودھ پتی......!" چچا تندوری نے انہیں گھورتے ہوئے پوچھا۔

"ارے کبھی کبھی تو تم یہاں آتے ہو...... ہی ہی......" وہ خواہ مخواہ ہنس دیئے۔

"پہلے تو تم نے کبھی نہیں پلائی......؟"

"پہلے تم سے اتنی قربت بھی تو نہیں تھی۔" حکیم طولانی نے جواب دیا۔ پھر ترنگ میں آ کر میز پر طبلہ بجاتے ہوئے گنگنائے۔

قریب آ کہ یہ موسم جواں رہے نہ رہے
زمانہ آج ہے کل مہرباں رہے نہ رہے

’’یہ گانا بھی طلعت محمود صاحب کا ہوگا؟‘‘ چچا تندوری نے انہیں گھورا۔

’’تمہیں کیسے معلوم......!‘‘ حکیم طولانی چونکے۔ جواباً چچا تندوری منہ بنا کر رہ گئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد چائے آ گئی اور اب وہ وقت آن پہنچا تھا کہ حکیم طولانی اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکیں۔ انہوں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پیالیوں میں چائے انڈیلی اور نظر بچا کر میز پر رکھے ہوئے خواب آور سفوف کی ایک پڑیا چچا تندوری والے کپ میں ڈال دی۔

انہوں نے یہ کام اتنی پھرتی اور صفائی سے کیا کہ چچا تندوری کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی، فوراً ہی حکیم طولانی نے وہ کپ ان کی طرف بڑھا دیا۔ ان کی چور نظریں اب بھی انگوٹھی پر جمی ہوئی تھیں۔ چچا تندوری نے جھٹ سے چائے کی پیالی سنبھالی اور غٹا غٹ اسے اپنے حلق میں انڈیل لیا۔ حکیم طولانی نے بھی اپنا کپ سنبھال لیا اور چچا تندوری کا جائزہ لینے لگے۔

پھر ان دونوں میں ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ جیسے جیسے اب وقت گزر رہا تھا۔ حکیم طولانی کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ پانچ منٹ گزر گئے......دس منٹ......اور پھر......

☆......☆......☆

شبن بہت خوش تھا۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ سب سے پہلی تو یہ کہ آج اسے ہوٹل کا کاؤنٹر سنبھالے ہوئے دوسرا دن تھا، نہ تو اس دوران کسی قسم کے دو بندوں سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی اور نہ رات کے وقت سونے کے دوران خواب میں کسی نے اسے پھوڑا......! اب تک نہایت آرام اور سکون سے اس نے دونوں دن گزارے تھے۔ کوئی بھی ناخوش گوار واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔

وہ دل ہی دل میں گاگے شاہ کی کرامت کا قائل ہو گیا۔ کسی طرح انہوں نے اپنے عمل کے ذریعے اسے ایک بڑی مصیبت سے نجات دلائی تھی۔ اس کے خوش ہونے کی دوسری وجہ کا تعلق بھی گاگے شاہ سے ہی متعلق تھا۔ اس کے زخم حیرت انگیز طور پر بھرنے لگے تھے۔ گاگے شاہ کا دیا ہوا ’’طلسمی مرہم‘‘ بہ ذات خود کسی کرامت سے کم نہیں تھا۔ اس نے دو دن لگا تار وہ مرہم استعمال کیا تھا اور اس کراماتی مرہم کا خاطر خواہ فائدہ دکھائی دے رہا تھا۔

ہوٹل کے دونوں بیرے یعنی چھوٹو اور ماتا، جو بے چارے ہوٹل بند رہنے کی وجہ سے کافی پریشان تھے۔ اس وقت بھی بڑے خوش باش ہو کر سروس کر رہے تھے۔

وہ جگنوؤں کی طرح ہال میں چکراتے پھر رہے تھے۔ وہ بھی اپنے مالک کی صحت یابی اور خیراتی ہوٹل کی ’’تالہ کھلوائی‘‘ کی وجہ سے کافی خوش تھے۔ ہوٹل اس وقت بھی پوری طرح آباد تھا، جو لوگ شبن کے شناسا تھے، وہ باقاعدہ کاؤنٹر پر آ آ کر اس کی خیریت دریافت کر رہے تھے۔

حسبِ معمول شبن نے پرانے گانوں کی ریکارڈنگ لگائی ہوئی تھی اور ان کی کلاسیکل لے پر جھوم رہا تھا۔ کہ دفعتاً دو آدمی ہوٹل میں داخل ہوئے۔ انہیں دیکھ کر شبن جھومتے جھومتے رک گیا۔

اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ کیونکہ اس نے محسوس کیا تھا کہ ان دونوں کے تیور قطعی ٹھیک نہیں ہیں۔ وہ ہال میں چاروں طرف نظریں دوڑا رہے تھے۔ شبن کو ان کا انداز بھی خونخوار محسوس ہوا۔ ان دونوں کی توجہ خود شبن کی طرف بھی ہوئی تھی، پھر وہ آگے بڑھے۔

شبن نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ اٹھایا اور ٹیپ ریکارڈر کی آواز دھیمی کر دی۔ اب اسے یقین ہو چکا تھا کہ دونوں آدمی آگے بڑھیں گے اور اسے ''دھون'' کر رکھ دیں گے۔

شبن کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ وہ دونوں آدمی اب زیادہ فاصلے پر نہیں تھے۔ شبن نے کبوتر کی طرح اپنی آنکھیں بند کر لیں......!

اب کٹائی ہوئی کہ تب ہوئی......! اسی سوچ کے عالم میں نہ جانے کتنے ہی لمحے گزر گئے۔ اور پھر شبن نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھول ڈالیں۔ فوراً ہی اس کے دل میں اطمینان کی ایک مسرت آگیں لہر دوڑ گئی۔

وہ دونوں اسے تھوڑی ڈھونڈ رہے تھے، شبن تو خواہ مخواہ غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا۔ ان دونوں کو تو دراصل مناسب قسم کی میز درکار تھی۔ پھر وہ کاؤنٹر کے قریب ہی ایک میز پر آ بیٹھے تھے۔

شبن نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو خوب لتاڑا، اور پھر سکون کا ایک طویل سانس لے کر ٹیپ ریکارڈر کی آواز دوبارہ اونچی کر دی۔ ایک بار پھر اس کا ہاتھی نما جسم تھرکنے لگا تھا۔ اس گانے کے بول بھی خوب تھے، جس پر شبن جھوما تھا۔

تپلی کمر، میری ترچھی نظر......او بابو......!

☆......☆......☆

کتاب گھر کا پیغام

آپ تک بہترین اردو کتابیں پہنچانے کے لیے، ہمیں آپ ہی کے تعاون کی ضرورت ہے۔ ہم کتاب گھر کو اردو کی سب سے بڑی لائبریری بنانا چاہتے ہیں، لیکن اس کے لیے ہمیں بہت ساری کتابیں کمپوز کروانا پڑیں گی اور اسکے لیے مالی وسائل درکار ہوں گے۔

اگر **آپ** ہماری براہ راست مدد کرنا چاہیں تو ہم سے kitaab_ghar@yahoo.com پر رابطہ کریں۔ اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو کتاب گھر پر موجود **ADs** کے ذریعے ہمارے سپانسرز ویب سائٹس کو وزٹ کیجئے، آپکی یہی مدد کافی ہوگی۔

یاد رہے، کتاب گھر کو صرف **آپ** بہتر بنا سکتے ہیں۔

اور پھر محلے بھر میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ اسی ہفتے مہ پارہ کی شادی ہو رہی ہے۔ یہ خبر گل بانو اور برکت صاحب نے خود ہی پہنچائی تھی۔ گو کہ محلے والوں نے اس قدر جلد بازی پر حیرت کا اظہار کیا تھا۔ لیکن ہر اعتراض کرنے والے کے لئے ان دونوں کا مشترکہ جواب یہی ہوتا۔

’’بھئی...... ہمیں تو کوئی جلدی نہیں تھی...... بس کیا کریں...... حکیم طولانی مہ پارہ کا علاج کر رہے ہیں، ان کا ہی حکم ہے کہ مہ پارہ کی جلد سے جلد شادی کر دی جائے۔‘‘

’’اچھا...... کس سے کر رہے ہیں مہ پارہ کی شادی؟‘‘ کسی نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

’’ہے ایک نیک طبیعت کا نوجوان......‘‘ برکت صاحب نے سر ہلا کر بتایا۔ ’’اور شادی کے بعد کچھ دن تک وہ ہمارے ساتھ ہی رہے گا۔‘‘

’’ایں...... یعنی...... گھر داماد......؟‘‘ چونک کر پوچھا گیا۔

’’بھئی...... بات یہ ہے کہ اس کا اپنا گھر ابھی تعمیری مراحل میں ہے اور ہمیں جلدی ہے۔ اس لئے جب اس کے گھر کا کام مکمل ہو جائے گا...... تو ہم مہ پارہ کو رخصت کر دیں گے۔‘‘

’’اوہ...... اچھا......‘‘ مختلف آوازیں سنائی دیں۔

’’ہاں...... اور یہ شادی بھی بہت سادگی سے ہوگی......‘‘ برکت صاحب نے لوگوں کو مزید آگاہ کیا۔ ’’نہایت سادگی سے...... کیونکہ کم خرچ بالانشین ہوتا ہے اور میری تمام لوگوں سے اپیل بھی یہی ہے کہ کسی کی بھی شادی ہو، لاکھ خوشی کا موقع سہی لیکن کفایت کے شعار کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ یہی کوشش کریں کہ کم سے کم اخراجات ہوں۔ بھئی، آخر قیامت والے دن اپنے مالک کو بھی تو منہ دکھانا ہے کہ نہیں......؟‘‘

☆......☆......☆

حکیم طولانی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ دراصل جو سفوف انہوں نے چچا تندوری کو چائے میں گھول کر پلایا تھا، اس کی گارنٹی تھی کہ پینے والا پانچ منٹ کے اندر ہی اندر ’’انٹا غفیل‘‘ ہو جاتا تھا۔ اور ادھر چچا تندوری پر تو خاک دھول بھی اثر نہیں ہوا تھا، وہ نہایت آرام اور سکون سے بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ حکیم طولانی سے رہا نہ گیا۔ آخر پوچھ ہی بیٹھے۔

’’چچا تندوری......! تم آخر کس مٹی سے بنے ہو......؟‘‘

’’کیوں......؟ تم نے کیا مجھے کھرچ کر دیکھا ہے؟‘‘ چچا تندوری کا الٹا سوال تھا۔

’’ارے...... بھلے مانس......! میں نے تمہیں چائے میں خواب آور دوا ملا کر پلا دی تھی اور تم بے ہوش تو کیا ہوتے ذرا سا اونگھے بھی نہیں۔‘‘ حکیم طولانی نے اپنی چوری اگل دی۔

چچا تندوری نے انہیں گھور کر دیکھا۔

’’ہیں...... خواب آور دوا پلائی تھی...... مگر کیوں......؟‘‘

’’پہلے یہ بتاؤ کہ تم بے ہوش کیوں نہیں ہوئے؟‘‘ حکیم طولانی نے ان کی بات سنی ان سنی کر دی۔

”مجھے کیا معلوم......ہوسکتا ہے کہ یہ کسی جڑی بوٹی کا اثر ہو......“ چچا تندوری نے خیال ظاہر کیا۔

”جڑی بوٹی......کیا مطلب......؟“

”بھئی......میں تمہیں......اور شہر کے کئی اور حکیموں کو جنگل سے جڑی بوٹیاں لا کر دیتا ہوں نا......؟“

”ہاں......تو پھر......؟“ حکیم طولانی نے ہونقوں کی طرح پوچھا۔

”پھر یہ کہ میں ہر نئی قسم کی جڑی بوٹی کو پہلے خود چکھتا ہوں کہ کہیں خدانخواستہ وہ زہریلی تو نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی بوٹی کا ہی یہ اثر ہو کہ میں بے ہوش نہیں ہوا۔“

”ارے......خدا کے بندے......! تم یہ کیا غضب کرتے ہو......؟ اگر کسی دن......کوئی جڑی بوٹی تمہاری جان لے لے تو......؟“

”کوئی بھی جان سے نہیں مار سکتا۔ مارنے والا صرف ایک ہی ہے......جو ہر جگہ موجود ہے۔ جیسی میری موت لکھی ہے ویسی ہی آئے گی۔“ انہوں نے لاپروائی سے جواب دیا۔

”تم بھی ایک ہی ہو......اپنی نوعیت کے......!“ حکیم طولانی متاثر لہجے میں بولے۔

”یہ لفظ نوعیت کیا کوئی گالی ہے؟ اچھا چھوڑو......یہ بتاؤ کہ تم مجھے بے ہوش کرنے کی کوشش کیوں کر رہے تھے؟“

جواباً چند لمحے تو حکیم طولانی خاموش رہے۔ پھر انہوں نے شرمندہ شرمندہ سے انداز میں بتایا۔ ”میں تمہیں بے ہوش کر کے یہ انگوٹھی تمہارے ہاتھ سے اتارنا چاہ رہا تھا......؟“

”کیوں......؟“ چچا تندوری نے حیرت کا اظہار کئے بغیر پوچھا۔

اس کیوں کے جواب میں حکیم طولانی نے پری کے ذریعے اپنی عظیم شاعر بننے والی خواہش کا اظہار کر دیا۔

”مرغوں والی“ بات وہ گول کر گئے تھے، ورنہ ہوسکتا تھا کہ چچا تندوری بہک جاتے۔

ان کی بات سن کر چچا تندوری نے ان پر لعنت ملامت کرنے کے بعد کہا۔ ”اماں......یہ بھی کوئی بات تھی......؟ تم نے ڈائریکٹ مجھ سے کہہ دیا ہوتا، میں انگوٹھی تمہیں یونہی دے دیتا یہ لو......!“

یہ کہہ کر انہوں نے اپنی انگلی سے انگوٹھی اتاری اور حکیم طولانی کی طرف بڑھا دی۔ حکیم طولانی نے چونک کر پہلے تو چچا تندوری کی شکل دیکھی اور پھر کانپتے ہوئے ہاتھ سے انگوٹھی تھام لی۔

وہ کافی حیرت زدہ دکھائی دے رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ جس کام کے لئے انہوں نے اتنا ذہن لڑایا تھا، اتنے منصوبے بنائے تھے......وہ اتنے آرام سے ہوگیا تھا۔

خواہ مخواہ انہوں نے اتنی انرجی ضائع کی۔ ”اب کیا کروں......؟ اسے رگڑوں......؟“ حکیم طولانی نے احمقوں کی طرح چچا تندوری سے سوال کیا۔

جواب تو انہیں ضرور ملا اور ایسا کہ وہ سر سے لے کر پاؤں تک سرخ ہو گئے۔ آخر کار ہچکچاتے ہوئے وہ اپنی کرسی سے اٹھے اور مطب کے اندر ہی ذرا کھلی جگہ پر فرش کے اوپر انگوٹھی رگڑ ڈالی۔ اور پھر جو کچھ ہوا، وہ ان کے خواب و خیال میں بھی نہ ہوگا۔ خود چچا تندوری بھی حیرت زدہ رہ گئے تھے۔

حکیم طولانی نے جیسے ہی انگوٹھی رگڑی، وہ غائب ہو گئے۔ فوراً ہی ان کی جگہ ایک چھوٹا سا گدھا آ کھڑا ہوا۔ یعنی اب وہاں حکیم طولانی کے بجائے وہ گدھا موجود تھا۔

یہ منظر دیکھ کر چند لمحے تو چچا تندوری بھی ہکا بکا رہ گئے کہ یہ کیا ہوا......؟

پھر دفعتاً ان کے ذہن میں یہ بات گھوم گئی جو انہوں نے غصے میں آ کر کہی تھی......اور جسے پری نے بھی پلٹ کر پوچھا تھا۔

''اب تمہیں جو بلائے گا......وہ گدھے کا بچہ ہوگا!'' یہ بات چچا تندوری نے پری سے کہی تھی۔ اور اب ان کے سامنے حکیم طولانی کے بجائے گدھے کا بچہ ہی کھڑا ہوا تھا۔

چونکہ حکیم طولانی پری کو بلانا چاہتے تھے، اس لئے صاف ظاہر تھا کہ پری نے انہیں گدھے کا بچہ بنا دیا تھا۔

''اپنی بات کی تو بڑی پکی ہے پری......!'' چچا تندوری زیر لب بڑبڑائے اور غور سے اس گدھے کے مم......مطلب یہ ہے کہ حکیم طولانی کو دیکھنے لگے۔ جو بے چارے خود اس عالم میں بڑی التجائیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

گدھے کے بچے کے روپ میں وہ کھڑے ہوئے واقعی ایسی نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے جیسے کہہ رہے ہوں۔ ''ارے تندوری...... یہ کیا ہو گیا......؟ اب......اب کیا ہوگا......؟''

''یہ ہوا کہ عظیم ترین بن گئے تم......!'' چچا تندوری نے منہ بنا کر کہا۔ ''بہت شوق تھا نا تمہیں عظیم بننے کا......!''

یہ سن کر گدھے کے بچے......یعنی سابقہ حکیم طولانی کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو چھلک گئے۔ عین اسی وقت دروازے پر قدموں کی آہٹ ہوئی۔ چچا تندوری نے گھوم کر دیکھا۔

سامنے ملو استاد اور کلو چرسی حیرت بھری نظروں سے دکان کے اندر کا منظر دیکھ رہے تھے۔

''ارے......ملو استاد......اتنی مشابہت تو ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھی......'' کلو چرسی کے منہ سے نکلا۔ ''ذرا بتاؤ تو کہ ان دونوں میں سے اپنے چچا تندوری کون سے ہیں؟''

☆......☆......☆

گاگے شاہ، چنگا منگا اور بوقاف کے ہمراہ ایک مارکیٹ میں شاپنگ کرتے پھر رہے تھے۔ چنگا اور منگا کے ہاتھوں میں سامان کے تھیلے موجود تھے۔ چھوٹی موٹی خریداری تو ہو چکی تھی۔ اب صرف دولہا اور دلہن کے لئے شادی کے جوڑے لینا باقی تھا۔

گاگے شاہ آج ایک بالکل نئے رنگ میں دکھائی دے رہے تھے۔ بعض مقامات پر تو انہوں نے اپنے مریدوں کو بھی حیرت زدہ کر دیا تھا۔ ان مقامات میں سے چند مقام تو ایسے تھے، جہاں ''فیشن زدہ'' خواتین کی بہتات تھی۔ پر رونق مارکیٹ تھی، اس لئے چہل پہل بلکہ عوام

کی ریل پیل زیادہ تھی۔ گاگے شاہ جگہ جگہ رکتے، اپنے ساتھیوں کے ساتھ خوب کھاتے پیتے اور ہلہ گلہ کرتے۔ محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ یہ وہی گاگے شاہ ہیں، جو بڑے بڑے جنوں اور بھوتوں پر دسترس رکھتے ہیں۔

منگا نے تو انہیں ٹوک بھی دیا تھا۔ ''کیا بات ہے شاہ صاحب...... آج تو آپ کا روپ ہی انوکھا ہے، خیر تو ہے؟''

''بس یار......!'' انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''کبھی کبھی خود کو بدلنا چاہئے...... ایک ہی اسٹائل میں آدمی بور ہو جاتا ہے۔''

''میرے خیال سے شاہ صاحب کو اپنی جوانی یاد آ رہی ہے۔'' منگا ہنسا۔

''ان پر جوانی آئی تھی......؟'' بوقاف نے حیرت سے انہیں سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا۔

''اماں...... کڑیل جوان تھا میں...... کڑیل جوان! ہاں...... یہ تو وقت ہے...... جو کسی کو بھی نہیں چھوڑتا...... ورنہ پیارے...... میں ایسا تھا اپنی جوانی میں کہ لڑکیاں رشک کرتی تھیں مجھے دیکھ کر......!''

''کیوں...... وہ کیوں رشک کرتی تھیں؟'' بوقاف نے باقاعدہ کریدتے ہوئے پوچھا۔

''ابے...... تم بھی نرے گاؤدی ہی ہو......'' منگا نے منہ بنا کر بوقاف کی طرف دیکھا۔ ''لڑکیاں ان کی کمر پر رشک کھاتی ہوں گی، پہلے ہو گی ان کی پتلی کمر...... اب کمرہ ہو گئی ہے تو کیا ہوا......!''

''میں تجھے بند کر دوں گا اس کمرے میں......'' گاگے شاہ نے گویا اسے دھمکی دی۔ ''یہاں تو تالے کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔ سر پٹک پٹک کر خود ہی مر جاؤ گے......''

ان کی اس بات پر ایک زوردار قہقہہ لگا تھا۔ پھر ایک دکان سے پشاوری آئس کریم کھانے کے بعد طے یہ ہوا کہ اب دولہا یعنی بوقاف کے سوٹ کا انتظام کیا جائے۔ پھر اس کے بعد دلہن کے لئے بھی دو عدد سوٹ لینا تھے۔

اسی غرض سے گاگے شاہ مردانہ کپڑوں کی ایسی دکان میں داخل ہوئے، جہاں بھیڑ بھاڑ نہیں تھی۔ دکان کا مالک لمبے سے کاؤنٹر کے عقب میں ایک اسٹول پر گم صم بیٹھا ہوا تھا۔ دیواروں پر چاروں طرف مردانہ سوٹ ٹنگے ہوئے تھے۔ گاگے شاہ وغیرہ کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ پہلے تو چونکا اور پھر سنبھل کر فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

''آیئے جناب...... آیئے...... تشریف لایئے۔'' اس نے ہانک لگائی۔

''آ تو گئے ہیں۔'' منگا نے منہ بنایا۔ ''تم خواہ مخواہ ہمارے کانوں میں جملے ٹھونس رہے ہو۔''

''کک...... کیا کروں جناب...... یہ میری عادت ہے۔'' دکان کے مالک نے دانتوں کی نمائش کی۔

یہ چھریرے بدن کا پستہ قامت آدمی تھا۔ اس کی رنگت صاف شفاف تھی، عمر پینتیس سال کے لگ بھگ رہی ہو گی، اس کے سر کے بال گنج پن کی طرف مائل تھے۔ اس وقت وہ ٹٹولنے والی نظروں سے ان چاروں کو دیکھ رہا تھا۔

''اس کی عادت بھی بہت بری ہے۔'' چنگا بول اٹھا، اس کا اشارہ منگا کی طرف تھا۔ ''یہ کوئی بات دل میں نہیں رکھتا، منہ پر بول دیتا ہے۔''

''تم دونوں پھر شروع ہو گئے......؟'' گاگے شاہ نے اپنے مریدوں کو گھورا اور پھر دکان کے مالک کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ''ہاں بھئی...... ذرا سوٹ تو دکھاؤ...... دولہا کے لئے چاہئیں۔''

''اوہ اچھا......'' وہ چونکا، پھر باری باری سب کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ میں سے دولہا کون ہے......؟''

''یہ ہے......؟'' چنگا نے بوقاف کی طرف اشارہ کیا۔

''ارے بھائی...... مت کرو شادی...... میری مانو، ورنہ پچھتاؤ گے۔'' دکان کا مالک گھگیا کر بوقاف سے مخاطب ہوا۔

''کیوں......؟'' بوقاف کے لہجے میں حیرت تھی۔

''دس سال سے بھگت رہا ہوں...... دس سال سے!'' دکان مالک ہاتھ نچاتے ہوئے بولا۔ ''اپنی بیوی کے لئے کیا مثال دوں......؟ بس یوں سمجھ لو کہ وہ ایسا بم ہے، جو روزانہ ہی میرے گھر میں پھٹتا ہے اور در و دیوار ہلا دیتا ہے۔ ہاں......''

''واہ...... کیا مثال دی ہے؟'' منگا کے منہ سے نکلا۔

''یہ تجربہ تو جب ہی ہوگا...... جب شادی ہوگی۔'' بوقاف نے سر ہلایا۔

''مرضی ہے تمہاری......'' دکان کے مالک نے ٹھنڈی سانس بھری اور ہینگر میں ٹنگا ہوا ایک سوٹ نکال کر کاؤنٹر پر پھیلا دیا۔ یہ گولڈن کلر کا کام والا سوٹ تھا اور کافی جاذب نظر تھا۔

''کیا قیمت ہے اس کی بھئی......؟'' گاگے شاہ نے کپڑے کو انگلیوں سے مسلتے ہوئے پوچھا۔

''صرف پندرہ ہزار روپے......'' دکان والے نے بتایا۔

''کیا کہہ رہے ہو بھئی......؟ یہ تو بہت زیادہ ہیں۔''

''اس سے کم قیمت نہیں ہو سکتی، آپ پوری مارکیٹ گھوم لیں۔'' دکان والے نے دوٹوک بات کی۔

''سوچ لو......!'' گاگے شاہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''نام کیا ہے تمہارا......؟''

''میرا نام الیاس ہے......''

''ہاں تو...... الیاس میاں......! کچھ تو کم کرو......''

''یہ ناممکن ہے جناب...... میری دکان پر ایک دام کا مال ہوتا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''ارے خاک ڈالو اس سوٹ کی قیمت پر......'' گاگے شاہ نے لاپروائی سے سوٹ پرے کھسکا دیا۔ ''تم مجھے ایک بات بتاؤ......؟''

''جی...... فرمائیے......؟'' وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''کان ادھر لاؤ......'' گاگے شاہ نے اشارہ کیا۔

''کیوں......؟'' الیاس نے چونک کر پوچھا۔

''کاٹ نہیں کھاؤں گا...... تم کان تو ادھر لاؤ......'' گاگے شاہ نے منہ بنایا۔

تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد الیاس اپنا کان ان کے منہ کے قریب لے آیا۔ اور پھر بوقاف وغیرہ نے دیکھا کہ گاگے شاہ نے نہایت دھیمی آواز میں اس کے کان میں کچھ کہا تھا۔ اگلے ہی لمحے الیاس اچھل پڑا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گاگے شاہ کو دیکھنے لگا۔ دنیا جہان کی حیرت اس کی آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔

ادھر اب گاگے شاہ کے ہونٹوں پر بھی ایک پراسراری مسکراہٹ تھی۔ وہ نہایت اطمینان سے الیاس کی بدلی ہوئی کیفیت سے گویا لطف اندوز ہو رہے تھے۔ چنگا اور منگا ہونقوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے، بوقاف کا بھی یہی حال تھا۔

''اس کے کان میں کیا کہہ دیا شاہ صاحب نے آخر؟'' منگا نے چنگا سے سرگوشی کی۔ ''یہ بے چارہ تو مست ہو گیا۔''

''کوئی قوالی تو نہیں سنا دی......؟'' خود چنگا نے تشویش سے الیاس کی طرف دیکھتے ہوئے الٹا سوال کیا۔

''سچ مچ کاٹ ہی نہ لیا ہو......؟'' منگا بھی خود کلامی کے عالم میں بڑبڑایا۔

''نہیں بے......!'' چنگا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''شاہ صاحب کان کھاتے ہیں یا پھر پکڑاتے ہیں، کاٹتے ہرگز نہیں ہیں۔''

''اور اگر......'' بوقاف بھی چپ نہ رہ سکا۔ ''انہوں نے کبھی کچھ کاٹا بھی، تو وہ تم دونوں کی زبانیں ہوں گی۔''

چنگا اور منگا اسے گھور کر رہ گئے۔ ادھر گاگے شاہ معنی خیز نظروں سے الیاس کی طرف متوجہ تھے جبکہ الیاس ابھی تک حیرت کا بت بنا ہوا تھا۔ وہ ان لوگوں کی چہ مگوئیوں سے قطعی بے خبر تھا۔ دفعتاً تھوڑی دیر بعد اس کے ہونٹ ہلے، انداز کھویا کھویا سا تھا۔

''یہ...... یہ بات تو...... میرے محلے والوں کو بھی معلوم نہیں ہے...... پھر...... آپ کو کیسے پتا چلی...... آپ...... آپ کون ہیں......؟''

''بکواس مت کرو......'' چچا تندوری بھنا کر بولے۔ ''اور پہچانو اپنے خالو کو ہاں...... تمہارے خالو ہیں یہ......''

''کلو کے خالو......؟'' ملو استاد نے غور سے گدھے کو دیکھا۔ نفی میں سر ہلا کر بولا! ''نہیں...... یہ کلو کے خالو نہیں ہو سکتے...... ان کی دم تو ہے ہی نہیں...... میں ان سے کئی بار ملا ہوں۔''

''اب نکل آئی ہے۔'' چچا تندوری نے سر ہلایا۔ پھر گرج کر بولے۔ ''ابے گدھوں...... یہ گدھا حکیم طولانی......''

''ارے...... یہ حکیم صاحب سے علاج کروانے آیا ہے۔'' کلو چرسی نے چونک کر ان کی بات کاٹی۔ ''پھر تو واقعی یہ گدھا ہی ہے۔ اس سے بڑا بے وقوف اور کون ہو گا......!''

''لیکن یار......!'' ملو استاد کے لہجے میں الجھن تھی۔ ''حکیم صاحب نے جانوروں کا علاج کب سے کرنا شروع کر دیا......؟''

''جب سے انسانوں نے ان کے مطب میں آنا چھوڑا ہے، شاید تب سے...... کیونکہ اب تو ہر کوئی ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے اور حکیم صاحب یہاں بیٹھ کر مکھیاں مارتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے گدھوں کا علاج کرنا شروع کر دیا۔'' کلو چرسی نے تفصیل بتائی۔

''لیکن چچا تندروی پھر یہاں کیا کر رہے ہیں؟'' ملو استاد نے چچا تندروری کو گھورا۔

یہ سن کر چچا تندروری اور بھی بھنا اٹھے! ''تم دونوں خود بھی مجھے اس وقت گدھوں سے کم نہیں لگ رہے۔ ارے بے وقوفوں......! پہلے پوری بات تو سن لو۔''

''سن لیں گے چچا......!'' ملو استاد لاپروائی سے بولا۔ ''پہلے یہ بتاؤ کہ کیا گدھے کو بخار ہے......؟''

''نہیں......!'' چچا تندروی نے نفی میں سر ہلایا۔

''تو پھر......اس کے پیٹ میں درد ہے......؟''

''نہیں......نہیں......'' چچا تندروری نے پاؤں پٹخے۔

''تت......تو پھر کیا......؟'' ملو استاد نے بات ادھوری چھوڑی اور آنکھیں پھاڑ کر گدھے کو گھورنے لگا۔

گدھا بے چارہ نڈھال ہو رہا تھا۔ چچا تندروی نے ملو استاد کی تیز نظروں کو محسوس کیا، اور آگے بڑھ کر اس کے سر پر ایک زوردار دھپ رسید کر دی۔

''ابے مردود......! میری بات تو پوری ہونے دے......کم بخت......یہ کوئی گدھا ودھا نہیں ہے، بلکہ یہ خود حکیم طولانی ہیں۔'' چچا تندروری نے انکشاف کیا۔

یہ سن کر دونوں کے منہ سے ہنسی کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ خاص طور پر کلو چری تو اتنے بے ڈھنگے پن سے ہنسا کہ چچا تندروری کا چہرہ گیلا ہو گیا۔

''ابے......تھوک کیوں رہا ہے......؟'' وہ آستین سے منہ صاف کرتے ہوئے اس پر گرم ہو گئے۔

کلو چری نے فوراً اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

''چلو......چچا تندروی......یہ تو اچھی بات ہے۔'' ملو استاد نے فوراً کلو چری کی سائیڈ لی۔ ''کلو کی اس حرکت سے کم از کم تمہارا منہ تو دھل گیا۔ ورنہ کہاں دھلائی اور کہاں تمہارا منہ......!''

چچا تندروی بھنا کر کچھ کہنے ہی والے تھے کہ گدھے کا بچہ فرش پر لوٹنے لگا۔ سب چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ دفعتاً چچا تندروری نے آگے بڑھ کر کوئی چیز فرش پر سے اٹھائی اور مٹھی میں دبالی۔ ''کیا چھپا رہے ہو چچا؟'' ملو استاد نے انہیں گھورا۔

''بتانا ہوتا، تو چھپاتا کیوں......؟'' وہ تنک کر بولے۔

''چھپالو......چھپالو......'' کلو چری نے فوراً سر ہلایا۔ ''لیکن یہ بتاؤ کہ ابھی تم نے حکیم صاحب کو گدھا کیوں کہا تھا......؟ اور وہ اس وقت ہیں کہاں......؟''

''ابے......کیا تمہارے دماغ میں بالکل ہی بھس بھر گیا ہے......دکھائی نہیں دے رہا......؟ یہ گدھا ہی تو حکیم طولانی ہے......ٹھہرو......! میں ابھی بتاتا ہوں......''

یہ کہہ کر چچا تندروری فرش پر اکڑوں بیٹھ گئے اور ہاتھ میں دبی ہوئی چیز کو فرش پر رگڑنے لگے۔

یہ وہی پری والی انگوٹھی تھی۔ اگلے ہی لمحے پری وہاں حاضر ہوگئی۔ ''اسے دیکھ کر کلو چرسی اور ملو استاد پہلے تو اچھلے اور پھر اس کے حسن میں گم ہو کر رہ گئے۔ وہ دونوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پری کو دیکھ رہے تھے۔

''کیا حکم ہے میرے آقا......!'' پری کی دلکش آواز ان کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

''اماں استاد......!'' کلو چرسی کے منہ سے کھوئے کھوئے انداز میں نکلا۔ ''بڑی چوکس ہے یہ تو...... قسم سے......''

چچا تندروی نے اسے گھورا، اور کچھ کہے بغیر پری کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ''یہ کیا ہوا ہے بھئی......؟'' ان کا اشارہ گدھے کے بچے کی طرف تھا۔ ''حکیم صاحب نے انگوٹھی رگڑی تھی، تمہیں بلانے کے لئے......اور پھر ان کا یہ حال ہو گیا۔''

پری نے بڑی لاپروائی سے حکیم طولانی کی طرف دیکھا اور منہ بنا کر بولی۔ ''آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ اب جو بھی مجھے بلائے گا وہ گدھے کا بچہ ہو گا۔ میں نے تو آپ کے حکم کی تعمیل کی ہے۔''

''اوہ......'' چچا تندروی کے منہ سے نکلا۔ انہیں یاد آ گیا۔ غصے میں آ کر وہ یہ الفاظ واقعی پری سے کہہ چکے تھے۔ ادھر کلو چرسی اور ملو استاد کا حال برا تھا۔ وہ ہونقوں کی طرح کبھی چچا تندروی کو دیکھتے اور کبھی اس لالۂ رخ حسینہ کو......

''اچھا...... چلو...... اب انہیں دوبارہ انسان بنا دو یہ بھی کر سکتی ہو یا نہیں......؟'' چچا تندروری جلدی سے بولے۔

پری نے اطمینان سے گردن ہلائی اور گدھے کے بچے کی طرف سیدھا ہاتھ اٹھا دیا۔ اگلے ہی لمحے اب فرش پر گدھے کے بچے کی جگہ حکیم طولانی لوٹ لگا رہے تھے۔

حیرت کے مارے کلو چرسی اور ملو استاد کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ ان کی آنکھوں میں خوف بھی دوڑ گیا تھا۔ ''چچ...... چچ...... چچا...... یہ یہ سب...... کک...... کیا ہے؟'' ملو استاد ہکلایا۔

''دیکھ تو رہے ہو اپنی آنکھوں سے......'' چچا تندوری نے منہ بنایا۔ پھر وہ حکیم طولانی سے مخاطب ہوئے!

''اماں...... اب اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ حکیم صاحب! اب تم گدھے نہیں رہے۔''

یہ سنتے ہی حکیم طولانی کی لوٹیں رک گئیں۔ وہ چونک کر کے اور ایک جھٹکے سے فرش سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

ان کے چہرے پر شرمندگی کے آثار تھے۔ فوراً ہی وہ اپنے کپڑے جھاڑنے لگے وہ سب سے نظریں چرا رہے تھے۔ پری اب بے اعتنائی سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔

''ہاں بھئی...... اب بتاؤ حکیم صاحب......!'' چچا تندروی ان سے مخاطب ہوئے۔ ''تمہاری کون سی خواہش ہے......؟ پوری کرنے کے لیے پری کھڑی ہے......!''

''کوئی نہیں بابا......'' انہوں نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگایا! ''اب تو میری کوئی بھی خواہش نہیں ہے۔ اس نے پہلے مجھے گدھا بنا دیا...... اب نہ جانے کیا بنا ڈالے...... اس سے کہہ دو...... یہاں سے چلی جائے۔''

’’ارے...... تو یہ خواہشیں پوری کرنے والی پری ہے......؟‘‘ کلوچرسی کے منہ سے نکلا۔ پھر وہ جلدی سے چچا تندروی کی طرف بڑھا۔

’’پیارے چچا......! میری ایک خواہش تو پوری کروادو...... میں...... میں اس پری سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’تم سے اچھا تو کوئی لنگور ہی ہوگا......‘‘ چچا تندروی نے منہ بنایا! ’’کچھ کہنے سے پہلے اپنی شکل بھی یاد رکھ لیا کرو۔‘‘

کلوچرسی شرمندہ سا ہوگیا۔ اب چچا تندروی پری کی طرف گھومے۔

’’معاف کرنا بھئی...... تم ہم لوگوں کے کسی کام بھی نہیں آسکتیں، اس لیے تم اپنی یہ انگوٹھی سنبھالو...... اور یہاں سے چلی جاؤ۔ ویسے بھی اگر تمہاری چچی کو معلوم ہوگیا...... تو میری شامت آجائے گی۔‘‘

یہ کہہ کر چچا تندروی نے انگوٹھی اس کی طرف بڑھادی۔ پری کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر انگوٹھی ان کے ہاتھ سے لے لی۔ دوسرے ہی لمحے وہ غائب ہو چکی تھی۔

☆......☆......☆

’’یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے......؟‘‘ چنگا نے گردن اکڑائی۔ ’’ارے...... انہیں تو پورا شہر جانتا ہے...... پیر گاگے شاہ نام ہے ان کا...... ہاں......‘‘

دکان دار نے اب غور سے گاگے شاہ کو دیکھا۔ خود گاگے شاہ بھی مزید تھوڑے سے پھول گئے تھے۔ ’’نہیں......‘‘ وہ نفی میں سر ہلا کر بولا۔ ’’میں انہیں نہیں جانتا......‘‘

’’تو پھر تم یقیناً اس شہر میں نہیں رہتے۔‘‘ منگا بولا۔ ’’شاہ صاحب کی کرامات سے تو شہر کا بچہ بچہ واقف ہے۔‘‘

’’مجھے تو دکان اور اپنے گھر سے فرصت ہی نہیں ملتی۔‘‘ وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ پھر مضطربانہ انداز میں گاگے شاہ کے ہاتھوں کو تھام کر بولا۔

’’اب...... اب ہوگا کیا شاہ صاحب......؟‘‘

’’تم کیا چاہتے ہو......؟‘‘ انہوں نے الٹا سوال کیا۔

’’میں...... میں تو چاہتا ہوں کہ وہ واپس آجائے...... اور کبھی میرے ساتھ جھگڑا نہیں کرے۔‘‘ اس نے بتایا۔

’’تو پھر یہی ہوگا......‘‘ وہ سر ہلا کر بولے۔ ’’تم آستانے پر آنا...... میں تمہیں ایک تعویذ بنا کر دوں گا...... اس تعویذ کا نام ہے۔ ’’وارننگِ طلاق‘‘ تم اسے اپنے گھر کے دروازے پر باندھ دینا۔ کھنچی چلی آئے گی تمہاری بیوی...... اور پھر کبھی تم سے جھگڑا بھی نہیں کرے گی۔‘‘

’’وارننگِ طلاق کا تعویذ......؟‘‘ دکان دار نے حیرت سے دہرایا۔ ’’یہ تعویذ کہاں ہوتا ہے...... یہ تو نوٹس ہوتا ہے۔‘‘

’’تم شاہ صاحب سے زیادہ علم رکھتے ہو......؟‘‘ چنگا نے اسے گھورا۔ اس نے بوکھلا کر گردن نفی میں ہلادی۔ بوقاف اب تک خاموشی سے کھڑا ہوا یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ اتنا تو وہ سمجھ چکا تھا کہ گاگے شاہ نے اپنے علم کے ذریعے معلوم کرلیا تھا کہ اس دکان والے کی بیوی ناراض ہو کر گھر سے

چلی گئی ہے۔

لیکن گاگے شاہ کو ان سب باتوں سے کیا غرض......؟ اس نے سوچا۔ اور پھر جلد ہی اس کی سمجھ میں ساری کہانی آ گئی۔ جب تھوڑی دیر بعد بے چارے دکان والے نے ایک سوٹ کی قیمت میں ان لوگوں کو چار بہترین قسم کے سوٹ تھما دیئے۔

وہ تو اتنی قیمت بھی نہیں لے رہا تھا۔ گاگے شاہ نے زبردستی اس کے ہاتھ پر نوٹ رکھ دیئے۔

''لو بھئی......ہم اس لیے تھوڑی آئے ہیں تمہارے پاس......اپنے سوٹوں کی قیمت تو لو......'' گاگے شاہ نے از راہ ایمان داری کہا۔

بوقاف نے نہ جانے کیوں چنگا کی طرف دیکھا۔ چنگا نے جلدی سے دانت نکالے اور اسے آنکھ ماردی۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ ''دوسرے کو اس طرح بے وقوف بناؤ، کہ اسے پتا نہ چلے......''

☆......☆......☆

یہ شادی بالکل سادگی سے ہونا تھی۔ پھر بھی دلہن یعنی مہ پارہ کے عروسی جوڑوں کی خریداری اور تیاری کے سلسلے میں کلثوم اور صغراں خالہ وغیرہ بڑے جوش وخروش کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔

خاص طور پر دلہن کا کمرہ سجانے میں کلثوم خاص طور پر بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی۔

اسے ان سب چیزوں کا شوق بھی بہت تھا۔ اس وقت برکت صاحب دلہن کا کمرہ سجانے کے سامان کے سلسلے میں بازار گئے ہوئے تھے۔

کلثوم اور مہ پارہ دونوں ابھی ابھی اس کمرے کی صفائی وغیرہ سے فارغ ہو کر صحن میں گل بانو کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھیں۔

گل بانو کھلی جگہ پر بیٹھی ہوئی مزے سے ایک دوپٹے میں سوئی کی مدد سے گوٹہ کناری ٹانک رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں پر اس وقت نظر کا چشمہ بھی موجود تھا۔ اور وہ گردوپیش سے بے نیاز ہو کر ایک گانا گنگنا رہی تھیں!

چھوڑ بابل کا گھر......

موہے پی کے نگر، آج جانا پڑا......''

''ہائے......بھابھی جان......'' کلثوم بول پڑی۔ وہ انہیں اسی نام سے پکارتی تھی۔ ''کیا بات ہے......؟ بڑے موڈ میں ہیں آج......؟''

گل بانو چونک اٹھیں اور جلدی سے گانا ادھورا چھوڑ کر چشمے کی آڑ سے ان دونوں پر نظر ڈالی۔

مہ پارہ بھی مسکرا رہی تھی۔

''ارے کیا خاک موڈ میں ہوں......'' وہ منہ بنا کر بولیں۔ ''جب سے شادی ہوئی ہے......خدا بھلا کرے......25 سال گذر گئے۔ اتنے سالوں سے موڈ خراب ہی ہے۔''

کلثوم کے دانت نکل پڑے۔ ''تو کیا شادی آپ کی پسند سے نہیں ہوئی تھی......؟'' اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''ارے خاک ڈالو......'' وہ بھنا کر بولیں۔ ''اگر شادی پسند کی بھی ہو تو کیا فائدہ......؟ کیونکہ شادی کے بعد محبوب......محبوب نہیں رہتا،

بلکہ شوہر ہو جاتا ہے۔ اور یہ بات حقیقت ہے کہ دنیا کے سارے شوہر ایک جیسے ہوتے ہیں۔“

”کیا مطلب...... امی جان......؟“ مہ پارہ نے حیرت سے پوچھا۔ ”سب ایک جیسے کیسے ہو سکتے ہیں......؟“

”ہونے والی ہے تمہاری شادی......“ انہوں نے گویا اطلاع دی۔ ”خود ہی دیکھ لینا......“

یہ کہہ کر وہ دوبارہ دوپٹے سے الجھ گئیں۔

☆......☆......☆

جنوں کا مردار، حسب عادت اس وقت بھی اپنے سر پر طلبہ بجا رہا تھا۔ کیونکہ وہ شدید پریشانی کا شکار تھا۔ اس کی بیوی اس وقت کسی عذاب کی طرح اس کے سر پر سوار تھی۔ وہ دونوں ہاتھ اپنی کمر پر رکھے، سردار کے قریب ہی کھڑی ہوئی اسے خوں خوار نظروں سے گھور رہی تھی۔

”سر پہ طبلہ بجانے سے کچھ نہیں ہوگا“ وہ دہاڑ کر بولی۔ ”کان پکڑیے...... کان......اور کھائیے قسم کہ اب کبھی اس حرافہ لاسنی سے نہیں ملیں گے۔ جلدی سے قسم کھائیے......غضب خدا کا......الہ دین پارک میں ملاقاتیں ہو رہی ہیں......توبہ......“

”تمہیں یہ بھی معلوم ہے......؟“ سردار اچھل ہی تو پڑا تھا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنی بیوی کو دیکھنے لگا۔

”آپ ہی کی بیوی ہوں......“ وہ تنک کر بولی۔ ”آپ پورے قبیلے کی خبر رکھ سکتے ہیں......میں آپ کی خبر نہیں رکھ سکتی......؟“

سردار خاموش ہو گیا۔ وہ کسی سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ ”کہاں کھو گئے آپ......؟ قسم کھائیے جلدی سے ورنہ......“ وہ بولتے بولتے رک گئی۔

سردار اب بھی خاموش تھا، البتہ اب کی بار اس نے بیوی کو گھورا ضرور تھا۔ عین اسی وقت خادم وہاں نمودار ہوا۔ اسے دیکھتے ہی سردار کی بیوی پاؤں پٹختی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

خادم حیرت سے اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

”پوری زندگی میں آج تم آئے ہو بالکل صحیح وقت پر......!“ سردار نے گردن ہلا کر اسے دیکھا۔ انداز پسندیدگی کا تھا۔

خادم نے خوامخواہ دانت نکال دیئے۔

”اپنی بتیسی کی نمائش بند کرو......“ سردار کا رویہ بدلا۔ ”اور جلدی سے بتاؤ کہ تم کیوں نازل ہوئے ہو......؟“

”سیکریٹری آپ سے ملنے کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔“ خادم نے فوراً سنبھل کر جواب دیا۔

”سیک......ریٹ......ری......“ سردار نے نہ جانے کیوں لفظ کے کئی ٹکڑے کر ڈالے۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے تھے۔ پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے خام سے مخاطب ہوا۔

”اسے اندر بھیجو...... فوراً......“

یہ سنتے ہی خادم واپس مڑ گیا۔ چند ہی لمحوں بعد سیکریٹری کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا چہرہ نہ جانے کیوں آج کھلا پڑ رہا تھا۔ کافی ہشاش بشاش دکھائی دے رہا تھا وہ......

اس کے برعکس سردار کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے کہ سیکریٹری کی نظر جیسے ہی اس پر پڑی، وہ چونک اٹھا۔

"کیا ہوا سردار......؟ آپ اس وقت کسی فلم کے ولن کا رول کر رہے ہیں کیا......؟ اتنا خوف ناک انداز......!" سیکریٹری کے منہ سے نکلا۔

سردار واقعی غصے سے غضب ناک ہو رہا تھا۔ پھر وہ دہاڑ کر بولا۔

"تم نے لاسنی کے بارے میں میری بیگم کو کیوں بتایا......؟"

☆......☆......☆

خیراتی ہوٹل میں شام کے وقت کافی رونق تھی۔ تقریباً تمام میزیں آباد تھیں۔ ان ہی میزوں میں سے ایک پر برکت صاحب بھی حلقہ یاراں لگا کر بیٹھے ہوئے تھے۔

چچا تندوری، حکیم طولانی، کلوچری اور رشید رکشے والا بھی اس حلقے میں شامل تھے۔

ملوا استاد اس وقت یہاں موجود نہیں تھا، وہ اپنی پان کی دکان سنبھالے ہوئے تھا۔ ورنہ تو اس کی اور کلوچری کی جوڑی مشہور تھی۔

ہوٹل میں اس وقت بھی پرانے گانوں کی مدھر آوازیں گونج رہی تھیں۔ برکت صاحب حسبِ عادت کافی دیر سے بولے جا رہے تھے۔ ان کا موضوع تھا، مہ پارہ کی شادی......!

"بھئی...... برکت میاں......! تم بھلے مجھے شادی میں بلاؤ، یا نہ بلاؤ لیکن میں اس خوشی کے موقع پر ایک غزل ضرور سنانے آؤں گا۔ ہاں......" حکیم طولانی نے کہا۔

"ارے......کیا غضب کرو گے حکیم صاحب......؟" کلوچری نے خوف زدہ ہونے کی ایکٹنگ کی۔ "اتنے اچھے موقع پر اتنا گھٹیا آئٹم......؟"

"تم چپ ہی رہو......" حکیم صاحب کا منہ بن گیا؟ "بھلا بندر کیا جانے ادرک کا مزا......"

"گدھا تو جانتا ہوگا؟" کلوچری نے سادہ سے لہجے میں سوال کیا۔

حکیم صاحب کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ فوراً ہی انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کلوچری سے معافی مانگی۔

اب بھلا دوسروں کو تھوڑی معلوم تھا گدھے والا چکر......!

"یہ......گدھا کون ہے بھئی......؟" برکت صاحب سے رہا نہ گیا۔ حکیم صاحب کی اچانک خاموشی نے انہیں کلبلا دیا تھا۔

"گدھا تو کوئی بھی ہو سکتا ہے۔" چچا تندوری بول اٹھے۔ ساتھ ہی انہوں نے کلوچری کو گھورا تھا۔ "ویسے وہ آدمی زیادہ بڑا گدھا ہوتا ہے، جو محنت کیے بغیر چاہتا ہے کہ میری خواہشیں پوری ہو جائیں۔"

"ہاں...... یہ تو ہے۔" برکت صاحب نے خواہ مخواہ گردن ہلا دی۔ سمجھ میں تو ان کی خاک بھی کچھ نہیں آیا تھا۔ لیکن خود کو دانش مند بھی تو ثابت کرنا تھا۔

”اماں......شبن بھائی......ابھی تک چائے نہیں آئی......کیا ہوا......؟“ رشید رکشے والے نے ہانک لگائی۔

”ابھی آئی جناب......“ شبن نے خوش اخلاقی سے گردن ہلائی۔ ”آپ لوگوں کے لئے اسپیشل چائے بنوائی ہے۔ اسی لیے تھوڑی سی دیر ہو رہی ہے۔“

”کوئی بات نہیں......کوئی بات نہیں۔“ حکیم طولانی بھی اس کی طرف گھومے۔ ”بس ذرا طلعت محمود صاحب کا کوئی پھڑکتا ہوا گانا سنا دو......بڑا دل چاہ رہا ہے۔ قسم سے......“

”ابھی لو جی......“ یہ کہہ کر شبن نے ٹیپ ریکارڈر بند کیا اور کیسٹ بدل ڈالی۔

ذرا ہی دیر بعد وہاں مدہم سروں والے گلوکار کی آواز گونج رہی تھی۔

اے میرے دل کہیں اور چل......

حکیم طولانی دنیا و مافیہا سے غافل ہو گئے' اور گانے کی دھن پر طبلہ بجانے لگے۔

کلو چرسی نے فوراً ہی میز پر رکھے ہوئے جگ اور گلاس ان سے دور کر دیئے۔ ساتھ ہی وہ بولا تھا۔ ”یہ تو گئے کام سے......“

☆......☆......☆

سکریٹری بھونچکارہ گیا۔

”یہ......یہ آپ......کیا کہہ رہے ہیں......؟“ اس نے حیرت سے سردار کو دیکھا۔

”اب......تم جھوٹ بھی بولو گے؟“ سردار نے آنکھیں نکالیں۔

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا......آپ آخر کیا کہہ رہے ہیں؟“ وہ اب بھی الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

”بیگم کو لاسنی کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ سب تم نے ہی اسے بتایا ہوگا۔“

”انسان تو اپنی عقل استعمال کرتے ہیں۔“ سکریٹری کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔ ”آپ جن ہیں، اس لیے اپنا علم ہی استعمال کر لیتے......میں بھلا انہیں کیوں بتاؤں گا۔ سکریٹری میں آپ کا ہوں یا ان کا......؟“

یہ سن کر سردار کے چہرے کے عضلات ڈھیلے پڑ گئے۔ ”تو پھر......اسے کس نے بتایا......؟“

”کہہ تو رہا ہوں کہ اپنے علم سے پتا لگا لیجئے۔ خواہ مخواہ آپ نے مجھ پر الزام رکھ دیا۔ سکریٹری کا منہ پھول گیا۔

”بیگم کے آگے کوئی علم کام نہیں کرتا۔“ سردار نے سرد مہری سے کہا۔ ”کیا کروں......؟“

”اب میں کیا بتاؤں......؟ آپ نے تو میری وفاداری پر آگ پھیر دی۔“ سکریٹری کا موڈ بدستور خراب تھا۔

”اوہو......ناراض کیوں ہوتے ہو......؟“ سردار جلدی سے بولا۔ ”میں بہت پریشان ہوں، اسی لیے میں نے تم پر اپنا غصہ اتار دیا تھا۔ اور کرتا بھی کیا......؟ بیگم کو تو کچھ کہنے سے رہا......لیکن......اگر تم نے اسے نہیں بتایا تو پھر یہ کس کا کام ہے......؟“

’’خود لاسنی کا......‘‘ ایک آواز آئی اور دونوں ہی اچھل پڑے۔

کمرے میں سردار کی بیوی نمودار ہوئی تھی اور یہ الفاظ اسی کے منہ سے نکلے تھے۔

’’یہ......یہ......تم......کیا کہہ رہی ہو؟‘‘ سردار نے بہ مشکل جملہ پورا کیا۔ اس کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔

’’ٹھیک کہہ رہی ہوں...... مجھے لاسنی نے خود ہی سب کچھ بتایا ہے۔ وہ دل کی بہت اچھی ہے...... میرا گھر تباہ کرنا نہیں چاہتی۔ اس نے تو یہ بھی کہا تھا کہ سردار کے سامنے بھلے مجھے گالیاں دے دینا......‘‘ سردار کی بیوی نے بتایا۔

’’اوہ......‘‘ سردار کے منہ سے نکلا۔ اب اس کے چہرے پر خجالت کے تاثرات تھے۔

یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنی غلطی پر نادم ہو۔

’’کیا سوچ رہے ہیں......؟‘‘ سردار کی بیوی نے پوچھا۔ ’’بلاؤں لاسنی کو......؟‘‘

’’نہیں......‘‘ سردار کا لہجہ سنجیدہ تھا۔ ’’اب اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں واقعی غلطی پر تھا۔ میں اس کا بھی احسان مند ہوں اور تمہاری وفاداری کا بھی...... بیگم......! میں قسم کھاتا ہوں کہ اب تمہیں مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔‘‘

’’سچ......؟‘‘ سردار کی بیوی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

’’بالکل سچ......‘‘ سردار دھیرے سے مسکرایا۔

اس کی بیوی فوراً ہی چھپاک سے وہاں سے چلی گئی۔ ویسے اس کے چہرے پر دنیا بھر کی رونق سمٹ آئی تھی۔

ادھر سیکریٹری کا چہرہ بھی کھلا رہا تھا۔ شاید اسے بھی سردار کی ’’توبہ‘‘ پسند آئی تھی۔

’’ہاں بھئی سکریٹری......!‘‘ سردار اب باوقار انداز میں اس کی طرف گھوما۔ ’’اب تم بتاؤ......؟ کیوں نازل ہوئے ہو......؟‘‘

’’میں...... دراصل...... اس لیے آیا ہوں۔‘‘ سکریٹری سنبھل کر بولا۔ ’’کہ...... آپ کو اور مجھے، بوقاف کی شادی خانہ بربادی میں شریک ہونا ہے۔ اب آپ صرف یہ بتا دیں کہ اس پروگرام کے لیے آپ کون سا لباس پہننا پسند کریں گے؟‘‘

☆......☆......☆

بوقاف کی تیاری (شادی کی) مکمل ہو چکی تھی۔ کپڑے، جوتے، تھوڑا بہت بناؤ سنگھار کا سامان اور یہاں تک کہ موزے اور رومال بھی موجود تھے۔ سہرا تو عین موقع پر ہی منگوایا جانا تھا۔ البتہ ایک مسئلہ بڑا گھمبیر تھا اور اس وقت اس سلسلے میں چنگا اور منگا کے درمیان گرما گرم بحث ہو رہی تھی۔

آج صبح پھر گاگے شاہ کی دکان پر مٹھائی کا ایک بہت بڑا آرڈر آ گیا تھا۔ چنانچہ اس وقت مٹھائی بھی تیار کی جا رہی تھی۔ چنگا اور منگا کے ساتھ بوقاف بھی اس وقت گاگے شاہ کا کام میں ہاتھ بٹا رہا تھا۔

’’شاہ صاحب......! آپ کو میری بات ماننی پڑے گی۔‘‘ منگا نے زور دے کر کہا۔ ’’بارات گدھے پر ہی جائے گی۔‘‘

گاگے شاہ نے اسے صرف گھورا تھا، اور دوبارہ اپنے کام میں جت گئے۔

''ابے منگے......!'' چنگا نے منہ بنایا۔ ''میری بات مان لے...... دیکھ......! ہاتھی کا بھرم ہی الگ ہوتا ہے۔ تو گدھے کے پیچھے کیوں لگ گیا ہے؟''

بوقاف کو ہنسی آ گئی۔

''مجھے کیا معلوم......؟'' منگا نے اس سے بھی زیادہ برا منہ بنایا۔ ''ابے بے وقوف! ذرا عقل استعمال کر لیا کرو کبھی...... دولہا کے لئے اس سے اچھی سواری اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ شادی کے بعد جو کچھ اسے بھگتنا ہے وہ گدھے پر سواری کرنے والا ہی برداشت کر سکتا ہے۔ سمجھے......؟''

''مجھے معلوم ہے......'' چنگا نے ہاتھ ہلایا۔ ''لیکن میرا خیال ہے کہ گدھے پر گدھا سوار ہو...... یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔''

''بس گدھوں......!'' گاگے شاہ نے انہیں گھورا۔ ''اب چپ ہو جاؤ...... ورنہ میں تم دونوں کو بھی گدھے کی سواری کروا دوں گا...... اور وہ بھی منہ کالے کروا کر......''

''منہ کالے کس کے کرائیں گے......؟'' چنگا نے حیرت سے پوچھا۔ ''گدھوں کے......!''

''نہیں...... وہ تو بہت شریف ہوتے ہیں۔'' گاگے شاہ کا لہجہ طنزیہ تھا۔ ''تم دونوں کے......''

''بات تو ایک ہی ہے۔'' بوقاف نے دخل دیا۔ ''منہ کالے ان کے ہوں یا گدھوں کے۔''

چنگا اور منگا کا منہ بن گیا۔

''اپنے منہ ٹھیک کر لو...... پہلے بھی یہ کون سے ڈھنگ کے ہیں۔'' گاگے شاہ نے انہیں ٹوکا۔ ''اور گدھے، گھوڑے اور ہاتھی کی فکر میں دبلے مت ہو۔ میرے ایک مرید نے ابھی حال ہی میں نئی برانڈ کار خریدی ہے...... وہ کس دن کام آئے گی......؟''

☆......☆......☆

تساؤ کے آدم خور

تساؤ کے آدم خور...... شکاریات کے موضوع پر ایک مستند کتاب اور حقائق پر مبنی سچا واقعہ...... یوگنڈا (کینیا) کے دو خونخوار شیر جو آدم خور بن گئے تھے...... ایک سال کی قلیل مدت میں 140 انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتارنے والے تساؤ کے آدم خور...... جنہوں نے یوگنڈا میں بچھنے والی ریلوے لائن کا کام کھٹائی میں ڈال دیا تھا۔ جو لومڑی سے زیادہ مکار تھے اور چھلاوہ کی طرح غائب ہو جاتے تھے۔ اس سچے واقعے پر انگلش فلم ''Ghost & The Darkness'' بھی بنائی گئی۔ جون ہنری پیٹرسن (فوجی اور ریلوے لائن کام کا انچارج) کی کتاب (The Man-Eaters of Tsavo) کا اُردو ترجمہ کتاب گھر پر شکاریات سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اور پھر...... وہ دن بھی آن پہنچا...... جس کا دو جوان اور دھڑکتے ہوئے دلوں کو شدت سے انتظار ہوتا ہے۔ آرزوؤں کا دن...... امنگوں کا دن اور ملن کی گھڑیوں کا وقت آ پہنچا۔

بوقاف اور مہ پارہ کے ملن کی گھڑیاں، آج...... آگ اور مٹی کا ملاپ ہونے والا تھا۔ یہ ملاپ یقیناً ایک غیر فطری ملاپ تھا۔

کیونکہ آگ اور مٹی کا کیا جوڑ......؟ لیکن یہ ہو رہا تھا۔

لاکھ منع کرنے کے باوجود بھی اس وقت ایک کمرے میں محلے کی چند الہڑ لڑکیاں ڈھول اور ڈف لئے بیٹھی تھیں۔

چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔ گانے تو کم گائے جا رہے تھے، اور بلند آوازوں میں ہنسی مذاق اور جملہ کسی زیادہ ہو رہی تھی۔ پھر گل بانو بھی اسی ماحول میں گھل مل گئیں۔ یہ دن کون سا بار بار آتا ہے...... مہ پارہ کو سر شام ہی سے دلہن کے روپ میں ڈھال دیا گیا تھا۔ وہ اس وقت عروسی لباس میں چاند کو بھی گہنائے دے رہی تھی۔

گل بانو بار بار اس کی بلائیں لے رہی تھیں۔ مہ پارہ شرما کر اپنا سر جھکا لیتی۔

چونکہ اس شادی میں برکت صاحب نے چند مخصوص لوگوں کو مدعو کیا تھا، اس لیے گھر کی چھت پر ہی شامیانہ لگا کر میزیں لگا دی گئی تھیں۔

تمام انتظامات مکمل تھے۔ بس اب بارات کا انتظار ہو رہا تھا۔ گھر کی چھت پر ہی ہلکا پھلکا سا اسٹیج بنا دیا گیا تھا۔ گل بانو، مہ پارہ کے پاس سے اٹھی ہی تھیں کہ اچانک برکت صاحب تقریباً دوڑتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔

گل بانو نے چونک کر انہیں دیکھا اور بولی۔

''خیریت تو ہے......؟ کیا کتے پیچھے لگ گئے تھے......؟''

''تم سے بھی حد ہے......'' برکت صاحب بھنا گئے۔ ''نیک بخت......! بارات آ گئی ہے...... لڑکیوں کو بتا دو...... اور ہاں بیگم......! آج تو تم بھی بہت اچھی لگ رہی ہو۔''

انہوں نے آخری جملہ بڑے میٹھے لہجے میں آہستہ سے کہا تھا۔ گل بانو شرما گئیں۔

تھوڑی دیر بعد جب لڑکیوں کو بارات کے آنے کی خبر ملی تو وہاں وہ غل غپاڑہ مچا ہے کہ...... خدا کی پناہ......''

دولہا...... یعنی بوقاف کے ہمراہ گاگے شاہ، چنگا اور منگا بھی تھے۔

گاگے شاہ کا وہ مرید جوان سب کو اپنی کار میں لایا تھا۔ دروازے سے ہی رخصت ہو گیا تھا۔

اس کی کار جہازی سائز کی تھی، اسی لیے گاگے شاہ اس میں آرام سے بیٹھ گئے تھے۔

برکت صاحب کی جانب سے مہمانوں کا بھرپور خیر مقدم کیا گیا، اور جب تک وہ لوگ اوپر پہنچ کر صوفے پر بیٹھ نہیں گئے، ان پر پھولوں کی پتیاں نچھاور ہوتی رہیں۔ یہ کام محلے کی شوخ لڑکیوں نے کیا تھا۔ بوقاف کا چہرہ سہرے میں چھپا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد دلہن بنی ہوئی مہ پارہ بھی شرماتی اور لجاتی ہوئی اپنی سہیلیوں کا سہارا لے کر بوقاف کے پہلو میں آ بیٹھی۔

چنگا اور منگا دور کھڑے ہوئے تھے۔ جب کہ صوفے پر اب بوقاف، مہ پارہ، گاگے شاہ اور برکت صاحب بالترتیب بیٹھے ہوئے تھے۔

گاگے شاہ اٹھے اور انہوں نے سہرے میں سے بوقاف کا کان ڈھونڈنے کے بعد آہستہ سے سرگوشی کی۔

''یاد ہے نا...... اپنے چہرے پر سے سہرا ہرگز نہ ہٹانا...... سمجھے......!''

''ہاں...... مجھے یاد ہے۔'' بوقاف نے سر ہلایا۔

گاگے شاہ مطمئن ہو کر دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ اتنی دیر میں گل بانو بھی وہاں آموجود ہوئیں اور برکت صاحب کے برابر میں آبیٹھیں۔

اب قاضی صاحب کا انتظار تھا۔ ادھر چنگا اور منگا آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

''اے یار منگا......! کیا بوقاف کے قبیلے والوں نے اسے بالکل ہی لاوارث چھوڑ دیا...... کوئی بھی نہیں آیا ابھی تک...... نہ سردار اور نہ اس کے ماں باپ......''

''شش...... آہستہ بولو......'' منگا نے اسے ڈانٹا۔ ''بھول گئے تم...... اس کا نام اب سلیم ہے۔ اور قبیلے کے بجائے خاندان کا لفظ استعمال کرو...... اگر کسی نے سن لیا، تو وہ سمجھے گا کہ سلیم کا تعلق افریقہ کے جنگلات سے ہے۔''

''اوہ...... ہاں۔'' چنگا سنبھل گیا۔ ''یہ بات تو میں واقعی بھول گیا تھا۔''

''خسرو چاچا کی لڑکی سوار رہتی ہے تمہارے دماغ پر...... اور کوئی بات نہیں ہے۔'' منگا نے اسے گھورا۔

''ٹھیک کہتے ہو بھائی منگے......!'' چنگا نے ایک طویل سانس لی۔ ''جلدی سے یہ قصہ ختم ہو تو میں بات آگے بڑھاؤں اور خسرو چاچا سے بات کروں۔''

''کیا تم واقعی اس بیوہ سے شادی کرو گے؟'' منگا نے سوال کیا۔

''ہاں منگے...... اس دل کو کیا معلوم کہ وہ بیوہ ہے۔'' چنگا نے سینے پر ہاتھ مارا۔

''تو بتادو نا اپنے دل کو......'' منگا نے مشورہ دیا۔

''دل ہے...... کہ مانتا نہیں۔'' چنگا گنگنا اٹھا۔ اور منگا نے کندھے اچکا دیئے۔

☆......☆......☆

گاگے شاہ، برکت صاحب اور خاص طور پر بوقاف کو اپنے ماں باپ اور جنوں کے سردار کا بے تابانہ انتظار تھا۔

بوقاف تو بار بار سہرے کی لڑیوں میں معمولی سا خلاء پیدا کر کے ادھر ادھر جھانک رہا تھا۔

اس کی اس حرکت پر گاگے شاہ نے کئی بار اسے کہنی ماری۔ اور پھر قاضی صاحب آگئے...... وہ اتنے ضعیف اور جسمانی طور پر اتنے ناتواں تھے کہ ان کے ساتھ آنے والا ایک نوعمر لڑکا ان کا بازو تھامے ہوئے تھا۔

اس لڑکے نے نکاح کا رجسٹر بھی خود ہی سنبھال رکھا تھا۔ سیڑھیاں چڑھ کر آنے کے بعد قاضی صاحب کی جو سانس اکھڑی ہے تو بڑی مشکل سے قابو میں آسکی۔

ان کی آنکھوں پر موٹے عدسوں کا چشمہ تھا، اس کے باوجود انہیں بہت کم دکھائی دے رہا تھا۔

اسی نگاہ کی کمزوری کے باعث وہ دلہن کی گود میں بیٹھتے بیٹھتے رہ گئے۔

گاگے شاہ اور برکت صاحب نے جلدی سے اٹھ کر انہیں خالی جگہ پر بٹھایا۔

''ارے بھئی...... پکڑ کر کیوں بٹھا رہے ہو......؟'' قاضی صاحب نے احتجاج کیا۔ ''میں خود بیٹھ تو رہا ہوں۔''

ادھر چنگا نے منگا کے کان میں سرگوشی کی۔

''ابے منگے......! دیکھ رہے ہو قاضی صاحب کو......؟''

''ہاں یار......'' اس نے گردن ہلائی۔

''میں یہ سوچ رہا ہوں کہ قاضی صاحب نکاح پڑھانے آئے ہیں۔ ان کی حالت ایسی ہے کہ یہ کسی وقت بھی گزر سکتے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ نکاح کے بجائے یہاں ان کا جنازہ پڑھایا جا رہا ہو؟''

''پڑھا دیں گے شاہ صاحب......'' منگا لاپروائی سے بولا۔ ''وہ فاتحہ بھی تو پڑھتے ہیں۔ جنازہ بھی پڑھانا آتا ہی ہوگا۔''

☆......☆......☆

بوقاف کے قبیلے سے ابھی تک کوئی نہیں آیا تھا۔ سردار وغیرہ آتے، تو قاضی صاحب سے نکاح پڑھوایا جاتا۔ لیکن ابھی تو دور دور تک ان کا پتہ نہیں تھا۔ اچانک مہ پارہ بڑی بے چینی سے پہلو بدلنے لگی۔ اس نے جلدی سے اشارہ کر کے گل بانو کو اپنے پاس بلایا۔

گل بانو فوراً ہی اٹھ کر اس کے قریب پہنچیں، اور جھک کر بولیں۔ ''کیا ہوا میری بچی......''

''امی...... جج...... جان...... وہ...... میری قمیض میں کچھ چل رہا ہے۔ شش...... شاید کوئی کیڑا اندر گھس گیا ہے۔'' مہ پارہ نے پریشان لہجے میں بتایا۔

''اوہ......'' گل بانو کے منہ سے نکلا۔ پھر وہ جلدی سے بولیں۔ ''چلو پھر...... جلدی سے نیچے چلو......''

دو چار لڑکیاں اور بھی، آگے بڑھ آئی تھیں۔ چنانچہ مہ پارہ کو دونوں جانب سے سنبھال کر نیچے لے جایا گیا۔ وہ بڑی عجلت میں غسل خانے میں داخل ہوئی تھی۔ اور دروازہ تیزی سے بند کیا تھا۔

گل بانو وہیں کھڑی رہیں۔ دوسری لڑکیاں بھی ان کے ساتھ ہی موجود تھیں۔

عین اسی وقت دو کیم شیم قسم کے آدمی گھر کے دروازے سے اندر داخل ہوئے۔

گل بانو وغیرہ نے چونک کر انہیں دیکھا۔ اور پھر فوراً ہی ان کے ذہن میں ایک جھماکہ سا ہوا۔

وہ ان دونوں کو پہچان گئی تھیں۔ یہ سردار اور اس کا سیکریٹری تھا۔ دونوں اس وقت انسانی روپ میں تھے۔ ان کے جسموں پر لباس بھی کافی نفیس تھے۔

دونوں نے اپنے سروں کو خم کر کے گل بانو کو سلام کیا۔ سلام کا جواب دیتے ہوئے گل بانو نے دیکھا کہ سردار کے ہاتھ میں ایک نہایت خوب صورت اور سونے کا بنا ہوا چھوٹا سا پنجرہ تھا۔ جس پر ہاتھی دانت کے کام کے علاوہ نہایت قیمتی ہیرے بھی لگے ہوئے تھے۔

وہ پنجرہ خالی بھی نہیں تھا۔ اس میں ایک نہایت خوبصورت مینا موجود تھی۔ گل بانو نے ان دونوں کو اوپر جانے کا اشارہ کیا۔ لڑکیاں حیرت سے ان دونوں کو تک رہی تھیں۔

ان کے چلے جانے کے بعد ایک لڑکی سے رہا نہ گیا۔

''یہ کون تھے خالہ جان......؟''

''بو......مم......میرا مطلب ہے کہ سلیم کے رشتے دار ہیں۔'' گل بانو نے جلدی سے اپنی زبان ''سنبھالی''

''اوہ......'' ان کے منہ سے نکلا۔

''ارے......مہ پارہ نے بڑی دیر لگا دی۔'' کسی کو خیال آیا۔ عین اسی وقت غسل خانے کا دروازہ کھلا۔

☆......☆......☆

سردار اور سیکریٹری بھی صوفے پر بیٹھ چکے تھے۔ بوقاف وغیرہ سے ان کی دعا سلام پہلے ہی ہو چکی تھی۔ خاص طور پر گاگے شاہ نے تو بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا تھا۔

بوقاف نے سردار سے اپنے ماں باپ کے بارے میں فوراً ہی سوال داغا تھا۔

''اماں جان اور ابا جان نہیں آئے......؟'' اس نے پوچھا تھا۔

''تمہارے کون سے اماں اور ابا جان وہاں رہتے ہیں؟'' سردار نے عجیب سے لہجے میں جواب دیا۔ ''وہ بوقاف کے ماں باپ ہیں، اور تمہارا نام سلیم ہے۔''

اس جملے نے بوقاف کو ساکت کر دیا تھا۔ سہرے کی وجہ سے اس کے چہرے پر دکھ اور اندرونی کرب کے آثار کوئی نہ دیکھ سکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مہ پارہ بھی اپنی جگہ پر آ بیٹھی۔ ادھر محلے کے چند ''مردوں'' کی آمد بھی ہو گئی تھی۔

ان میں رشید رکشے والا، حکیم طولانی، چچا تندروی، کلو چرسی اور ملوا استاد نمایاں تھے۔

آج پہلی بار چچا تندری، نہائے دھوئے ہوئے اور صاف ستھرے کپڑوں میں بڑے نکھرے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

اب نکاح کا مرحلہ شروع ہوا۔ فوراً ہی بوقاف اور مہ پارہ کے سامنے ایک کرسی پر قاضی صاحب کو بٹھایا گیا۔

ان کے سامنے آنے والے نوعمر لڑکے نے ہاتھ میں پکڑا ہوا رجسٹر کھول لیا تھا، اور اس کے صفحے الٹ پلٹ کر رہا تھا۔

پھر اس نے جھک کر قاضی صاحب کے کان میں کچھ کہا۔ قاضی صاحب فوراً ہی گل بانو کی طرف گھوم گئے۔

''کیوں بھئی......؟ تم نے شرعِ محمدی، مہر سکہ رائج الوقت کے سلیم احمد ولدیت اشرف الدین کو اپنے نکاح میں قبول کیا......؟'' قاضی صاحب نے جلدی جلدی ان سے پوچھا۔

گل بانو تو بوکھلا اٹھیں، وہ اور نکاح......!

''کیا کہہ رہے ہیں قاضی صاحب......! میں تو بال بچے والی ہوں......شادی تو میری بیٹی کی ہے۔'' انہوں نے بوکھلاہٹ میں کہا۔

''اچھا......تو بتاؤ تو......تم بھی بس......کہاں ہے تمہاری بیٹی۔''

انہوں نے جھنجھلا کر کہا۔ اور پھر بوقاف کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ ہے تمہاری بیٹی......؟''

''یہ تو دولہا ہے قاضی صاحب......'' ان کے ساتھ آنے والے لڑکے نے منمناتی ہوئی آواز میں کہا۔

گل بانو تیز نظروں سے قاضی صاحب کو گھور رہی تھیں۔ ''اے......تو پھر دلہن کہاں ہے؟'' قاضی صاحب چیخے۔

چنگا اور منگا کی ہنسی نکل گئی۔ لڑکیاں بھی ''کھی کھی'' کر رہی تھیں۔ کلو چرسی نے یہ منظر دیکھ کر ملوا استاد کے کان میں سرگوشی کی۔

''قاضی تو یہ لوگ بالکل اناغفیل لائے ہیں۔ ان کی مشینری تو بالکل ختم ہے۔''

''ایمرجنسی میں یہی ملے تھے۔'' ملوا استاد کا جواب تھا۔

''یہ تو خود ایمرجنسی وارڈ کے قابل ہیں۔'' کلو چرسی نے کہا۔

''شرم کرو......'' چچا تندروی نے اسے گھورا۔ ''کبھی تم بھی اسی حال کو پہنچو گے۔ وہ دن یاد کرو......!''

''واہ......کیا یاد دلایا ہے......واہ......!'' حکیم طولانی جھوم اٹھے۔ ''یار جنہیں تم بھول گئے ہو، وہ دن یاد کرو......واہ تندروی......''

ادھر بڑی مشکل سے قاضی صاحب کو بتایا اور سمجھایا گیا کہ دولہا اور دلہن کون ہیں، ورنہ دوسری مرتبہ وہ بوقاف اور برکت صاحب کا باہمی نکاح پڑھانے والے تھے۔

اور پھر نکاح کا مرحلہ طے ہوا۔ فوراً ہی چھوارے تقسیم کیے گئے۔ ''مبارک ہو، مبارک ہو'' کا شور مچ گیا۔

کلو چرسی تو باقاعدہ ٹھمکے لگا رہا تھا۔

''ابے......کیا کر رہے ہو میاں......؟'' حکیم طولانی اسے ناچتا دیکھ کر بوکھلا اٹھے۔

''اماں......کچھ نہیں کہہ رہا بے چارہ......'' چچا تندروی بول اٹھے۔ ''اپنے خاندان کا شجرہ نسب بتا رہا ہے۔ کیوں کلو......!''

یہ سن کر کلو چرسی کے ٹھمکے بند ہو گئے۔ جھینپ گیا تھا وہ......!

☆......☆......☆

سب سے پہلے سردار اور سیکریٹری نے بوقاف سے معانقہ کیا تھا۔ بڑی گرم جوشی سے مبارک باد دینے کے بعد سردار نے مینا کا بیش قیمت پنجرہ اٹھایا اور بوقاف کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ کیا ہے سردار......؟" بوقاف نے سہرے کی آڑ سے پنجرے میں موجود پھڑ پھڑاتی ہوئی مینا کو دیکھ کر کہا۔

"تمہاری شادی کا تحفہ......" سردار مسکرایا۔ "یہ مینا تمہیں اپنے سابقہ خاندان کی یاد دلاتی رہے گی۔ اسے حفاظت سے رکھنا......"

بوقاف نے خاموشی سے پنجرہ تھام لیا۔ وہ اب بھی کچھ سوچ رہا تھا۔ عین اسی وقت زینے کی طرف سے ایک گونج دار آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"مہ پارہ......! تم نے شادی کر کے اچھا نہیں کیا...... تمہیں مجھ سے شادی کرنا تھی...... تم کسی اور کی ہو گئیں...... تم نے بہت برا کیا۔ اب میں زندہ نہیں رہوں گا۔ خودکشی کر لوں گا میں...... ہاں...... میں جا رہا ہوں۔ خودکشی کرنے......"

آواز آنا بند ہو گئی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ بوقاف کے علاوہ کوئی اور اس آواز کی طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کسی اور نے اس آواز کو سنا ہی نہ ہو۔ بوقاف نے بے چین ہو کر سردار سے پوچھا۔

"یہ...... یہ کس کی آواز تھی سردار......؟ کون تھا یہ......؟"

"وہی...... جس نے مہ پارہ کو دیکھتے ہی اسے اپنی بیوی بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔" سردار نے لاپروائی سے کہا۔ "کیا بھول گئے سلیم کو تم......؟ جو مہ پارہ کے گھر میں اپنا رشتہ لے کر آیا تھا......! اسی کا نام تو تمہیں دیا گیا ہے۔"

"اوہ......!" بوقاف کے منہ سے نکلا۔ "اسے روکیے سردار......! وہ تو خودکشی کرنے جا رہا ہے۔"

"کرنے دو اسے خودکشی......" سردار کا وہی لہجہ تھا۔ "اب وہ بے چارہ زندہ رہ کر کرے گا بھی کیا......؟ اس کی زندگی تو کسی اور کے نام ہو گئی...... بلکہ اس بدنصیب کا تو نام بھی چھین لیا گیا...... خیر...... چھوڑو...... اچھا تو...... اب ہم چلتے ہیں۔ تمہیں مبارک ہو یہ شادی اور یہ گھر......"

"ابھی کہاں جا رہے ہیں سردار......؟" بوقاف نہ جانے کیوں گھبرا اٹھا۔ "بھئی آپ نہیں جائیں۔"

"کیوں بھئی......؟"

"کھانا تو کھا لیجیے......" بوقاف نے اصرار کیا۔

"اگر میں نے، اور میرے سیکریٹری نے یہاں کھانا کھا لیا، تو پبلک ڈر کے مارے بھاگ کھڑی ہو گی۔ ہم دونوں جن ہیں...... انسانی بھیس میں ہیں، تو کیا ہوا......؟ انسانوں کا کھانا تو کھا نہیں سکتے......؟"

سردار اور سیکریٹری جلد ہی رخصت ہو گئے۔ بوقاف کو اتنا موقع ہی نہ مل سکا، کہ وہ اپنے ماں باپ کے لئے کوئی پیغام بھجوا دیتا۔

وہ دل مسوس کر رہ گیا۔ لمحہ بھر کے لیے اس کے دل میں پچھتاوے کا احساس ابھرا۔ جسے اس نے پھر فوراً ہی ذہن سے جھٹک دیا تھا۔

اور پھر کھانے کا دور شروع ہوا۔ چونکہ افراد مختصر سے تھے۔ اس لیے 3 مخصوص ٹولیاں بن گئیں۔ ایک ٹولی میں دولہا یعنی بوقاف، برکت

صاحب اور گاگے شاہ ان کے مرید، حکیم طولانی، چچا تندروی وغیرہ شامل تھے۔

دوسری ٹولی میں دلہن، گل بانو اور کچھ لڑکیاں شامل تھیں۔ جب کہ تیسری ٹولی میں محلے کی بوڑھی خواتین شامل تھیں۔ گاگے شاہ نے بوقاف کے منہ میں کھانے کا پہلا لقمہ اپنے ہاتھ سے ڈالا۔ اور پھر بوقاف سہرے کے اندر سے ہی کھانا کھانے لگا۔

"سہرا تو ہٹالو شہزادے......!" حکیم طولانی نے اسے ٹوکا۔ "کھانا تو آرام سے کھالو۔"

"یہ ناممکن ہے حکیم صاحب!" بوقاف کے بجائے گاگے شاہ بول اٹھے۔

"کیوں......؟" وہ چونکے۔

"بات دراصل یہ ہے کہ یہ سلیم کے خاندان کی روایت ہے۔ یہ شادی کے ایک ہفتے تک کسی کو اپنی شکل نہیں دکھا سکتا۔"

"کیوں......؟" کلوچڑی سے رہا نہ گیا۔ "کیا شرمندگی کی وجہ سے......؟ لیکن شادی اب اتنی بری چیز بھی نہیں ہوتی۔"

"ابے...... یہ خاندانی روایت ہے احمق......!" چچا تندروی جھنجلا کر بولے۔

"مگر...... اس دولہا کے خاندان کا تو دور دور تک پتا نہیں ہے۔" کلوچڑی نے گہری نظروں سے بوقاف کو دیکھا۔ بوقاف کسمسا کر رہ گیا۔

"بھئی...... اس کا خاندان یہاں نہیں رہتا۔ بہت دور رہتے ہیں اس کے گھر والے۔" برکت صاحب نے صفائی پیش کی۔

کلوچڑی نے سر ہلا دیا۔ پھر وہ ڈش میں سے مرغی کی بوٹیاں نکال کر پلیٹ میں ڈالنے کے بعد چچا تندروی کی طرف گھوما۔

"آج تو بہت چمک رہے ہو چچا......! یقین کرو کہ لگتا ہی نہیں ہے کہ تم وہی گندے مندے اور میلے کچیلے چچا تندروی ہو...... ایمان سے......!" وہ ان کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

"مت...... بقواس...... کرو......" چچا تندروی نے منہ چلاتے ہوئے اسے گھورا۔

"کلو نے یہ بات تو بالکل ٹھیک کہی ہے تندروی......!" حکیم طولانی نے بھی کلو کی تائید کی۔ "اتنے اچھے تو تم شاید اپنی شادی پر ہی لگ رہے ہوگے۔ آج تم ایک کام کی گزرو......"

"کیا......؟" نہ جانے کیوں چچا تندروی نے کچھ شرماتے ہوئے پوچھا۔

"دیکھو! کتنا اچھا موقع ہے...... محل بھی ہے......" حکیم طولانی نے وضاحت کی۔ "تم بھی کتنے اچھے لگ رہے ہو۔ تو کیوں نا آج تم ہم سب کو اپنے ایک اہم راز سے آگاہ کردو!"

"کون سے اہم راز سے......؟" چچا تندروی چونکے۔

"یہی...... کہ تم آخر مرغوں کی جان کے کیوں دشمن ہو......؟" حکیم طولانی نے دل میں مچلتی ہوئی بات کہہ ڈالی۔

یہ بات سن کر سب ہی چونک اٹھے۔ پھر تو گویا چچا تندروی کے کان پک گئے۔ سب ہی ان سے اصرار کرنے لگے۔ یہاں تک کہ خود گاگے شاہ نے بھی ان کی ٹھوڑی پکڑ کر التجا کی تھی۔

اب تو چچا تندروی سوچنے پر مجبور ہو گئے۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد آخر کار انہوں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''اچھا...... اب...... آپ لوگوں کا اتنا اصرار ہے...... تو میں بتائے دیتا ہوں۔''

''زندہ باد...... چچا تندروی......'' کلو چرسی نے پر جوش نعرہ لگایا۔ سب ہی کے چہروں پر رونق دوڑ گئی۔ کیونکہ ایک اہم ترین انکشاف ہونے والا تھا۔

چچا تندروی آج نہ جانے کس موڈ میں تھے، کہ اپنا پہاڑ جیسا سینہ کھول رہے تھے۔

''بتاؤ...... چچا تندروی...... بتاؤ......؟'' حکیم طولانی کا اضطراب قابلِ دید تھا۔

''بات دراصل یہ ہے کہ......'' چچا تندروی کا لہجہ ٹھہرا ہوا تھا۔ پھر وہ بولتے بولتے رکے اور ایک طویل سانس لے کر پھر سے گویا ہوئے۔ ''وہ ایسی ہی رات تھی...... میرے سر پر بھی ایسے ہی سہرا بندھا ہوا تھا۔ میں بڑے ارمان لے کر اپنی دلہن (چچی) کے سجے سجائے کمرے میں داخل ہوا۔ دلہن...... سیج پر گھونگھٹ کاڑھے بیٹھی ہوئی میرا ہی انتظار کر رہی تھی، میں اس کے قریب پہنچا...... اس کے پاس بیٹھا اور آہستہ آہستہ اس کا گھونگھٹ سرکانے لگا۔ پھر دعا سلام ہوئی اور......'' چچا تندروی بولتے بولتے رک گئے۔

ان کی خاموشی نے سب کو بے چین کر دیا۔

''چپ کیوں ہو گئے تندروی...... بتاؤ...... پھر کیا ہوا......؟'' کاگے شاہ بول اٹھے۔

''آگے کی کہانی سنسر ہو گئی ہوگی۔'' کلو چرسی نے خیال ظاہر کیا۔

''تم چپ رہو......'' ملو استاد نے اسے ڈانٹا۔

''پھر......'' چچا تندروی نے دوبارہ سلسلہ جوڑا۔ ''میں اپنی دلہن سے دو چار باتیں کرنے کے بعد، اس کے اور قریب کھسک آیا۔ ابھی میں نے اپنا ہاتھ اس کے چہرے کے قریب بڑھایا ہی تھا کہ اچانک گلی میں ایک بدبخت مرغے کی آواز گونجی۔ ککڑوں کوں...... یہ آواز سن کر دلہن نے فوراً ہی مجھے پرے دھکیلا اور مسہری سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر اس نے جائے نماز نکال کر بچھائی اور نماز کی نیت باندھنے لگی۔

''یہ کیا کر رہی ہو......؟'' میں بول اٹھا۔

''نماز پڑھ رہی ہوں صبح کی......'' اس نے مجھے گھورا۔ ''دکھائی نہیں دے رہا......؟''

''ابھی صبح کہاں ہوئی ہے......؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''ابھی تو رات کا پچھلا پہر ہے۔''

''اچھا......؟'' وہ پلکیں جھپکا کر بڑبڑائی۔ ''بڑے بوڑھے تو کہتے ہیں کہ مرغا بانگ دے تو صبح کا وقت ہو جاتا ہے۔''

''یہ درمیان والی بانگ تھی......'' میں نے سمجھایا۔ ''مرغا اب جو بانگ دے گا...... وہ صبح کی بانگ ہوگی۔''

دلہن کی سمجھ میں میری بات آ گئی۔ اس نے جائے نماز اٹھالی اور دوبارہ مسہری پر آ بیٹھی۔

میں دوبارہ اس کے نزدیک ہو گیا۔ ذرا ہی دیر بعد اس بدبخت مرغے نے دوبارہ بانگ دے ڈالی۔

دلہن سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دوبارہ مسہری سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میرا دل جل کر رہ گیا۔ اسے دوبارہ سمجھا بجھا کر مسہری پر بٹھایا۔

”تم ہی تو کہہ رہے تھے کہ اب مرغا اذان دے گا، تو صبح ہو جائے گی۔“ دلہن نے پٹ سے کہا۔

”ارے بھئی...... اب وہ بانگ دے تو سمجھ لینا کہ صبح ہو گئی۔“ میں نے بات بنائی۔

اور پھر اس منحوس مرغے نے رات بھر، تھوڑے تھوڑے وقفے سے اذان دی اور پوری رات دلہن کا اور میرا یہی ڈرامہ ہوتا رہا۔ وہ جھٹ سے مسہری پر سے کود پڑتی اور میں پھر سمجھا بجھا کر اسے سیج پر لے آتا۔

یوں اس مرغے کی بانگ کی وجہ سے میری ارمانوں بھری رات کا بیڑا غرق ہو گیا۔ پھر صبح کے وقت میں نے غصے میں آ کر مرغے کو پہلے تو خوب جی بھر کے گالیاں دیں۔ اور جب اس نے پھر ”ککڑوں کوں“ کہا تو میں نے اس کی گردن ہی دبوچ لی۔ بس......! وہ دن ہے اور آج کا دن، مجھے مرغوں کی بانگ سے جو چڑ ہے، وہ سب کے سامنے ہے اور کیوں نہ ہو مجھے چڑ......؟ انہوں نے میری اہم رات غارت کروائی ہے۔“

یہ کہہ کر چچا تندری خاموش ہو گئے۔ سننے والوں پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ وہ سناٹے میں آ گئے تھے۔

تو...... یہ وجہ تھی مرغوں کی بانگ سے چڑنے کی......!

☆......☆......☆

تمام مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ حسبِ روایت مہ پارہ کو حجلہ عروسی کے کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔

بوقاف اب تنہا تھا۔ برکت صاحب بھی نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ کافی دیر تک انتظار کرنے کے بعد وہ اٹھا اور زینے طے کر کے دلہن کے کمرے کے قریب پہنچ گیا۔

اس نے ادھر ادھر دیکھا، راہداری خالی پڑی تھی، تھوڑی دیر وہاں رک کر وہ دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اچانک کسی نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

وہ جلدی سے پلٹا، سامنے برکت صاحب کھڑے ہوئے اسے گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ”کہاں چل دیئے......؟“ انہوں نے پوچھا۔

”آپ...... اپنے کمرے میں......“ بوقاف ہکلایا۔

”وہ تو تم جاؤ گے ہی......“ برکت صاحب نے سر ہلایا۔ ”لیکن اس سے پہلے مہمانوں کے جھوٹے برتن تو دھو کر رکھو...... یہ کام کون کرے گا......؟“

”مم...... میں برتن دھوؤں گا......؟“ بوقاف کی آنکھیں پھیل گئیں۔ برکت صاحب کا جملہ اس کی سماعت پر ہتھوڑے کی طرح برسا تھا۔

”تو اور کیا......!“ برکت صاحب کا تو انداز ہی بدلا ہوا تھا۔ ”اب تم گھر داماد ہو۔ اور گھر داماد کو یہی سب کرنا پڑتا ہے۔ پہلے تم اوپر جاؤ...... چھت پر ہی گرم پانی کا ٹب موجود ہے۔ سارے برتن دھو ڈالو، کیونکہ صبح ڈیکوریشن والا آ جائے گا۔ پلیٹوں کا بچا ہوا کھانا ایک تھیلی میں بھر لینا۔ اس

کام سے فارغ ہوکرتم اپنے کمرے میں جاسکتے ہو۔'' یہ کہہ کر برکت صاحب آگے بڑھ گئے۔

بوقاف کے دل پر جوگزر رہی تھی۔ وہ برکت صاحب قطعی نہیں دیکھ سکے تھے۔ بوقاف تو گویا پتھر کا ہوگیا تھا۔

☆......☆......☆

نہ جانے رات کا کون سا پہر ہوگا، جب تھکا ماندہ بوقاف دلہن کے کمرے میں داخل ہوا۔ ڈھیر سارے برتن دھونے کے بعد اب اس کی یہ حالت تھی کہ اس کی سانسیں بھی اعتدال پر نہیں تھیں۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا، بیڈ کے قریب پہنچا اور پھولوں کی لڑیاں سمیٹ کر دھپ سے بیڈ پر ڈھیر ہوگیا۔ مہ پارہ سر جھکائے اور بت بنی بیٹھی تھی۔ فوراً ہی اس نے گھونگھٹ الٹ دیا اور بوقاف کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ گویا کہ چودھویں کا چاند تھا، جو بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا تھا۔ لیکن اس چاند کے چہرے پر انتہائی خفگی کے آثار تھے۔ وہ برس پڑی۔

''کب سے آپ کا انتظار کر رہی ہوں...... کہاں تھے......؟''

''برتن دھورہا تھا......'' وہ منہ بنا کر بولا۔

''برتن......؟ کون سے برتن......؟'' مہ پارہ نے چونک کر پوچھا۔

''مہمانوں کے جھوٹے برتن...... تمہارے ابا جان نے وہ سارے برتن مجھ سے دھلوائے ہیں۔'' بوقاف نے شکایت بھرے لہجے میں بتایا۔

''اچھا......'' مہ پارہ نے اس طرح سر ہلایا، جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔

''تمہیں...... غصہ نہیں آیا......؟'' بوقاف نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے پوچھا۔

''کس بات پر......؟'' مہ پارہ کے لہجے میں بھی حیرت تھی۔ ''غصہ تو مجھے اس بات پر آتا ہے کہ برتن صفائی سے نہ دھلے ہوں۔ ابھی میں نے آپ کے دھوئے ہوئے برتن دیکھے کہاں ہیں۔''

''کک...... کیا......؟'' بوقاف دھک سے رہ گیا۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ مہ پارہ برکت صاحب پر ناراض ہوگی۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی برعکس تھا۔

''اور کیا......!'' اس نے کندھے اچکائے۔ ''اور ہاں...... برتن دھونے کے بعد آپ نے چھت کی جھاڑو بھی لگائی تھی یا نہیں......؟''

''جھاڑو......؟'' بوقاف کی حالت قابلِ دید تھی۔ ''کیا کہہ رہی ہو تم...... میں تمہارا شوہر ہوں...... باورچی یا بھنگی نہیں ہوں۔''

''کام میں کوئی شرم نہیں ہوتی......'' مہ پارہ کا جواب تھا۔ ''چلیں کوئی بات نہیں...... جھاڑو صبح لگا دیجئے گا۔''

بوقاف کی ذہنی حالت عجیب تھی۔ باپ نے باورچی خانے کا کام اس کے سر پر تھوپ دیا تھا۔ اور بیٹی اسے بھنگی بنانے پر تلی ہوئی تھی۔

بیٹی بھی وہ تھی...... کہ جس کی خاطر بوقاف نے اپنا قبیلہ، اپنا خاندان اور اپنا آپ بھی گنوا دیا تھا۔ اس نے تمام اپنوں سے منہ موڑ لیا تھا اور غیروں میں آ گیا تھا۔

یہ صلہ ملا تھا اسے اپنے انسان پسند عشق کا......

''کیا سوچ رہے ہیں......؟'' دفعتاً مہ پارہ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

’’کک...... کچھ نہیں۔‘‘ وہ جلدی سے بولا، اور مہ پارہ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

’’میں جانتی ہوں آپ کیا سوچ رہے ہیں۔‘‘ وہ دھیرے سے مسکرائی۔ ’’اب کوئی ضرورت نہیں ہے...... صبح دے دیجئے گا جھاڑو......‘‘

بوقاف سلگ کر رہ گیا۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ اپنا سر کسی دیوار سے دے مارے۔ بجائے اس کے کہ مہ پارہ اس سے ہمدردی کا اظہار کرتی۔ اپنے باپ کی ڈالی ہوئی بنیاد مضبوط کر رہی تھی۔

وہ بنیاد جس کی مضبوطی کا مطلب تھا، بوقاف کے خیالی محل کا مسمار ہونا۔

کیا کیا سوچا تھا اس نے...... اور کیا سامنے آیا تھا۔ بہر حال چونکہ اب وہ انسان تھا، اس لیے تھوڑی ہی دیر بعد وہ مہ پارہ کے حسن کے حصار میں آ جانے کے لیے بے چین ہو گیا۔

رات بھی کافی گزر چکی تھی۔ اور پھر مہ پارہ کی دلآویز شرمگیں مسکراہٹ نے اس کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کر دیا۔ وہ آگے کھسک آیا۔

’’مہ پارہ...... مہ پارہ...... تم میرا خواب تھیں...... جو آج حقیقت میں تبدیل ہو گیا ہے۔ تم میری ہو...... صرف میری...... اب تمہیں مجھ سے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔‘‘ بوقاف کا لہجہ سرشاری سے بھرپور تھا۔

اور پھر...... قبل اس کے کہ وہ مہ پارہ کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیتا، ایک عجیب بات ہوئی۔ سردار کا تحفے میں دیا ہوا مینا کا پنجرہ، اسی کمرے میں سامنے والی دیوار کے اوپر ٹانگ دیا گیا تھا۔ اچانک ہی پنجرے میں موجود مینا نے پھڑ پھڑانا شروع کر دیا۔ وہ ادھر سے ادھر ڈول رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے کوئی نادیدہ ہاتھ دبوچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اور پھر...... ایک بھاری بھرکم آواز کمرے میں گونجی۔

’’تم مہ پارہ کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے...... یہ میری محبوبہ ہے۔ سمجھے تم......؟‘‘

یہ آواز سن کر مہ پارہ کا تو جو حال ہوا ہو...... البتہ بوقاف سناٹے میں آ گیا۔ آواز بہت قریب سے آئی تھی، اور کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔

☆......☆......☆

بوقاف، خود بھی اس مرحلے سے گزر چکا تھا۔ لیکن اس طرح کہ اس نے اپنی آواز سے لوگوں کے چھکے چھڑا دیئے تھے۔

وہ جن لڑکیوں پر سوار ہوتا تھا، ان میں سے کئی لڑکیوں کے گھر والے تو اس کی آواز سن کر بے ہوش ہی ہو جاتے تھے۔ وہ لمحات بوقاف کو بعض اوقات بہت بھلے لگتے تھے۔ وہ اس پچویشن سے پورے پورے مزے لیتا تھا۔ کیونکہ وہ خود تو انسانوں کو دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ڈرے، سہمے اور خوف زدہ انسان اسے بہت پسند آتے تھے۔

لیکن آج...... اس وقت......! جب وہ خود اس صورتِ حال سے دوچار ہوا تو اسے احساس ہوا کہ خوف اور ڈر کس طرح اعصاب کو جھنجھوڑتا ہے۔

اب وہ خود ایک انسان تھا......! اس لیے اس نے جن جن لوگوں کو ڈرایا تھا، ان کے چہرے اس کی آنکھوں کے سامنے لہرانے لگے۔

’’کک...... کون...... کون ہو تم......؟‘‘ بوقاف ہکلایا۔

مہ پارہ کی آنکھیں بھی خوف اور حیرت کی بناء پر پھیل گئی تھیں، اس نے مضبوطی سے بوقاف کا بازو تھام لیا اور اس سے لپٹنے لگی۔

''تم الگ ہٹو مہ پارہ......!'' بھاری بھرکم آواز دوبارہ گونجی۔ ''تم اس کی نہیں بلکہ میری ہو۔''

''تم......آخر کون ہو......؟'' بوقاف نے دوبارہ ہمت کر کے پوچھا۔

''میں اس کی بدروح ہوں......جس نے کل تمہارے نکاح کے بعد خودکشی کر لی تھی۔'' سرسراتی ہوئی آواز میں جواب ملا۔

''اوہ......'' بوقاف کے منہ سے نکلا۔ ''تم نے واقعی خودکشی کر لی تھی؟''

''تو اور کیا کرتا......؟'' کہا گیا۔ ''میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ اور اب......تمہارے پاس بھی اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے کہ تم مہ پارہ سے الگ رہو۔''

''کیوں......؟'' بوقاف نے ہمت باندھی۔ ''میں کیوں اس سے الگ رہوں......؟ یہ میری بیوی ہے۔''

''ہو گی تمہاری بیوی......لیکن اگر تم نے اسے ہاتھ بھی لگایا تو میں اس کا گلہ گھونٹ کر اسے اپنے پاس بلا لوں گا۔ جان سے مار ڈالوں گا اسے میں......!''

اسی کے ساتھ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ اب صرف ان دونوں کی سانسوں کی آواز گونج رہی تھی۔ دونوں ہی ایک دوسرے کی شکلیں تک رہے تھے۔ مینا بھی اب اپنے پنجرے میں آرام سے بیٹھ چکی تھی۔

☆......☆......☆

وہ رات......جو امنگوں، خواہشوں کی تکمیل اور رنگِ خمار کے پیام لے کر آتی ہے۔ اس رات کے بارے میں کم از کم بوقاف دعوے سے کہہ سکتا تھا کہ۔

یہ رات سہانی رات نہیں
اے چاند ستاروں سو جاؤ

بدروح کی آواز بھی سنائی نہیں دی تھی۔ لیکن اس کے بعد بوقاف نے جب بھی مہ پارہ کے نزدیک آنے کی کوشش کی......مہ پارہ کی حالت غیر ہو گئی۔

اس کا پورا جسم لرزنے لگتا تھا، اور اس کی سانس خود بخود اکھڑنے لگتی تھی۔ بہرحال وہ رات عجیب قسم کی صورتِ حال سے دوچار رہی۔ اسی عالم میں نہ جانے کب بوقاف اور مہ پارہ کو نیند نے آ گھیرا۔

☆......☆......☆

دروازہ اتنی بری طرح پیٹا گیا تھا کہ بوقاف ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے اردگرد کا جائزہ لیا۔

دروازہ اب ''دھاڑ......دھاڑ'' کی آواز سے باقاعدہ ہلنے لگا تھا۔

مہ پارہ اب بھی بے سدھ پڑی ہوئی سو رہی تھی۔ ''کتنی پکی نیند ہے اس کی......!'' بوقاف نے سوچا اور جلدی سے اٹھ کر دروازے کی

طرف لپکا۔

دروازہ کھلتے ہی اسے اپنی ساس، یعنی گل بانو کا غصے میں بھرا ہوا چہرہ دکھائی دیا۔ ''اتنی غفلت کی نیند...... ؟ توبہ ہے......'' گل بانو نے بوقاف کو دیکھتے ہی یہ جملہ کہا۔ ''کیا رات میں گدھے گھوڑوں کی منڈی میں چلے گئے تھے......؟''

''نہیں......'' بوقاف نے نفی میں سر ہلایا۔ ''خود ہی گدھے بن گئے تھے۔''

''تم بدتمیز بھی ہو......!'' گل بانو جانے کیا سمجھیں۔ ''جاؤ...... جلدی سے ہاتھ منہ دھو کر باورچی خانے میں جاؤ، اور ناشتہ تیار کرو...... مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔ تمہارے سسر بھی بس اب اٹھنے ہی والے ہیں وہ بھی اٹھتے ہی ناشتہ مانگیں گے۔ جاؤ...... جلدی کرو۔''

بوقاف نے آنکھیں پھاڑ کر اپنی ساس کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا۔

''کیا دیکھ رہے ہو، منہ اٹھا کر......؟'' گل بانو تنک کر بولیں۔ ''نیند پوری نہیں ہوئی کیا......؟''

''میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ ابھی آپ ہی نے مجھ سے ناشتہ تیار کرنے کو کہا ہے نا......؟''

''کیوں......؟ کیا فرشتے بھی ناشتہ کرتے ہیں؟'' انہوں نے الٹا سوال کیا۔

''مم...... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' بوقاف گڑبڑا گیا۔ ''میں سمجھا تھا کہ میرے کان بجے ہیں۔''

''تمہارے کانوں میں کیا ڈھول فٹ ہیں؟'' گل بانو نے حیرت کا اظہار کیا۔

''رات کو برتن دھوئے اور پھر...... خیر......'' بوقاف نے ایک طویل سانس لی۔ ''اب مجھے ناشتہ بھی تیار کرنا پڑے گا......؟''

''تمہیں گھر کے سارے کام کرنے پڑیں گے۔'' گل بانو کا لہجہ سخت تھا۔

''مگر کیوں......؟'' بوقاف نے احتجاج بھرے انداز میں پوچھا۔

''کیونکہ تم گھر داماد ہو......'' گل بانو دھیرے سے مسکرائیں۔

''لیکن مجھے ناشتہ بنانا نہیں آتا۔''

''چلو...... میں سکھا دوں گی، اور پھر کل سے تم خود سب کے لیے ناشتہ تیار کرنا، اور ہاں......! کل سے خود ہی جاگنا، مجھے اٹھانے کی ضرورت نہ پڑے۔ ہاں......''

☆......☆......☆

ناشتے کی میز پر برکت صاحب اور مہ پارہ بڑی بے چینی سے ناشتے کے منتظر تھے۔ خدا خدا کر کے گل بانو اور بوقاف کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں ناشتے کے لوازمات موجود تھے۔

''ارے بھئی...... تم نے اتنی دیر لگا دی بیگم......!'' برکت صاحب بول اٹھے۔ ''بھوک کے مارے برا حال ہو رہا ہے۔''

''حال تو میرا بھی برا ہے۔'' بوقاف بڑبڑایا۔ ''لیکن اس کا جملہ کوئی سن نہ سکا تھا۔

”دراصل میں ناشتہ بنا بھی رہی تھی، اور سکھا بھی رہی تھی۔“ گل بانو نے مسکرا کر ناشتہ میز پر سجاتے ہوئے جواب دیا۔

”اوہ......“ مہ پارہ کے منہ سے نکلا، پھر وہ پرمسرت لہجے میں چیخی۔ ”سیکھ گئے یہ......؟“

”ہاں بھئی......“ گل بانو نے گردن ہلائی۔ ”بہت ہونہار لڑکا ہے...... ذہین بھی ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ کل مجھے بستر سے اٹھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ”بیٹھے بٹھائے ہی ناشتہ مل جائے گا۔“

یہ سن کر بوقاف نے انہیں گھور کر دیکھا۔ عین اسی وقت ایک آواز کمرے میں گونجی۔ یوں محسوس ہوا جیسے کوئی زور سے ہنسا ہو۔ صرف بوقاف ہی چونکا تھا۔ دوسروں کے کانوں پر تو جوں بھی نہیں رینگی تھی۔

اسے چونکتا دیکھ کر برکت صاحب نے پوچھ لیا۔

”تمہیں کیا ہوا......؟“

”مم...... مجھے...... ایک آواز آئی ہے...... جیسے کوئی...... ہنسا ہو۔“ بوقاف نے بتایا۔

”ابھی تمہارا حال اتنا برا تو نہیں ہوا کہ ہم میں سے کوئی تم پر ہنسے۔“ برکت صاحب نے ایک پلیٹ سنبھال لی۔

”تم اب واقعی اپنے کانوں میں سے ڈھول نکال لو۔“ گل بانو نے اسے گھورا۔ ”یہ ہر وقت بجتے رہتے ہیں۔“

”مجھے بھی کوئی آواز نہیں آئی۔“ مہ پارہ بھی اٹھلائی۔ ”آپ کو وہم ہوا ہے۔“

بوقاف بے چارگی کے عالم میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب ناشتے کا دور شروع ہوا۔

بوقاف ناشتے پر بڑھ بڑھ کر ہاتھ ضرور مار رہا تھا۔ لیکن اس کا ذہن کہیں اور تھا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ ہو سکتا ہے یہ ہنسی کی آواز اسی بدروح کی ہو، جس سے رات میں، ملاقات ہوئی تھی۔

”بہت کھاتے ہو تم......“ گل بانو نے بوقاف کی رفتار پر اسے ٹوکا۔ ”اس کا مطلب یہ ہے کہ کام بھی زیادہ کر سکتے ہو۔ ٹھیک ہے...... میں نے ایک فیصلہ اور کر لیا ہے۔“

”وہ...... وہ کیا......؟“ بوقاف نے ہاتھ روک کر پوچھا۔

”لانڈری والے کی آج سے چھٹی......“ انہوں نے جواب دیا۔ ”اب کپڑے بھی تم ہی دھویا کرو گے۔ خواہ مخواہ کپڑوں کی دھلائی میں اچھی خاصی رقم ضائع ہو رہی تھی۔“

بوقاف کے تو چھکے ہی چھوٹ گئے۔ اس کے ہاتھ میں جو نوالہ منہ کی طرف بڑھ رہا تھا، وہ ہاتھ میں ہی رہ گیا۔ البتہ منہ بدستور کھلا ہوا تھا۔

”مجھے کھاؤ گے کیا......؟“ گل بانو نے اس کا کھلا ہوا منہ دیکھ کر اسے گھورا۔

”تمہاری غلط فہمی ہے بیگم......“ برکت صاحب نے سر ہلایا۔ ”میرے خیال سے تو بوقاف اتنا بد ذوق نہیں ہو سکتا۔“

گل بانو نے انہیں گھور کر دیکھا۔ ادھر بوقاف نے ایک نئی ”ڈیوٹی“ کا سن کر التجائیہ انداز میں مہ پارہ کی طرف دیکھا۔

لیکن وہ تو سب طرف سے لاپرواہ ہو کر ناشتہ کرنے میں مصروف تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی نظر میں بوقاف کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔ بوقاف سلگ کر رہ گیا۔

☆......☆......☆

اور پھر بات صرف ناشتہ بنانے پر ہی نہیں ٹلی تھی، بوقاف کو ناشتے کے برتن بھی دھونے پڑے تھے۔ مہ پارہ نے تو ناشتہ کر کے فوراً ہی ہاتھ جھاڑے۔ منہ پھاڑ کر ایک طویل انگڑائی لی اور اٹھ کر ادائے بے نیازی سے اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

کمرے سے نکلتے وقت ایک ہلکی سی مگر دلکش ترین مسکراہٹ اس نے بوقاف کی طرف اچھالی۔ لمحہ بھر کے لئے بوقاف ''ریشہ خطمی'' ہو کر رہ گیا تھا۔

لیکن پھر جلد ہی اس کے لطیف قسم کے جذبات پر گل بانو نے برتنوں کا پانی ڈال کر ان جذبوں کو ٹھنڈا کر دیا۔

کیونکہ اسے ناشتہ کرنے کے بعد اپنے کمرے کے بجائے دوبارہ باورچی خانے کا رخ کرنا پڑا تھا۔

جب تک وہ وہاں سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں پہنچا، مہ پارہ بے سدھ پڑی ہوئی نظر آئی۔ کمرے میں اس کے دھیمے سے خراٹے گونج رہے تھے۔

بوقاف آہستہ آہستہ چلتا ہوا مہ پارہ کے نزدیک پہنچا، اس کی نظریں مہ پارہ کے سراپے میں گم ہو کر رہ گئیں۔ سوئی ہوئی مہ پارہ کا حسن اس وقت اور بھی زیادہ نکھرا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

بوقاف کی سانسیں اتھل پتھل ہونے لگیں۔ وہ آگے بڑھا اور جیسے ہی اس نے جھک کر مہ پارہ کے ہونٹوں کو چھونا چاہا، وہی بھاری بھرکم آواز اس کے کانوں میں زہر گھول گئی۔

''نہ......نہ......کوئی بدتمیزی نہیں۔'' بدروح کی آواز گونجی تھی۔ ''میں دن میں بھی ادھر ہی موجود ہوں۔ ہاں......!''

☆......☆......☆

کئی گھنٹے تک بوقاف شدید قسم کے شش و پنج میں مبتلا رہا تھا۔ بالآخر شام کے وقت اس نے بدروح اور اس کی کارستانی کسی حد تک جھجکتے ہوئے برکت صاحب کے گوش گزار کر دی۔ وہ اپنے کمرے میں موجود تھے، اور کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ گل بانو یہاں موجود نہیں تھیں۔

بوقاف کی بات سن کر برکت صاحب کے دانت نکل پڑے۔ بوقاف نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ وہ تو سمجھا تھا کہ بدروح کے بارے میں معلوم ہوتے ہی برکت صاحب کی ہوائیاں اڑ جائیں، ان کے اوسان خطا ہو جائیں گے۔ لیکن صورتِ حال بوقاف کی سوچ کے عین برعکس نکلی۔

''آپ......آپ کو حیرت نہیں ہوئی؟'' اس سے رہا نہ گیا۔

''ہی......ہی......ہی......'' برکت صاحب رک رک کر ہنسے۔ ''مجھے تو یہ سوچ کر ہنسی آ رہی ہے کہ جیسے کو تیسا خوب ملا، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ سیر کو سوا سیر ٹکرایا ہے۔ تم نے بھی تو ہماری زندگیاں حرام کر دی تھیں۔ یاد ہے نا......!''

”ہاں...... اچھی طرح یاد ہے۔“ بوقاف نے اقرار کیا۔ ”اور آپ کو بھی بڈھا، بڈھا کہہ کر خوب تنگ کیا تھا۔“

”وہ تو بھول جاؤ......“ برکت صاحب نے فوراً کہا۔ میری طرف سے پوری اجازت ہے۔ بھلا یہ باتیں بھی کوئی یاد رکھنے والی ہوتی ہیں......؟“

”لیکن میں اس بدروح کا کیا کروں......؟ اس نے تو میری زندگی اجیرن کر دی ہے۔“

”میں کیا بتاؤں......؟“ برکت صاحب نے کندھے اچکائے۔ ”سلیم کی بدروح سے تم خود نمٹو...... مجھے تو ویسے بھی بدروحوں کا کوئی خاص تجربہ نہیں ہے۔“

”کیا واقعی اس آدمی نے خودکشی کر لی تھی......؟“ بوقاف نے سوال کیا۔

”کر لی ہوگی بھئی...... کیونکہ محبت کر کے عقل پر پتھر پڑ جاتے ہیں، اور شادی کر کے مقدر پر...... آئی سمجھ......؟“

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ گل بانو کمرے میں داخل ہوئی۔

”ارے...... تم یہاں ہو بوقاف...... میں تمہیں سارے جہان میں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔“

”کیوں......؟“ بوقاف نے ہونقوں کی طرح پوچھا۔

”اے...... لو......“ وہ مسکرائیں۔ ”میں نے صحن میں میلے کپڑوں کا ایک ڈھیر لگا دیا ہے، اور تم ڈھونڈنے کی وجہ پوچھ رہے ہو......!“

☆......☆......☆

اور پھر...... اسی کام کی کسر تھی، اور یہ بھی اسے کرنا پڑا۔ یہ سب تو اس کے ساتھ ہو ہی رہا تھا، لیکن اسے سب سے زیادہ دکھ اور افسوس اس بات کا تھا کہ بوقاف کے اوپر جو ظلم و ستم ہو رہا تھا، مہ پارہ اس کے متعلق قطعی خاموش تھی۔

بلکہ بوقاف نے کئی دفعہ محسوس کیا تھا کہ بوقاف کے ساتھ مہ پارہ کے گھر والوں کا جو غلاموں جیسا برتاؤ تھا، خود مہ پارہ اس سے خوش اور مطمئن دکھائی دیتی تھی۔

”کیا اسے ایسا ہی شوہر درکار تھا......!“

کپڑے دھوتے وقت نہ جانے کیوں اسے اپنے ماں باپ کی بہت یاد آئی۔ خاص طور پر ماں کی......!

کتنی اچھی تھی وہ...... بوقاف کے ذہن میں ماضی کے کئی ایسے منظر گھومنے لگے، جب کسی بات پر اس کا باپ روناف اسے مارنے کے لیے دوڑتا تھا تو اس کی ماں جلدی سے آگے بڑھ کر اپنے بیٹے بوقاف کی حمایت لیتی تھی، ہر وقت وہ بوقاف کی دل جوئی کرتی رہتی۔ اس کی بے جا ضدیں پوری کرتی اور ہر طرح سے اس کا خیال رکھتی تھی۔

یوں تو باپ کی شخصیت بھی کم نہ تھی، اس کی ڈانٹ اور مار بھی پیار اور محبت کا عنصر شامل تھا۔

اور بوقاف نے ایک انسانی پیکر حسن کی خاطر...... اپنے ماں باپ کو خیرباد کہہ دیا تھا، ان سے رشتہ، ناطہ، سب ہی کچھ ختم ہو گیا تھا۔ صرف

ایک لڑکی کی خاطر......!

بوقاف کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ نہ جانے اس نمی کی وجہ ماں باپ کی یاد تھی۔ یا پھر اس کی من پسند محبوبہ کے رویے کی بدولت اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

☆......☆......☆

بوقاف کے لئے اب یہ روز کے معمولات تھے۔ دن بھر وہ گھر کے بڑے سے بڑے اور معمولی سے معمولی کاموں میں مصروف رہتا اور رات کو جب وہ مہ پارہ کی زلفوں سے کھیلنے کی کوشش کرتا تو وہ منحوس بدروح اس کے آڑے آ جاتی۔ مرتا...... کیا نہ کرتا۔ آخر کار آہستہ آہستہ بوقاف کی اس بدروح سے اچھی خاصی بے تکلفی ہوگئی۔

ایک رات کو بدروح نے کافی محتاط انداز میں بوقاف سے پوچھا۔ ''کہیں تم مجھ سے اس لیے تو دوستی نہیں گانٹھ رہے کہ میرے دل میں تمہارے لئے ہمدردی پیدا ہو جائے اور تم مہ پارہ سے رشتہ استوار کرلو......؟''

''نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' بوقاف نے جواب دیا۔ ''مجھے اب اپنے چاہنے والے سے کوئی امید نہیں رہی تو میں ایک بدروح سے کیا امید کروں گا۔''

مہ پارہ بھی اس وقت وہاں موجود تھی۔ بوقاف کے اس جملے نے اسے چونکا دیا۔

''یہ بات آپ نے میرے لیے کی ہے......؟'' اس نے بوقاف کو گھورا۔

''اور کون ہے یہاں میرا چاہنے والا......'' بوقاف کی مسکراہٹ پھیکی تھی۔

''مجھے آپ سے ہمدردی کیوں نہیں ہوگی......؟ میں نے آپ سے پسند کی شادی کی ہے...... ہاں...... اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں گھر کے کام کاج میں آپ کا ہاتھ بٹاؤں، تو یہ نہیں ہوسکتا، کیونکہ مجھے اس قسم کے کاموں کی بالکل عادت نہیں ہے۔'' مہ پارہ نے صاف گوئی سے کام لیا۔

''اچھا بھئی...... میں تو چلتا ہوں۔'' بدروح کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

بوقاف نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔ وہ تو اس وقت مہ پارہ کی طرف متوجہ تھا۔

''تو تمہیں میرا غلاموں کی طرح گھر کے کام کاج کرنا اچھا لگتا ہے......؟'' بوقاف نے اسے بغور دیکھا۔

''مم...... مجھے......؟'' مہ پارہ ہکلا کر رہ گئی۔

''ہاں تمہیں......'' بوقاف نے زور دے کر کہا۔ ''میں تمہارا شوہر ہوں یا اس گھر کا ملازم ہوں......؟''

''آپ اس گھر کے ملازم ہرگز نہیں ہیں بلکہ میرے شوہر ہیں۔'' مہ پارہ جلدی سے بولی۔

''تم مجھے کام میں جتا ہوا دیکھ کر خوش تو بہت ہوتی ہو۔'' بوقاف کا لہجہ تیکھا تھا۔

''تو کیا کروں......؟'' وہ تنک کر بولی۔ ''جس بات سے میرے ماں باپ خوش ہیں، اسی میں میری خوشی ہے۔''

”اچھا......؟“ بوقاف نے آنکھیں پھاڑیں۔ ”اور میں نے جو تمہاری محبت کی خاطر اپنے ماں باپ کو ناراض کیا، اگر تم بھی میری خاطر اپنے ماں باپ کی ناراضی مول لے لو، تو حرج ہی کیا ہے......؟“

”میں کیوں اپنے ماں باپ کو ناراض کروں......؟“ مہ پارہ کی آواز بلند ہوگئی۔

”میں نے بھی تو ایسا کیا ہے......صرف تمہاری خاطر......میں کیا تھا، اور کیا ہو چکا ہوں۔ صرف تمہاری وجہ سے مہ پارہ صرف تمہاری وجہ سے۔“ بوقاف کا لہجہ جذباتی ہوگیا۔

”وہ آپ کا مسئلہ ہے بھئی......“ مہ پارہ نے کندھے اچکائے۔ ”میں تو ہرگز اپنے ماں اور باپ کو ناراض نہیں کر سکتی۔“

بوقاف دھک سے رہ گیا۔ ”یہ......یہ تم کیا کہہ رہی ہو......؟“ وہ حیرت کے عالم میں مہ پارہ کی شکل تکنے لگا۔

”ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں۔ میں اپنے ماں باپ کی نافرمانی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔“

”اوہ......اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں نے بھی اپنے والدین کی ناراضگی مول لے کر بہت برا کیا ہے۔“ بوقاف کا لہجہ سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

”لیکن مجھے اس سے زیادہ افسوس ایک اور بات کا ہے۔“

”کس بات کا......؟“ مہ پارہ چونکی۔

”اس بات کا کہ تم میری ہوتے ہوئے بھی میری نہ ہوسکیں۔“

”وہ تو اس بدروح کی......“

”بھاڑ میں گئی بدروح......“ بوقاف نے اس کی بات کاٹی۔ ”صرف جسمانی تعلق سے کوئی اپنا نہیں ہو جاتا۔ یہ جذبہ تو دل سے منسلک ہوتا ہے۔ اس کی جڑیں تو روح کی گہرائیوں میں پنہاں ہوتی ہیں۔ لیکن خیر......تم کیا جانو ان سب باتوں کو......یہ تو دیوانوں کی باتیں ہیں، اور تم ٹھہریں ہوش مند......جاؤ......تم آرام سے سو جاؤ۔“

یہ کہہ کر بوقاف اٹھا اور مینا، کے پنجرے کے قریب آ کھڑا ہوا۔ مینا اپنے پنجرے میں بیٹھی ہوئی اونگھ رہی تھی۔

☆......☆......☆

وہ رات......بوقاف پر بہت بھاری تھی۔ تمام پہر اس نے آنکھوں میں کاٹ کر اور بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے گزارے۔ مہ پارہ تو آرام سے سوتی رہی تھی۔ لیکن بوقاف کا بے چینی کے مارے برا حال تھا۔

اسے اپنے ماں باپ، قبیلہ، سردار، مالوط سبھی یاد آ رہے تھے۔ اور پھر اچانک اس کے ذہن میں ایک جھماکہ ہوا۔ گل چیں......ہاں......گل چیں بھی تو تھی۔

وہی گل چیں، جو دل و جان سے اسے چاہتی تھی۔ اس سے بوقاف کی جب آخری بار ملاقات ہوئی تھی، تو اس کے الفاظ تھے۔

”میں تمہارا انتظار کروں گی۔ اگر کبھی......کسی بھی دن، تمہیں میرا احساس ہو جائے تو مجھ تک پہنچنے میں دیر مت لگانا......میں تمہاری منتظر

رہوں گی...... جب تک زندہ ہوں۔"

گل چیں کے الفاظ بوقاف کے ذہن میں گونجنے لگے بار بار اس کی صدا بوقاف کے کانوں میں گونج کر اسے بے چین کرنے لگی۔ "میں تمہاری منتظر رہوں گی، جب تک زندہ ہوں۔"

اچانک بوقاف ایک جھٹکے سے بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ایک نظر سوئی ہوئی مہ پارہ پر ڈالی اور فیصلہ کن انداز میں سر ہلا کر دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

وہ اپنے دل میں آنے والے خیال کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

☆......☆......☆

چاروں طرف بے کراں سناٹا، اور ہو کا عالم طاری تھا۔ آسمان پر بھی بادل چھائے ہوئے تھے، جس کی وجہ سے رات اور بھی تاریک دکھائی دے رہی تھی۔

یہ وہی جگہ تھی، جہاں جنوں کا قبیلہ آباد تھا۔ قصبہ نورس سے ذرا فاصلے پر پہاڑیوں میں گھرا ہوا بظاہر بے آباد میدان......

بوقاف لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔ لیکن اس کے لئے بھی یہاں اب کیا تھا۔

وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن ہر سمت ویران اور خالی میدان کے اسے کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ اب اس کے لیے یہاں تھا بھی کیا......؟

انسانی وجود میں ڈھل جانے کے بعد اس کا اپنا قبیلہ، خود اس کی آنکھوں سے اوجھل تھا۔ "اماں......! اماں......ابا......" وہ دیوانوں کی طرح چلایا۔ "میں آ گیا ہوں، ماں...... میں آ گیا ہوں۔"

وہ چیختا رہا، چلاتا رہا۔

"آپ لوگ مجھے معاف کر دو...... مجھے معاف کر دو...... میں بھٹک گیا تھا۔ میں...... میں بھٹک گیا تھا۔ میری......! تم کہاں ہو......؟ مجھے اپنے سینے سے لگا لو...... مجھے معاف کر دو...... میں اب کبھی بھی انسانوں کی طرف نہیں جاؤں گا...... کبھی نہیں جاؤں گا۔"

بولتے بولتے وہ رو پڑا...... اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اعصاب شل ہو رہے تھے اور آنسو تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ ان آنسوؤں میں سب ہی کچھ تو بہہ رہا تھا۔ اس کی ضد، اس کا غرور، اس کی سوچ اور ایک جذباتی محبت کا فسانہ...... سب کچھ ان آنسوؤں میں بہہ گیا تھا۔

روتے روتے وہ دوزانو ہو کر وہیں گر پڑا۔ اس کے کانپتے ہوئے دونوں ہاتھ، چہرے کے گرد پھیلے ہوئے تھے اور جسم لرز رہا تھا۔

وہ نہ جانے کتنی دیر تک اپنی آنکھوں کا سمندر خالی کرتا رہا۔ ہر جانب سکوت تھا۔ خاموشی تھی۔ بیکراں اداسی تھی اور بوقاف تھا۔

ایسا لگ رہا تھا کہ آنکھوں سے اوجھل ہو جانے والے لوگوں سے وہ خود بھی اوجھل ہو چکا ہے۔ کوئی اسے نہیں دیکھ رہا۔ کوئی اس کے آنسو پونچھنے والا نہیں ہے، کوئی بھی اسے معاف کر کے سینے سے لگانے والا نہیں ہے، نہ اس کی ماں، نہ باپ، نہ سردار، نہ مالوط اور نہ ہی گل چیں۔

سب ہی نے شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس سے منہ پھیر لیا تھا۔ اس کا دل اب کافی حد تک سنبھل چکا تھا، کیونکہ آنسو تھم چکے تھے۔ وہ بوجھل انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں...... میں اب اس گھر میں تو واپس نہیں جاؤں گا'' وہ آپ ہی آپ بڑبڑایا۔ ''البتہ کہیں دور چلا جاؤں گا۔ دور بہت دور اور سب سے دور...... میں اس قابل ہی نہیں ہوں کہ کہیں رہ سکوں...... نہ میں انسانوں کے قابل ہوں اور نہ اپنوں کے میں کہیں دور چلا جاؤں گا۔''

کہتے کہتے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے بڑی حسرت و یاس سے ایک الوداعی نظر اس جگہ ڈالی، جہاں اس کے قبیلے کے خیمے لگے ہوئے تھے اور واپس پلٹ پڑا۔

کسی تھکے ماندے مسافر کی طرح اس کے قدم زمین پر پڑ رہے تھے۔ وہ آگے بڑھتا رہا اور اپنے قبیلے سے دور ہوتا رہا۔

آگے...... اور آگے...... اور آگے۔ وہ چلتا رہا، چلتا رہا، قدم من من بھر کے ہو رہے تھے لیکن وہ رکنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اچانک اسے رکنا پڑا کیوں کہ کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

وہ چونک کر مڑا اور حیرت کے مارے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''سردار...... آپ......'' اس کے منہ سے نکلا۔

''ہاں...... یہ ہم ہی تو ہیں۔'' سردار کا انداز خاصا باوقار تھا۔ ''اپنے قبیلے کی حفاظت کے لئے ہمیں اکثر رات میں بھی جاگنا پڑتا ہے۔ رب العزت نے یہ رتبہ دیا ہے۔ تو یہ ہمارا فرض ہے...... چھوڑو...... یہ بتاؤ کہ تم یہاں اس وقت کیا کر رہے ہو؟ یہ جنوں کا علاقہ ہے...... تمہیں یہاں کوئی نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔''

یہ الفاظ کسی زہر آلود تیر کی مانند بوقاف کے دل میں اتر گئے۔ ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بوچھاڑ ہوگئی۔

''ارے...... ارے...... سلیم میاں......! کیا ہوا......؟ رو کیوں رہے ہو؟'' سردار نے حیرت کا اظہار کیا۔

''مجھے معاف کر دو سردار...... مجھے معاف کر دو۔ مجھے اپنے ماں باپ سے ملا دو سردار...... پھر سے بوقاف بنا دو مجھے......'' وہ بلک کر رو رہا تھا۔

''ہم تمہیں معاف کرنے والے کون ہوتے ہیں......؟ ہماری کیا اوقات کہ ہم تمہیں معاف کر دیں!''

''پھر...... پھر...... میں کس سے معافی مانگوں؟'' بوقاف چونکا۔

''اس ساری کائنات کے رب سے...... اصل مجرم تو تم اس کے ہو...... اس مالک نے اپنی بنائی ہوئی ہر مخلوق کا جوڑا، اسی مخلوق میں رکھا ہے۔ یہ اس کا قانون قدرت ہے اور تم نے اس کے بنائے ہوئے قانون کو توڑنے کی کوشش کی ہے۔ تم نے جن ہوتے ہوئے ایک آدم زادی سے ملاپ کا خواب دیکھا اور اس خواب کو پورا کرنے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ پھر اس کے بعد تم معافی مانگو اپنے ماں اور باپ سے...... کیوں کہ تم ان دونوں کے بھی نافرمان ہو۔'' سردار بولتا چلا گیا۔

''میں...... میں یہ سب کچھ کر لوں گا سردار...... بس...... آپ مجھے دوبارہ سے آتش زادہ بنا دیجیے۔ بنا دیجئے سردار...... میں بہت تھک گیا ہوں۔'' بوقاف نے سسکاری لی۔

''گھر کے کام کر کر کے......؟'' سردار نے پوچھا۔

بوقاف چونک کر اس کی شکل دیکھنے لگا۔ پھر نفی میں سر ہلا کر بولا۔ ''نہیں سردار...... مجھے تو عشق کی خاطر وہ سب بھی منظور تھا لیکن جب مجھے احساس ہوا کہ میں نے اپنے ماں باپ کے ساتھ غلط کیا ہے، تو میرا ضمیر جو کہ سو رہا تھا۔ مجھ سے لڑنے لگا، اور میں اس سے مقابلہ کرتے کرتے تھک گیا ہوں۔'' بوقاف کے انداز میں بے چارگی تھی۔

''اس لڑائی میں کون جیتا......؟'' سردار کا سوال تھا۔

''میرا ضمیر......'' بوقاف نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''کیونکہ میں سراسر غلط تھا۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نے اپنی غلطی اور اپنا جرم تسلیم کر لیا ہے......؟'' سردار نے غور سے اسے دیکھا۔

''جی سردار......!'' بوقاف نے سر جھکا کر جواب دیا۔ سردار کے ہونٹوں پر لمحہ بھر کے لیے ایک شوخ سی مسکراہٹ پھیلی اور فوراً ہی معدوم ہو گئی۔

چاند بھی بادلوں سے نکل چکا تھا۔ سوگواری چاندنی نے ہر سو پھیل کر ایک عجیب سی اداسی بکھیر دی تھی۔ ''لیکن اس لڑکی کا کیا ہو گا......؟ جس سے تم نے شادی کی ہے؟ اس کی تو زندگی برباد ہو جائے گی۔''

''وہ اب تک مجھ سے بہت دور ہے سردار......'' بوقاف کے منہ سے نکلا۔ اب اس کے آنسو خشک ہو چکے تھے۔ ''میں نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ آپ تو جنوں کے سردار ہیں کوئی چکر چلا کر اس کی کہیں شادی کروا دیجیے گا۔''

''تو تم اب انسانوں کی بستی کا رخ نہیں کرو گے......؟'' سردار نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''زندگی میں کبھی نہیں سردار...... یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔'' بوقاف نے سچے دل سے کہا۔

سردار نے چند لمحے غور کیا اور پھر مطمئن انداز میں سر ہلا دیا۔ سردار کو بوقاف امید بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

☆......☆......☆

گل بانو نے صبح ہی صبح مہ پارہ کے کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا، تو وہ خود بہ خود کھلتا چلا گیا۔ گل بانو نے چند لمحے توقف کیا اور پھر صدا لگائی۔

''مہ پارہ...... بیٹی مہ پارہ......؟''

لیکن جواب ندارد، اندر خاموشی چھائی رہی۔ کچھ سوچ کر وہ کمرے میں داخل ہو گئیں۔

لیکن کمرہ تو خالی تھا۔ نہ بوقاف تھا اور نہ مہ پارہ۔ البتہ مینا بدستور اپنے پنجرے میں موجود تھی۔

''کہاں گئے یہ دونوں......؟'' گل بانو نے بے خیالی میں مینا سے پوچھ لیا۔

''مجھے کیا معلوم......؟'' مینا نے جواب بھی دے دیا۔

''اچھا......'' گل بانو نے سر ہلایا اور پھر چونک کر مینا کو گھورنے لگیں۔ ان کی آنکھوں میں حیرت تو نہیں تھی۔ البتہ الجھن ضرور موجود تھی۔

پھر وہ کچھ بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے نکل آئیں۔ اب ان کا رخ اس کمرے کی طرف تھا، جہاں برکت صاحب موجود تھے۔ وہ اس وقت چائے پیتے ہوئے تازہ اخبار کھا رہے تھے...... مم...... مطلب یہ کہ پڑھ رہے تھے۔

گل بانو کو دیکھ کر انہوں نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ ''کیا ہوا......؟''

''وہی...... جس کے متعلق ہمیں بتایا گیا تھا۔ دونوں ہی کمرے سے غائب ہیں۔'' گل بانو نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ ان کا چہرہ خوشی کے مارے دمک رہا تھا۔

''اوہ...... بہت اچھے......'' برکت صاحب کے بھی دانت نکل پڑے۔ ''میں ابھی گاگے شاہ صاحب کے پاس جاتا ہوں...... شکر ہے...... جان تو چھوٹی......''

''واقعی......'' گل بانو بھی مسکرائیں۔ ''شادی کے بعد سے اب تک میں نے بڑی مشکل سے کلثوم وغیرہ کو گھر کے اندر آنے سے روکا تھا۔ بڑے حیلے بہانے کرنے پڑے تھے۔ پاپڑ بیلنے پڑے تھے۔ تب کہیں جا کر وہ باز آئی تھیں، ورنہ وہ لوگ اور مہ پارہ سے نہ ملیں......! ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔''

''تم نے ان سب سے کہا کیا تھا......؟'' برکت صاحب نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

''میں نے تو بس یہی کہا تھا کہ دولہا کے گھر کی روایت ہے کہ شادی کے دو ہفتے بعد تک وہ اپنی دلہن سمیت باہر کے کسی بھی فرد سے نہیں ملتا۔'' گل بانو نے بتایا۔ ''دراصل میں نے سوچا کہ جب تک تو یہ مسئلہ حل ہو ہی جائے گا۔''

یہ سن کر برکت صاحب کسی طرح بھی اپنے حلق سے برآمد ہونے والا قہقہہ نہ روک سکے۔ ''تم بھی خوب ہو بیگم......'' وہ ہنستے ہوئے بولے۔ ''جواب نہیں ہے تمہارا......''

''تو پھر اور کیا کرتی...... ارے بھئی...... لوگوں نے شادیوں میں عجیب عجیب قسم کی رسمیں نکال لی ہیں، میں نے بھی ایک رسم ٹھونک دی۔'' گل بانو بولیں۔

''اچھا کیا......'' برکت صاحب نے سر ہلایا۔ وہ اب تک اس بات سے محظوظ ہو رہے تھے۔

''اب آپ جلدی سے گاگے شاہ صاحب کے پاس جائیے...... تا کہ سردار کو بلوایا جا سکے۔ مہ پارہ میری بچی...... بے چاری کتنے دنوں سے مینا کے روپ میں اس گھر میں رہ رہی ہے۔ اف...... میری پھول سی بچی۔''

☆......☆......☆

گاگے شاہ، اپنے مریدوں کو ساتھ نہیں لائے تھے۔ ایمرجنسی میں برکت صاحب نے ان کی سواری کے لیے کھلی ہوئی سوزوکی کا انتظام کر دیا تھا۔

گھر پہنچ کر انہوں نے بڑی عجلت میں مہ پارہ کے کمرے سے مینا کا پنجرہ اٹھایا، اور برکت صاحب کے ساتھ صحن میں چلے آئے۔ گل بانو بھی دوپٹے کی آڑ لے کر وہیں پہنچ گئی تھیں، اور پھر گاگے شاہ نے جنوں کے سردار کو بلانے کا عمل کر ڈالا۔

ابھی لکڑیاں سلگی ہی تھیں کہ بادلوں کی سی گھن گرج سے صحن گونج اٹھا۔ فوراً ہی سردار نمودار ہوگیا۔ آج وہ خود بھی تنہا تھا۔ سیکریٹری اس کے ساتھ نہیں تھا۔ سردار نے والہانہ انداز میں دونوں سے ہاتھ ملائے اور پھر گل بانو کو بھی سلام کیا۔

جس کا جواب بڑی خوشی دلی سے دیا گیا۔ اب سردار گاگے شاہ کی طرف گھوما۔ ''میں خود آپ کے بلاوے کا منتظر تھا۔ کیوں کہ بوقاف اور گل چیں رات کو ہی قبیلے میں واپس پہنچ چکے ہیں۔''

''یہ تو بڑی اچھی بات ہے...... کیونکہ ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔'' گاگے شاہ نے سر ہلایا۔

''اور وہ...... بدروح......؟'' برکت صاحب نے سردار سے پوچھا۔

''اوہ...... آپ مالوط کی بات کر رہے ہیں؟'' سردار بھرپور انداز میں مسکرایا۔ ''وہ تو پہلے ہی یہاں سے کھسک لیا تھا...... کیونکہ اس نے ان دونوں کے درمیان جھگڑا شروع ہوتے دیکھ لیا تھا۔ اسے معلوم تو تھا ہی کہ اب کیا ہوگا۔''

''ویسے یہ بھی خوب ہوا......'' برکت صاحب نے سر ہلایا۔ ''سلیم کا خودکشی والا ڈرامہ بھی لاجواب تھا۔''

''وہ تو اسی شریر مالوط کے ذہن کی پیداوار تھا۔'' سردار نے بتایا۔ ''اس نے اس کے لیے خود ہی پورا سیٹ اپ بنایا تھا۔ وہ ایک بابا کا روپ دھار کر سلیم سے ملا تھا۔''

''اوہ......'' برکت صاحب کے منہ سے نکلا۔

''زندہ دل ہے۔'' سردار نے سر ہلایا۔

ادھر یہ باتیں ہو رہی تھیں، اور ادھر گل بانو بے چینی سے پنجرے میں بند مینا کو دیکھے جا رہی تھیں۔

''اب کیا حال ہے بوقاف کا......؟'' گاگے شاہ نے سردار سے پوچھا۔ ''اس کے ماں باپ نے اسے قبول کر لیا......؟''

''ماں باپ تو ماں باپ ہی ہوتے ہیں۔ اپنی اولاد کو کب خود سے جدا رکھ سکتے ہیں۔'' سردار نے کہا۔ ''جب بوقاف نے خود ہی اپنے جرائم کا اعتراف کر لیا، تو پھر باقی کیا رہا۔''

''اور گل چیں کا کیا ردِعمل تھا......؟'' گاگے شاہ نے پھر پوچھا۔

''وہ تو بوقاف کے اعترافِ جرم سے خوشی کے مارے پاگل ہوئی جا رہی ہے۔ وہ بوقاف سے انتہائی محبت کرتی ہے۔ جب وہ یہاں پر مہ پارہ کے روپ میں تھی، تو اس نے بوقاف کو ذہنی طور پر خوب پٹخنیاں دیں...... اس بے چاری نے بڑی کوشش کی کہ بوقاف جلد سے جلد راہِ راست پر آ جائے۔'' سردار نے مسکراتے ہوئے تفصیل بتائی۔

''ایک بات اور بتاؤ سردار......!'' برکت صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... پوچھئے......؟'' وہ خندہ پیشانی سے بولا۔

''اس بدروح والے ڈرامے کی کیا ضرورت تھی......؟'' ان کا سوال تھا۔

سردار نے فوری طور پر جواب نہیں دیا تھا۔ چند لمحے تو وہ مسکراتا رہا، پھر بولا۔

''بات یہ ہے کہ ہم لوگوں کے یہاں شادی کا دوسرا طریقہ رائج ہے' اور اسی طریقے سے شادی کو جائز مانا جاتا ہے۔ بوقاف کی شادی گل چیں سے ہی ہونا تھی، اور مہ پارہ کے روپ میں بھی گل چیں ہی تھی لیکن یہ شادی آپ لوگوں کے طریقے سے ہوئی تھی۔ تو پھر ہم لوگ ان دونوں کا ملاپ کیسے ہونے دیتے۔ چنانچہ بوقاف کو گل چیں سے دور رکھنے کے لیے یہ ڈرامہ کرنا پڑا' اور مالوطہ نے بھی اپنے کردار کو خوب نبھایا۔'' سردار نے بتایا۔

''کردار تو آپ کی گل چیں نے بھی خوب نبھایا تھا۔ ہمیں تو احساس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ یہ مہ پارہ نہیں بلکہ کوئی اور ہے حالانکہ ہمیں یہ بات پہلے سے معلوم تھی۔'' برکت صاحب بولے۔

''کیا آپ لوگ باتیں ہی کرتے رہیں گے......؟'' گل بانو آخر بول ہی پڑیں۔ ''ارے بھئی میری بچی کو بھی اب دوبارہ انسان بنا دیجیے۔ بے چاری کب سے مینا بنی ہوئی ہے۔''

''کب سے کیا مطلب ہے بیگم......! تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے سالوں گزر گئے ہوں۔'' برکت صاحب نے انہیں سمجھایا۔ ''اری نیک بخت...... یہ شادی والے دن نکاح سے پہلے ہی تو مینا بنی تھی' یاد ہے نا......! تم ہی تو اسے غسل خانے کی طرف لے کر گئی تھیں، اور وہیں پر گل چیں نے اس کا روپ دھار لیا تھا۔''

''ہاں یاد ہے......'' انہوں نے سر ہلایا۔ ''مہ پارہ نے مجھ سے کہا تھا کہ اس کے کپڑوں میں کوئی کیڑا رینگ رہا ہے۔''

''وہ کوئی کیڑا نہیں تھا۔'' سردار مسکرایا۔ ''وہ تو ہم نے اسے غسل خانے تک لانے کے لیے ایک بہانہ سوچا تھا۔ تاکہ اس کا وجود تبدیل کیا جا سکے اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہو۔''

یہ کہہ کر سردار نے مینا کا پنجرہ اٹھا لیا پھر اس نے پنجرے کا دروازہ کھولا اور اپنا ہاتھ اندر ڈال کر مینا کو دبوچ لیا۔

سب ہی خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ گل بانو نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔ مینا اپنے پر پھڑپھڑا رہی تھی۔ سردار نے اس کے سر کی طرف دوسرا ہاتھ بڑھایا اور اس کے بالوں میں ہاتھ ڈال کر ٹٹولنے لگا۔

پھر اس نے اپنی انگلیوں کو ہلکا سا جھٹکا مارا تھا۔ فوراً ہی ایک باریک سی سوئی مینا کے سر میں سے نکل کر سردار کے ہاتھ میں آ گئی۔

سوئی کا ہاتھ میں آنا تھا کہ مینا غائب ہو گئی۔ اب سردار کے دونوں ہاتھ خالی تھے۔

جیسے ہی مینا غائب ہوئی، فرش پر مہ پارہ کا جسم نمودار ہو گیا۔ وہ چت پڑی ہوئی لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی بند تھیں۔ اس کے جسم پر وہی دلہن والا لباس موجود تھا۔

''یہ ابھی چند منٹ کے اندر اندر ہوش میں آ جائے گی۔'' سردار نے بتایا۔ گل بانو فوراً ہی مہ پارہ کی طرف لپکیں۔

''سردار......! یہ بتاؤ کہ اب بوقاف اور گل چیں کی اصل شادی کب ہو گی......؟'' برکت صاحب نے سوال کیا۔

''اسی دن......'' سردار فوراً بولا۔ ''جس دن سلیم اور مہ پارہ کی اصلی شادی ہو گی۔''

سردار کا یہ جملہ اس مختصر سی محفل کو کشتۂ زعفران بنا گیا۔'' سب ہی قہقہہ مار کر ہنس پڑے تھے۔

☆......☆......☆

بوقاف دوبارہ اپنی اصلی جون میں آ چکا تھا۔ وہ اب جن تھا...... وہی پرانا جن...... لیکن اب اس کے خیالات نئے تھے۔ وہ پہلے والا بوقاف نہیں رہا تھا، بہت بدل چکا تھا وہ......

اب اس کی کل کائنات یہی قبیلہ تھا۔ جس میں اس کے ماں باپ تھے، رحم دل سردار تھا، بہترین دوست مالوط تھا اور اسے شدت سے چاہنے والی گل چیں تھی۔ وہی گل چیں...... جس کی کبھی بھی بوقاف نے قدر نہیں کی تھی۔

اپنا سب کچھ کھو کر اسے احساس ہوا تھا کہ اپنے لوگوں کی کیا اہمیت ہوتی ہے......؟ اور اب تو کچھ دنوں سے اس کے دل میں لڈو بھی پھوٹ رہے تھے کیونکہ اس کے باپ نے اسے وارننگ دے دی تھی کہ ایک مہینے کے اندر ہی اندر بوقاف کو گل چیں سے منسلک کر دیا جائے گا۔

جب سے یہ بات گل چیں کے کانوں میں پڑی تھی، وہ بوقاف سے شرم کے مارے کنی کترا رہی تھی۔ حالانکہ وہ مہ پارہ کے روپ میں پہلے بھی بوقاف کی دلہن بن چکی تھی۔ لیکن اب تو بات ہی اور تھی۔

اس نے مہ پارہ والے راز سے اب تک بوقاف کو آگاہ نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ تو بوقاف کے ساتھ پیش آنے والے ''حادثے'' سے خود کو بالکل ہی لاعلم ظاہر کر رہی تھی۔

پھر اسے ضرورت ہی کیا تھی......؟ بوقاف اسے مل تو رہا تھا......؟ اور اسے کیا چاہیے تھا......؟

☆......☆......☆

سپر ایجنٹ صفدر

سپر ایجنٹ صفدر، مظہر کلیم کی عمران سیریز کا ایک اور تیز رفتار اور ایکشن سے بھرپور ناول ہے۔ مظہر کلیم کے اس ناول کا تھیم سیکریٹ سروس کے ایجنٹوں کی انفرادی کارکردگی اور صلاحیتوں پر مبنی ہے۔ مظہر کلیم اس سے پہلے بھی اس طرح کے کئی ناول لکھ چکے ہیں جیسے ''ڈیشنگ ایجنٹ'' اور ''جولیانا مشن'' وغیرہ۔ اس بار پاکیشیا سیکریٹ سروس کے چیف ایکس ٹو نے صفدر کو ایک انتہائی خطرناک مشن سپرد کیا ہے اور وہ مشن ہے دشمن ملک کی فوجی لیبارٹری سے ایک اہم فارمولا کی چوری۔ یہ لیبارٹری بہت خطرناک صحرا کے وسط میں واقع ہے جہاں ہر وقت طوفانی ہوائیں چلتی رہتی ہیں اور ان ہواؤں کو پار کر کے اس لیبارٹری تک پہنچنا ناممکن۔ صفدر کو اکیلے اس ناممکن مشن کو ممکن بنانا ہے اور خود کو سپر ایجنٹ ثابت کرنا ہے۔ کیا صفدر اپنے اس مشن میں کامیاب ہو گیا؟ کیا باقی سیکریٹ سروس محض تماشائی بنی رہی؟ کیا عمران موت سے پنجہ آزمائی کر کے صفدر کی مدد کو پہنچا؟ ان سب سوالوں کے جواب جاننے کے لئے پڑھیئے ناول ''سپر ایجنٹ صفدر''۔

''**سپر ایجنٹ صفدر**'' کتاب گھر پر دستیاب ہے۔ جسے **ناول** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

''ہائے......میں مرگیا......آہ......'' سلیم کی کراہوں سے کمرہ گونج اٹھا۔ اشرف صاحب اس کے بیڈ کے قریب کھڑے ہوئے پرتشویش نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ بیگم اشرف سرہانے پر موجود تھیں اور خود سلیم بیڈ پر لمبا لمبا لیٹا ہوا تھا۔

''آخر ہوا کیا تھا......؟'' اشرف صاحب نے اپنی بیگم کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''بتادوں......؟'' بیگم اشرف سلیم کی طرف گردن گھما کر بولیں۔

''کچھ نہیں ہوا ابا جان......! کچھ بھی تو نہیں ہوا......'' سلیم نے بوکھلا کر اپنے باپ کو جواب دیا۔ وہ ان سے نظریں بھی چرا رہا تھا۔

''تو پھر یہ آوازیں کیا خود بہ خود تمہارے منہ سے نکل رہی ہیں......؟'' انہوں نے اسے گھورا۔ ''جلدی سے بتاؤ کیا ہوا ہے......؟''

''وہ......وہ......ابا جان......! مجھے صبح امی جان نے بتایا تھا کہ مہ پارہ کے گھر والے شادی کی تاریخ طے کرنے کے لئے اپنے گھر پر بلا رہے ہیں۔''

''تو پھر......؟'' اشرف صاحب اب بھی اسے گھور رہے تھے۔

''بس......امی جان نے یہی بتایا تھا۔ ہے نا امی جان......؟'' وہ بیگم اشرف کی طرف دیکھنے لگا۔ بیگم اشرف نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کی تھی۔

''لیکن اس میں کراہنے والی کیا بات ہے......؟ تم گدھے تو نہیں ہو......؟'' اشرف صاحب جھنجلا گئے۔

''میں بتاتی ہوں کہ کیا ہوا ہے......'' بیگم اشرف سے رہا نہ گیا۔ ''میں نے جیسے ہی مہ پارہ کے گھر سے آنے والا پیغام آپ کے بیٹے کو سنایا، یہ خوشی کے مارے اتنا پاگل ہوا کہ ناچنے لگا۔ اور اسی ہڑبونگ میں اس کے پاؤں میں موچ آ گئی......بس یہ بات ہے۔''

''اوہ......'' اشرف صاحب کے منہ سے نکلا۔

پھر ایک بھرپور قسم کی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر نمودار ہوگئی۔ ان کے ساتھ ساتھ بیگم اشرف بھی ہنس پڑی تھیں۔ اور پھر سلیم کیوں پیچھے رہتا......؟ اس نے بھی اپنے دانتوں کی نمائش کر ڈالی۔ ماحول بے حد خوش گوار ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

کلو چرسی کا بھاڑ جیسا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ حیرت کا بت بنا، برکت صاحب کو دیکھ رہا تھا۔

شبن کے خیراتی ہوٹل میں اس میز پر صرف یہی دونوں موجود نہیں تھے' بلکہ حکیم طولانی، چچا تندوری اور ملو استاد بھی یہاں پائے جاتے تھے۔

برکت صاحب نے ابھی خبر ہی ایسی سنائی تھی کہ سب ہی ہکا بکا رہ گئے تھے۔ خاص طور پر کلو چرسی......!

''سنا تھا کہ طلاق تین بار ہوتی ہے......'' کلو چرسی نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ ''لیکن یہ بات پہلی بار معلوم ہوئی ہے کہ شادی بھی دو مرتبہ ہو سکتی ہے۔''

''ارے بات کو سمجھو میاں......؟'' برکت صاحب جھنجلا اٹھے۔ ''لڑکے کے گھر والے پہلے یہاں نہیں تھے۔ اب وہ آ گئے ہیں تو ان کا

تقاضا ہے کہ اب سلیم اور مہ پارہ کی شادی ذرا دھوم دھام سے دوبارہ کی جائے۔“

”ہم تو پہلے ہی کہہ رہے تھے۔“ حکیم طولانی نے سر ہلایا۔ ”تمہیں ہی اس وقت سادگی کا بھوت چڑھا ہوا تھا۔“

”وہ بھوت نہیں...... جن تھا۔“ برکت صاحب نے تصحیح کی۔

”خیر...... خیر......“ حکیم طولانی نے کہا۔ ”چلو...... اب بھی کچھ نہیں بگڑا...... بقول شاعر اک ستم اور سہی...... ہاں......“

”حکیم صاحب......! کبھی تو اپنے شاعر کا گلا دبا لیا کرو......“ چچا تندوری نے منہ بنایا۔ ”ہر وقت تمہارا شاعر منہ پھاڑے رہتا ہے۔“

یہ سن کر حکیم طولانی نے انہیں گھور کر دیکھا۔ عین اسی وقت ہوٹل کے دروازے کے قریب نہ جانے کہاں سے ایک موٹا تازہ مرغا آ کھڑا ہوا اور پھر اس نے وہیں کھڑے کھڑے بانگ دے ڈالی۔ سب نے چونک کر چچا تندروی کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ توقعات کے برعکس لاپروائی اور اطمینان سے بیٹھے رہے۔ حیرت کے مارے سب ہی کا برا حال ہو گیا۔ مرغا بانگ دے اور چچا تندوری آرام سے بیٹھے رہیں...... یہ ناممکن تھا۔

”چچا تندوری......!“ کلو چرسی سے رہا نہ گیا۔ اس نے انہیں کہنی ماری۔ ”کہاں ہو...... وہ دیکھو...... مرغا بانگ دے رہا ہے۔“

”رہنے دو...... جب سے میرا راز فاش ہوا ہے...... میں نے مرغوں کی بانگ سے چڑنا چھوڑ دیا ہے۔ جب تک یہ بات راز تھی، اس کی اہمیت تھی۔ راز ختم...... تو چڑ بھی ختم......“ چچا تندوری نے جواب دیا۔

سب ان کی شکل ہی دیکھتے رہ گئے۔ مرغا اب بھی بانگ دے رہا تھا۔

﴿ختم شد﴾

دو بوندیں ساون کی

دو بوندیں ساون کی، ترجمہ ہے جیفری آرچر کے شہرہ آفاق ناول کین اینڈ ایبل کا جسے اُردو زبان میں ترجمہ کیا ہے علیم الحق حقی نے۔ دو بوندیں ساون کی کہانی ہے دو ایسے افراد کی جو ایک دوسرے سے شدید نفرت کرتے تھے اور ایک دوسرے کو شکست دینے اور تباہ و برباد کرنے کے درپے تھے۔ ان میں سے ایک منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوا اور دوسرا در بدر کی ٹھوکریں کھاتا رہا۔ ایک شخص نے دُنیا کے بہترین تعلیمی اداروں سے تعلیم پائی اور دوسرے کا استاد زمانہ تھا۔

یہ ناول کتاب گھر کے **معاشرتی اصلاحی ناول** سیکشن میں پڑھا جا سکتا ہے۔